

# خراہٹ کے



یاسر پیرزادہ

والد محترم!  
عطا الحق قاسمی کے نام

50	یومِ نفرت	12
53	وارنگ !!!	13
56	بیزاری	14
60	”آئیٹم“ بم	15
64	Wanted!!!	16
68	”میں ڈانٹنگ پر ہوں“	17
72	حق مغفرت کرے.....!!!	18
76	حامد ”قرضی“ یا حامد ”نوسرباز“؟	19
80	بوڑھا راجا، جوان رانی	20
84	ایک مثالی شہری	21
88	سکس ملین ڈالر میں	22
92	نخرے نوکری کے	23
96	ایک ”جینس“ کا بجٹ	24
100	جنت اور جہنم	25
104	”Man, this is America“	26
107	واشنگٹن ڈی۔سی	27
111	نیویارک تالاہور	28
115	اچانک.....!!!	29
119	ایک دن موبائل کے بغیر	30
122	رمضان کا شیطان	31



## ترتیب

☆	”مائی لائف“	11
1	منہ مسمیٰ چیئر مین.....!!!	15
2	حساب کتاب	18
3	ہاتھ دکھائی	21
4	خاوند سامراج	24
5	امپورٹڈ مشورے	27
6	”سب سے پہلے شکم“	30
7	سرکاری بکمرے	34
8	”گنجے فرشتے“	38
9	ملٹی نیشنل کمپنیاں	41
10	رات گئے	44
11	بندر کا تماشا	47

205	مفید مشورے	52	127	”میرا موڈ آف ہے“	32
209	خوش فہمی	53	131	”جینوئن“ بے غیرت !!!	33
213	سامری جادوگر	54	136	علامہ ”پرفیکٹ“	34
218	کافی	55	140	ٹائم ہی نہیں ملتا !!!	35
222	یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے	56	142	بریک کے بعد	36
226	ایک گھنٹہ نہیں، چھ ماہ آگے کریں !!!	57	149	کیسے کیسے لوگ !!!	37
230	فرعون کے دربار میں	58	153	موسیٰ انتہا پسند	38
234	خودکشی	59	157	”میرے عزیز ہم بکرو.....!!!“	39
238	ویزا	60	160	یہ ”تنقید“ نہیں آساں.....!!!	40
242	ایک بھوت کا سوال ہے بابا !!!	61	163	ریفریشر کورس	41
246	”میڈرڈی میٹرو“	62	166	مردوں کی عمریں	42
251	پیرس کا پھیرا	63	169	ایک نمبر پاگل	43
255	بادشاہ سلامت کی آخری تقریر	64	173	ہارا ہوا کھلاڑی	44
259	سائنٹیفک شرط	65	177	ایک ڈھیٹ انسان	45
263	”That was worth it“	66	181	ہم سفر	46
267	مردانہ خط و کتابت	67	185	ایک جائز قتل	47
271	افواہیں	68	189	پیشین گوئی	48
275	کامیابی کے سات اصول	69	193	کبھی ہاں کبھی ناں !!!	49
279	Mission Accomplished!!!	70	197	پچاس سال بعد لکھا جانے والا کالم	50
283	”کیا آپ کا دن بُرا گذرا تھا؟“	71	201	باکمال آدمی	51

287	ہاؤس آف کارڈز	72
291	Hallucination	73
296	یکسوئی	74
300	بریگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ	75
304	”پدرم سلطان است“	76
308	نوٹ	77
312	اشتہاری	78



اردو کتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

”نیوزویک“ آتا ہو، ہر وقت، ہر کسی سے انگریزی میں گفتگو کی جائے حتیٰ کہ دودھ لیتے وقت گوالے سے بھی انگریزی میں ہی بات کی جائے۔ ان دنوں اسی قسم کے قصے سنانے کے ایک ماہر پروفیسر صاحب گھر تشریف لائے اور میرے والدین کے سامنے ایک گھنٹہ کی پر مغز تقریر کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ اگر آپ کا بیٹا زندگی میں سی۔ ایس۔ ایس۔ نہ کر سکا تو پھر اس کے مقدر میں سوائے رسوائی کے اور کچھ نہیں۔ جو بات حقیقتاً ان کے دل میں تھی مگر وہ زبان پر نہ لاسکے غالباً یہ تھی کہ اگر میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے افسر نہ بنا تو پھر یقیناً خود کش بمبار بن جاؤں گا۔ پروفیسر صاحب نے ایک امیدوار کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اس بھلے شخص نے دو سال تک سی۔ ایس۔ ایس۔ کی تیاری یوں کی کہ اُس نے آسمان ہی نہیں دیکھا، گھر والے اُس کے کمرے کے باہر ناشتہ اور کھانا رکھ جاتے جسے وہ دروازے کی جھری میں سے اندر کھسکا لیتا اور پھر خالی ٹرے واپس رکھ کر دوبارہ پڑھائی میں گم ہو جاتا۔ پروفیسر صاحب کے مطابق اُس امیدوار نے بالآخر تیسری attempt میں سی۔ ایس۔ ایس۔ کر لیا تھا۔ میں نے پروفیسر صاحب کی بات بہت غور سے سنی اور پھر مؤدب لہجے میں جواب دیا کہ ”سر! میرے جیسے بندے کے لیے اس قسم کی تیاری کرنا ممکن نہیں۔“ پروفیسر صاحب نے خشکیوں لگا ہوں سے پہلے میری طرف دیکھا اور دوسری نگاہ میرے والدین پر ڈال کر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ”سوری! آپ کا بیٹا سی۔ ایس۔ ایس۔ کا اہل نہیں، بہتر ہوگا اسے کسی کالج میں پروفیسر کروادیں!“

وہ صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو سی۔ ایس۔ ایس۔ کرنا ہے اور وہ بھی ”نارل“ رہتے ہوئے۔ یہی سوچ کر ایک دن میں نے پہلا قدم اٹھایا اور قائد اعظم لائبریری چلا گیا۔ ابھی میں لائبریری کے دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ مجھے دونوں جوانوں کی آواز سنائی دی جو آپس میں کچھ اس قسم کی گفتگو کر رہے تھے:

”یار! تم نے ساؤتھ ایشیا اور مڈل ایسٹ کو کر لیا ہے؟“

”ہاں! اب میں نے عرب، اسرائیل conflict پر ایک امریکی سکالر کی کتاب پڑھنی ہے، باقی تیاری مکمل ہے۔“

## ”مائی لائف“

یہ غالباً 1994 کی بات ہے جب میں نے سی۔ ایس۔ ایس۔ کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس وقت میں نے صرف گریجوایشن کی ہوئی تھی اور ایم۔ اے۔ کرنے کی غرض سے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات میں تازہ تازہ داخل ہوا تھا۔ یونیورسٹی کے پہلے روز میں علی الصبح کیمپس پہنچا تو پتہ چلا کہ ہماری جماعت میں لگ بھگ 45 لڑکیاں اور فقط 15 لڑکے ہیں۔ یہ جان کر بڑی فرحت ہوئی اور دل میں خیال آیا کہ ایم۔ اے۔ کرنے کے دوران لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان پڑھائی میں مقابلے کا رجحان رہے گا جو یقیناً ایک صحت مندانہ علمی سرگرمی ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا یہ خیال بالکل غلط نکلا! ایم۔ اے۔ میں مقابلہ تو ضرور ہوا مگر صرف لڑکوں کے درمیان، لیکن ظاہر ہے وہ مقابلہ نصابی تعلیم کا نہیں بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں کا تھا، ایسی سرگرمیوں کو میں انگریزی میں ”Anti Social Activities“ کہتا ہوں!!!

سی۔ ایس۔ ایس۔ کی تیاری کے متعلق بہت سی ہوشربا کہانیاں مشہور تھیں اور وہ سب کی سب میں نے بھی سن رکھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ امیدوار روزانہ قائد اعظم لائبریری جائے اور وہاں پانچ چھ گھنٹے کتابوں میں غرق ہو کر گزارے، گھر میں باقاعدگی سے ”ٹائم“ اور

نئے مُردوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ صحافت کی اس لت نے ”نیشن“ چھوڑنے کے بعد بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا لہذا اپنے شوق کی تکمیل کے لیے میں نے روزنامہ ”نوائے وقت“ میں ”ذرا ہٹ کے“ کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کر دیئے۔ کالموں کے اس سلسلے میں باقاعدگی تب آئی جب 2006ء سے میں نے روزنامہ ”جنگ“ میں ہفتہ وار لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

آج جب میں کرائم رپورٹنگ، سی۔ایس۔ایس۔ اور کالم نگاری کے اپنے تجربے پر نظر ڈالتا ہوں تو ان تینوں میں سے اب بھی مجھے کرائم رپورٹنگ کا دور بہت یاد آتا ہے جس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ان دنوں میں فقط 19 سال کا ہوا کرتا تھا اور..... دوسری وجہ بھی یہی ہے۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب مردہ خانے میں جا کر لاشوں کو دیکھنے میں بھی excitement محسوس ہوتی ہے۔ اس عمر میں انسان 120 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی موٹر سائیکل چلائے تو یوں لگتا ہے جیسے آہستہ ہی جا رہا ہے۔ تاہم زندگی اب بھی تقریباً ویسی ہی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ آج میں موٹر سائیکل کی جگہ، کار تیز رفتاری سے چلاتا ہوں اور مردہ خانے میں لاشیں دیکھنے کی بجائے ٹی وی کی خبروں میں دیکھ لیتا ہوں لیکن یہ لاشیں آج سے پندرہ سال قبل کی لاشوں سے بہت مختلف ہیں کیونکہ ان دنوں کوئی بھی ”ڈرون حملوں“ میں نہیں مارا جاتا تھا!!!

لاہور  
18 فروری 2009ء

باسر پیرزادہ

www.yasirpirzada.com

”میرا بھی ارادہ آج امریکن ہسٹری ختم کرنے کا ہے، اُس کے بعد یورپین ہسٹری کی طرف آؤں گا۔“

“Its good that you are catching up!”

ابھی میں نے اتنی ہی گفتگو سنی تھی کہ اُلٹے پاؤں واپس ہولیا کیونکہ مجھ میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے سی۔ایس۔ایس۔ کی تیاری کیسے کی، یہ ایک لمبی کہانی ہے تاہم مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے لگ بھگ تین ماہ اس امتحان کی تیاری کی، جس دوران میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے یونیورسٹی کے کرکٹ میچ بھی کھیلے، بسنت بھی منائی اور جوانی کی کچھ یادیں بھی سمیٹیں۔ جب نتیجہ آیا تو میں پورے پاکستان میں 78 ویں نمبر پر تھا اور سب سے کم عمر میں سی۔ایس۔ایس۔ کرنے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ ان پروفیسر صاحب کے علاوہ ایک اور شخص کو بھی اس نتیجہ پر بے حد حیرانی ہوئی اور وہ خود میں تھا!!

صحافت، مشاعرہ بازی اور فلم میکنگ، تین ایسے شعبے ہیں جن کی لت ایک دفعہ پڑ جائے تو بقول غالب ”چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی“ والا حساب ہو جاتا ہے۔ میرے کیس میں یہ مصرع صحافت پر صادق آتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد جب میرے پاس ایک سال فارغ تھا تو والد صاحب نے مجھے روزنامہ ”دی نیشن“ میں بطور رپورٹر ”بھرتی“ کروا دیا۔ ”دی نیشن“ کے رپورٹنگ سیکشن نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو عام طور پر پی۔ایم۔اے۔ کا کول اکیڈمی میں رنگرڈوں سے کیا جاتا ہے یعنی انہوں نے مجھے کرائم کی beat دے دی۔ اب میں اس انگریزی اخبار کا کرائم رپورٹر تھا، روز کا معمول یہ ہو گیا کہ میں صبح گیارہ بجے دفتر آتا اور پھر وہاں سے سیدھا مردہ خانے چلا جاتا، چند لاشوں کا دیدار کرنے کے بعد اُن کی ”خبر گیری“ کے لیے نکل کھڑا ہوتا۔ کبھی ایک لاش کی سٹوری شاہدہ ٹاؤن سے ملتی تو دوسری کی کوٹ لکھپت سے کسی کو ناجائز تعلقات کے شعبے میں قتل کیا ہوتا اور کسی نے اس لیے جان دی ہوتی کہ اس کے ناجائز تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ مردہ خانے کا آخری چکر رات ایک بجے لگتا، جب مُردے بھی سو چکے ہوتے اور اُس کے بعد میں گھر کی راہ لیتا۔ اس تمام تر تھکا دینے والی روٹین کے باوجود اگلے روز میں بالکل تازہ دم ہو کر اُٹھتا اور



شرکت کی جن کے نام یہ ہیں..... اس کے علاوہ ملک کے دیگر صوبائی دارالحکومتوں میں بھی صوبائی رویت ہلال کمیٹیوں کے اجلاس منعقد ہوئے۔ یہ اجلاس کراچی، پشاور اور کوئٹہ میں ریڈیو پاکستان کی عمارات میں منعقد کئے گئے۔ ان تمام اجلاس میں علماء کرام نے خود، بشمول میرے چھتوں پر چڑھ کر دوربینوں کے ذریعے چاند دیکھنے کی کوشش کی۔ چونکہ مطلع کچھ ابر آلود تھا اس لئے چاند دیکھنے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی اس وجہ سے میں نے مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس کچھ دیر کے لئے موخر کر دیا۔ میری دیکھا دیکھی صوبائی رویت ہلال کمیٹیوں کے سربراہان نے بھی کراچی، پشاور، اور کوئٹہ میں اپنے اپنے اجلاس موخر کر دیئے۔ تاہم کچھ دیر بعد مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ جب میں نے اپنی شیروانی کی جیب کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ میرے موبائل فون پر ایک missed call ہے۔ سنسناہٹ کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میں نے اپنا موبائل فون vibration پر لگایا ہوا تھا تا کہ اجلاس کے دوران ”کجھارے“ والی رنگ ٹون بجتی شروع نہ ہو جائے۔ جب میں نے missed call کا نمبر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ صوبہ سرحد کی رویت ہلال کمیٹی کے صدر کی تھی۔ میں نے انہیں اپنے موبائل فون سے فون کرنا چاہا لیکن کر نہ سکا کیوں کہ میرے prepaid فون کارڈ کا بیلنس ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اسی وقت مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے ایک معزز رکن کو مبلغ 100 روپے دے کر بھیجا اور کہا کہ فوراً ایک prepaid موبائل کارڈ لے کر آؤ۔ کارڈ لوڈ کرنے کے بعد میں نے دوبارہ نمبر ملایا تو رابطہ ممکن ہوا۔ صوبہ سرحد کی رویت ہلال کمیٹی کے صدر کا کہنا تھا کہ صوبہ سرحد کے چند علاقوں سے رویت کی شہادتیں وصول ہوئی ہیں۔ میں نے ان کی بات سنتے ہی فون منقطع کر دیا کیوں کہ ایک تو میں چاہتا تھا کہ اس مرتبہ پورے ملک میں ایک ہی عید ہو اور دوسرے کال کا دورانیہ 30 سیکنڈ سے بڑھنے کا اندیشہ تھا اور حاضرین، ناظرین اور سامعین کرام آپ کو علم ہے کہ آج کل موبائل فون کی بلنگ 30 سیکنڈ کے حساب سے ہوتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میں اپنے کسی معزز رکن کو ایک مرتبہ پھر پری پیڈ کارڈ لانے کی زحمت دوں۔

جب مطلع کچھ صاف ہوا تو میں نے مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان کا اجلاس، جسے میں پہلے موخر کر چکا تھا، دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی، پشاور اور کوئٹہ کی رویت ہلال کمیٹیوں کے سربراہان کو اپنے اس فیصلے سے میں نے SMS کے ذریعے آگاہ کر دیا۔ اس کی

## منکہ مسمیٰ چیر مین.....!!!

غالب نے کیا خوب کہا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

میں جب کبھی ٹیلی وژن پر عید کا چاند دیکھنے کے حوالے سے مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئر مین کے اعلان کی کارروائی دیکھتا ہوں تو مجھے غالب کا متذکرہ مصرع یاد آ جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً میری یہ خواہش ہے کہ میں مرکزی ہلال کمیٹی کا چیئر مین ہوتا اور ہر سال قوم کو رمضان اور عید کی نوید سنایا کرتا۔ گو کہ یہ فریضہ موجودہ رویت ہلال کمیٹی ادا کر رہی ہے تاہم میں اس کے اجلاس کی کارروائی اور چاند نظر آنے یا نہ آنے کے اعلان کرنے کے طریقے سے مطمئن نہیں ہوں۔ ویسے تو یہ اعلان ایک فقرے میں یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ:

”خواتین و حضرات! شوال کا چاند نظر آ گیا ہے، کل عید ہوگی۔“

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کا اعلان لفظ 10 سیکنڈ میں کیا جاسکتا ہے جب کہ میں ٹیلی وژن پر کم از کم آدھا گھنٹہ لینا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لئے اعلان کچھ اس قسم کا ہونا چاہیے:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم! معزز حاضرین و ناظرین و سامعین کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

وبرکاتہ۔ آج مورخہ 23 اکتوبر سن 2006ء عیسوی بمطابق 29 رمضان المبارک 1427

ہجری اور آٹھ کا تک 2063 ب کو اس مملکت خدا دا پاکستان کی مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس اس ناچیز کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں میرے علاوہ 20 علماء کرام نے

## حساب کتاب

”السلام علیکم“!

”ہوں! وعلیکم السلام“۔

”کہاں سے آئے ہو تم؟“

”پاکستان سے جناب عالی!“

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”الحاج شیخ فضل ربی“

”کیا بات ہے، بڑے مطمئن نظر آرہے ہو، شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ تم وفات پا چکے ہو اور

اس وقت قبر میں تشریف فرما ہو!“

”نہیں جناب بالکل اندازہ ہے، مجھے پتہ ہے کہ میں قبر میں لیٹا ہوں، بس یہ قبر ذرا تنگ ہے

اس لئے کچھ تکلیف ہو رہی ہے لیکن کوئی بات نہیں، مگر جناب نے اپنا تعارف نہیں کروایا، کہیں

آپ جنت کے فرشتے تو نہیں کہ مجھے جنت میں لے جانے کے لئے آئے ہو؟“

”فرشتہ تو میں نہیں ہوں!“

”تو کیا جناب جہنم کے داروغہ ہیں؟“

”نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں، میں پرائیویٹ سیکٹر سے ہوں، میری ڈیوٹی فی الحال قبروں پر

ہے، میں مرنے والے لوگوں کے اعمال کی ابتدائی جانچ پڑتال ان کی قبر میں ہی کرتا ہوں۔“

”واہ! حضور والا یہ تو بہت اچھی بات ہے تو پھر تو جناب کی ابتدائی رپورٹ پر ہی جنت اور جہنم

وجہ بھی میں بتاتا چلوں کہ تمام مرکزی، صوبائی رویت ہلال کمیٹیوں کے سربراہان ایک ہی میٹ ورک کی موبائل فون سروس استعمال کرتے ہیں جس کی بدولت آپ ایک دوسرے کو با آسانی صرف 20 پیسے میں SMS کر سکتے ہیں۔ البتہ MMS یا Multi Media Messaging جیسے کوئی ویڈیو کلپ وغیرہ بھیجنا مقصود ہو تو اس کے ریٹ غالباً 5 روپے فی MMS ہیں جو کچھ زیادہ ہیں لہذا میں SMS کو ترجیح دیتا ہوں۔

معزز حاضرین و ناظرین و سامعین کرام! میری بروقت SMS کی بدولت مرکزی و صوبائی رویت ہلال کمیٹیوں کے اجلاس ایک دفعہ پھر شروع کئے گئے۔ ملک کے مختلف حصوں سے رویت کی شہادتیں وصول کی گئیں۔ کچھ شہادتیں فون کے ذریعے موصول ہوئیں جبکہ کچھ نے صرف 20 پیسے والی SMS کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ تاہم ایک شہادت مجھے اپنے موبائل فون پر ویڈیو کلپ کی شکل میں بھی موصول ہوئی ہے جس میں کسی صاحب یا خاتون نے آسمان پر چاند کی فلم بنا کر مجھے بذریعہ MMS بھیجی ہے۔ اس قومی شہادت کی موصولی کے بعد مجھے بطور چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان یہ اعلان کرنے میں قطعاً کوئی عار نہیں ہے کہ ماہ شوال کی رویت کی تصدیق ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے تمام معزز ممبران رویت ہلال کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس معاملے میں میری معاونت فرمائی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ تمام ٹی وی چینلوں سے اپیل کرتا ہوں کہ پلیز مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اجلاس کی کاروائی ہر ماہ اس طرح نشر کی جائے اور اسے صرف عیدین کے لئے ہی مخصوص نہ کیا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میری آج کی اس مفصل بریفنگ کے بعد آپ میری اس تجویز پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔ خدا حافظ وناصر!“

(6 نومبر 2006ء)



گھر میں اس کی حیثیت ملازم کی تھی۔ خیر! اپنا کوئی اور نیک کام بتاؤ۔“  
”سرکار آپ تو میرے تمام نیک کاموں کو کسی کھاتے میں لکھ ہی نہیں رہے بھلا اس کے بعد میں کیا عرض کروں۔ آپ ایسا کریں اپنے کسی سینئر سے میری بات کروائیں، اسے شاید میرے نیک کاموں کی سمجھ آ جائے۔“

”یہ کوئی سرکاری دفتر نہیں جہاں تم اوپر سے مل ملا کر اپنا کام کروا لو گے۔ یہاں کوئی سینئر، جو نیک نہیں ہے۔ تمہیں صرف میرے سوالوں کے جواب دینے ہیں، کوئی اور نیک کام کیا ہے؟“  
”سرکار! آپ تو یونہی برا مان گئے، میں نے ایسے ہی عرض کیا تھا۔ خیر! حضور میں ساری زندگی باقاعدگی سے زکوٰۃ دیتا رہا ہوں اور سرکار میں نے کبھی رمضان میں روزے نہیں چھوڑے! ہمیشہ پورے روزے رکھے ہیں۔“

”ہوں! پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے پوری زندگی جس مال پر زکوٰۃ دی ہے وہ سارے کا سارا کالا دھن تھا اور جہاں تک تمہارے روزوں کا سوال ہے تو تم نے ماہ رمضان میں روزے نہیں رکھے بلکہ صرف فاقہ کشی کی ہے۔“  
وہ کس طرح حضور والا؟

”وہ اس طرح کہ پورا رمضان تم نے اپنے کاروبار اور لین دین میں ویسے ہی جھوٹ اور بددیانتی سے کام لیا ہے جیسے تم سارا سال لیتے رہے ہو اس لیے ماہ رمضان کے روزے بھی تمہارے لیے کام نہیں آسکیں گے۔ چلو اب تمہارا حساب کتاب ختم ہو گیا ہے تم سامنے 6 نمبر والے دروازے سے اندر چلے جاؤ۔“

”اس دروازے میں کیا ہے جناب؟“

”وہاں بھی تمہاری ہی طرح کا ایک اور مرحوم ہے۔“

”اس نے کیا کیا ہے سرکار؟“

”اس کی ”نیکیاں“ بھی بالکل تمہارے جیسی ہی ہیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ غیر ملکی آقاؤں سے فنڈ لے کر انہی کے مفادات کی نگرانی کے لیے این۔ جی۔ او۔ چلاتا تھا، اب تم اور وہ اکٹھے رہیں گے، خدا حافظ!!“

(13 نومبر 2006ء)

کے فیصلے کئے جاتے ہوں گے؟“

”تم ان باتوں کو چھوڑو، بس ذرا تیار ہو جاؤ، حساب کتاب کے لئے۔“

”جی جی! بسم اللہ! شروع کریں، ویسے بھی جنت میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔“

”اچھا! اتنا یقین ہے تمہیں کہ تم جنت میں جاؤ گے؟“

”جی سرکار کیوں نہیں؟ آخر ساری عمر نیک کام کرنے میں گزاری ہے، اب اس کے بدلے جہنم تو نہیں ملے گی ناں۔“

”ہوں! تو ذرا گنواؤ کون کون سے نیک کام کئے ہیں تم نے؟“

”سب سے پہلے تو سرکار جیسا کہ میرے نام سے ظاہر ہے میں حاجی ہوں، الحمد للہ میں نے تین حج کئے ہیں۔“

”ماشاء اللہ ماشاء اللہ! مگر کیا یہ صحیح ہے کہ حج پر جانے سے پہلے تم نے وسیع پیمانے پر ذخیرہ اندوزی کی جس سے ملک میں اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا، اس اضافے کی وجہ سے تم نے کروڑوں روپے کا ناجائز منافع کمایا اور پھر تم حج پر روانہ ہو گئے۔“

”مگر سرکار وہ تو میرا کاروبار تھا اور پھر ویسے بھی مجھے میرے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب نے بتایا تھا کہ جب آپ حج کر لیں گے تو ایک معصوم بچے کی طرح پاک ہو جائیں گے جس نے کبھی گناہ نہیں کیا ہوتا۔“

”ان مولوی صاحب کی فکر نہ کرو، ان کا حساب کتاب ساتھ والی قبر میں میرا ایک کولیگ کر رہا ہے، تم صرف اپنی کوئی اور نیکی گنواؤ۔“

”اس کے علاوہ سرکار میں پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اپنی پوری زندگی میں، میں نے بہت کم نمازیں قضا کی ہیں اور حضور اپنے علاقے کی مسجد کی تعمیر کے لئے ہر سال باقاعدگی سے چندہ بھی دیتا رہا ہوں۔“

”چندہ تو تم باقاعدگی سے دیتے رہے ہو لیکن میری رپورٹ کے مطابق تم نے اپنے چاند سے بھتیجے کی جائیداد پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ تمہارا وہ بھتیجا تمہارے اس بھائی کی اکلوتی نشانی تھا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا شہید ہوا تھا اور تم نے اسی کی جائیداد پر قبضہ کر لیا!“

”نہیں سرکار وہ بچہ تو اب تک میرے گھر میں ہی پرورش پا رہا ہے۔“

”وہ تمہارے گھر میں پرورش نہیں پا رہا بلکہ تمہارے گھر والوں کی پرورش اس نے کی ہے کیونکہ

بھی غصہ نہیں کرتے اور کبھی کسی چھوٹی سی بات کو بھی انا کا مسئلہ بنا کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو۔“  
اب میں اپنے دوست کو باقاعدہ تحسین بھری نظروں سے دیکھنے لگا لیکن اچانک اس نے میرا ہاتھ واپس کر دیا اور بے نیازی سے منہ دوسری طرف کر کے سگریٹ سلگانے لگا۔ میں حیرانی سے اس کا منہ ٹکٹنے لگا۔ ”اور بتاؤ! رک کیوں گئے؟“ میں نے کہا۔ میرا دوست یہ سن کر مسکرائے اور بولا ”کیا میری کہی ہوئی تمام باتیں درست ہیں؟“ میں نے جواب دیا ”سو فیصد درست!“ اس پر اس نے مسکرا کر کہا کہ ”یہ باتیں تو میں تمہارا ہاتھ دیکھے بغیر بتا سکتا تھا!“ ابھی میں بے یقینی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”جناب عالی! پامسٹوں کو اپنا ہاتھ دکھا دکھا کر میں اتنا گھاگ ہو گیا ہوں کہ اب مجھے یہ اور اسی طرح کی ملتی جلتی دوسری باتیں از بر ہو گئی ہیں۔ میں نے تمہیں جو باتیں بتائی ہیں وہ ایسی ہیں جو تم بے تکان کسی بھی عام آدمی پر فٹ کر سکتے ہو، ہر کوئی بچپن میں ایک دفعہ تو ضرور بیمار ہوتا ہے، ہر شخص کی تھوڑا عرصہ پہلے کوئی خواہش ضرور پوری ہوئی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ آنے والے وقت کے بارے میں فکر مند بھی رہتا ہے اور بحیثیت قوم ہمارا مزاج ایسا ہے کہ ہم بڑی باتوں کو درگزر کر دیتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اس لئے جناب من آپ یہ باتیں کسی کو بھی سنا کر اس پر اپنی دست شناسی کا رعب جھاڑ سکتے ہیں!“ یہ کہہ کر میرے دوست نے اپنا سگریٹ ختم کیا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر چلتا بنا۔

اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس کی باتوں پر غور کر کے محظوظ ہوتا رہا۔ لیکن پھر ایک دم خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی یہ ”ہنر“ کسی پر آزما کر دیکھوں؟ یہ سوچ کر میں اپنے ایک دوست کے گھر پہنچا اور اسے اپنا ہاتھ دکھانے کو کہا۔ اس نے ہاتھ آگے کیا تو میں نے بھی اسے وہی گھڑی گھرائی باتیں سنائی شروع کر دیں۔ ”تم بچپن میں ایک دفعہ شدید بیمار ہو گئے تھے۔“ میرے دوست نے یہ بات سن کر قہقہہ لگایا اور میری طرف دیکھ کر بولا ”ہاں! میں ایک دفعہ بیمار ضرور ہوا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس روز میں نے غلطی سے ”حلال“ کھا لیا تھا جو مجھے ہضم نہیں ہو سکا۔ اس دن کے بعد سے میں نے کبھی ”حلال“ کھانے کی کوشش نہیں کی!“ میں نے اپنے دوست کی یہ عجیب و غریب بات سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا لیکن میں نے اپنی پیشین گوئی جاری رکھتے ہوئے کہا ”صرف چھ ماہ پہلے تمہاری کوئی بڑی خواہش پوری ہوئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی تم آنے والے سال کے بارے میں کچھ فکر مند ہو!“ یہ سن کر میرے دوست نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور بولا ”تم

## ہاتھ دکھائی

آپ نے کبھی کسی پامسٹ کو ہاتھ دکھایا ہے؟ یقیناً دکھایا ہوگا کیونکہ ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں یہ کام ضرور کرتا ہے اور جو لوگ اپنی قسمت یا شخصیت کے بارے میں جاننے کے لئے متحسّس ہوتے ہیں وہ اکثر نجومیوں اور پامسٹوں وغیرہ کے پاس جاتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ شوق میرے ایک دوست کو بھی ہے، وہ آئے دن کسی نہ کسی جوتشی یا علم نجوم یا دست شناسی کے ماہر کے پاس پہنچتا ہوتا ہے تاکہ اپنی قسمت کا حال جان سکے۔ لیکن اس کی قسمت ویسے کی ویسے ہی ہے جیسے آج سے دس سال پہلے تھی تاہم اسے ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اب وہ کسی بھی عام نجومی یا پامسٹ سے زیادہ اس علم کا ماہر ہو گیا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے کہنے لگا ”ذرا اپنا ہاتھ تو دکھانا!“ میں نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے کسی ماہر دست شناس کے سے انداز میں میرا ہاتھ اپنی دو انگلیوں کے ساتھ ذرا ٹیڑھے طریقے سے پکڑا اور پھر ہاتھ پر ترجھی نگاہیں ڈالتے ہوئے بولا ”تم بچپن میں ایک دفعہ شدید بیمار ہوئے تھے۔“ میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے میرے سر ہلانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور اپنی نگاہیں میری ہتھیلی پر جمائے رکھیں اور پھر تھوڑی دیر بعد بولا ”اگلا سال تمہاری زندگی میں بہت اہم ہے کیونکہ کچھ عرصہ پہلے غالباً چھ ماہ پہلے تمہاری کوئی خواہش پوری ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تم آنے والے سال کے بارے میں بھی فکر مند ہو!“ اب میں ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ مزید کھول کر اس کے سامنے کر دیا کیونکہ اس کی کہی ہوئی باتیں بالکل درست تھیں۔ لیکن میرے دوست نے ایک بار پھر اسی بے اعتنائی سے اپنی نظریں میرے ہاتھ پر گاڑے رکھیں اور بولا کہ ”کبھی کبھی تم کسی بہت بڑی بات کا

## خاوند سامراج

ایک قریب المرگ بیوی نے اپنے خاوند سے کہا: ”کیا تم میری آخری خواہش پوری کرو گے؟“ اس مرد باوفا نے جواب دیا ”کیوں نہیں، تم کہہ کر تو دیکھو!“ اس پر اس کی بیوی نے کہا: ”ساری عمر تمہاری میرے بھائی سے ناراضی رہی ہے، میں چاہتی ہوں کہ میرے مرنے کے وقت تم اس سے اپنی ناراضی ختم کر دو اور میرے جنازے کو تم دونوں ایک ساتھ کندھا دو۔“ اس پر خاوند نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا: ”اب تمہاری آخری خواہش کو میں رد تو نہیں کر سکتا لیکن اس سے سارے جنازے کا مزہ کر کر اہو جائے گا!“

یہ لطیفہ مجھے ایک اخباری خبر پڑھ کر یاد آیا، خبر کے مطابق بھارت کے صوبے تامل ناڈو کے ایک گاؤں میں ایک 60 سالہ شخص کو ہسپتال لایا گیا، اسے سینے میں درد کی شکایت تھی چنانچہ اسے I.C.U منتقل کر دیا گیا لیکن وہ ٹھیک نہ ہو سکا اور توڑے کی حالت میں چلا گیا جس کے بعد ڈاکٹروں نے اسے مردہ قرار دے دیا۔ اس کی بیوی نے اپنے خاوند کی ”لغش“ حاصل کرنے کے لیے کاغذات پر دستخط کر دیئے اور ”میت“ ایسبولینس میں ڈال کر قبرستان کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستے میں اپنے خاوند کو مردہ حالت میں دیکھ کر وہ متواتر بین ڈالتی رہی اور ایک موقع پر اپنے کاوند کے سینے پر دو ہتھ بھی مارا! سینے پر دو ہتھ لگتے ہی ”میت“ میں حرکت پیدا ہوئی اور اچانک اس ”مرے ہوئے“ شخص کی دھڑکن دوبارہ چلنے لگی، اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا جہاں وہ اب تک I.C.U میں ہے!

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اوپر بیان کیے گئے لطیفہ اور خبر کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

ٹھیک کہتے ہو، میری بڑی خواہش تھی کہ میں اس ملک میں قانون کی عمل داری کی کوئی مثال دیکھ سکوں، پچھلے دنوں جب پاکستان کے فاسٹ بولرز محمد آصف اور شعیب اختر پر پابندی لگی تو میری یہ خواہش پوری ہو گئی لیکن میں اگلے سال کے بارے میں فکر مند ہوں کیونکہ تم تو جانتے ہو کہ میرا دوایوں کا کاروبار ہے اور اس کاروبار کو چلانے کے لئے expired ادویات بھی اونی پونے دایوں بچتی ہیں۔ پہلے یہ کام صرف وطن عزیز میں ہی ہو سکتا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے میں سن رہا ہوں کہ حکومت ان ادویات فروشوں پر بڑا کریک ڈاؤن شروع کرنے والی ہے۔ اللہ خیر کرے! خیر تم آگے بولو۔ اپنی پیشین گوئیوں کا یہ حال دیکھ کر میں کچھ سٹپسا گیا تاہم میں نے بار نہیں مانی اور اپنا آخری وار کیا۔ ”کبھی کبھی تم کسی بڑی سے بڑی بات کا بھی غصہ نہیں کرتے اور کبھی کسی چھوٹی سی بات کو انا کا مسئلہ بنا کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو!“ یہ کہہ کر میں نے فاتحانہ نظروں سے اپنے دوست کی آنکھوں میں دیکھا مگر اس نے میری نظروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جواب دیا ”ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ جب 1971ء میں سقوط مشرقی پاکستان ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے جان کا روگ بنایا جائے لیکن پچھلے دنوں جب میرے ڈرائیور نے مجھے بتائے بغیر چھٹی کر لی تو میرا بلڈ پریشر دوسو تک پہنچ گیا چنانچہ میں نے اسے کھڑے کھلوتے فارغ کر دیا۔“ اپنے دوست کی یہ بات سن کر میں نے اس کا ہاتھ بند کر کے اسے بحفاظت واپس کر دیا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا ”میرے علم کے مطابق تمہیں اب تک کوئی بڑا سرکاری عہدہ مل جانا چاہئے تھا۔ اگر تمہیں یہ آفر ہو تو ضرور قبول کر لینا کیونکہ تم میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو سرکاری ملازمت میں ترقی کی ضامن ہیں۔“

(22 نومبر 2006ء)

سے تو ضرور نکل گئے تاہم واپس اپنی بیویوں کے پاس نہیں پہنچے۔ تو آج ہی ہماری خدمات سے استفادہ کریں۔ سیشل آفر! ایک خاوند کو دفنانے کی فیس 10 ہزار روپے جبکہ دو خاوندوں کو دفنانے کی فیس 15 ہزار روپے! دیر نہ کیجئے ابھی فون ملائیے!“۔

آخر میں ایک بات اور کہ اگر مرنے کے بعد خاوندوں کی بجائے بیویاں زندہ ہونے لگیں تو کیا ہوگا؟ اس صورت میں تو کوئی اس قسم کے اشتہار چلانے کی جرأت بھی نہیں کرے گا ورنہ تحریک نسواں کی علمبردار خواتین اس کا ”حقہ پانی“ بند کروا دیں گی۔ یہ وہ خواتین ہیں جن کا اپنا ”حقہ پانی“ foreign sponsored ہوتا ہے اس لیے انہیں (ان کی مرضی کے بغیر) ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا!

(29 نومبر 2006)

تعلق کچھ خاص نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ خبر بھی مجھے ایک لطیفہ ہی لگی ہے کیونکہ جس طرح ”مردہ“ اپنی بیوی کے دوہٹر کے نتیجے میں اٹھ کھڑا ہوا، اس سے اس کی بیوی کا ”مزا“ یقیناً کرکرا ہو گیا ہوگا! اس کی بیوی نے خاوند کے مرنے پر بین ضرور ڈالا تھا مگر اس کا مطلب یقیناً یہ نہیں ہوگا کہ خاوند دوبارہ زندہ ہو جائے! کیونکہ اگر ایسا ہونے لگا تو بہت سی بیویاں اپنے خاوندوں کے مرنے پر بین ڈالنا چھوڑ دیں گی۔ خصوصاً وہ بیویاں جو عورتوں کے حقوق کی جدوجہد کے دوران مرد ذات ہی کو ”مرد سامراج“ سمجھنے لگتی ہیں اور متذکرہ صورت میں انہیں ”خاوند سامراج“ ہی لگتا ہے۔ اس خبر میں اس نوع کی بیویوں کے لیے ایک سبق بھی ہے کہ بین ڈالتے وقت وہ ذرا احتیاط سے کام لیں، خاوند کی میت سے لپٹ کر نہ روئیں اور اس کے سینے پر دوہٹر مارنے کی غلطی تو بالکل ہی نہ کریں۔ زیادہ سے زیادہ ہلکی ہلکی چپکیاں لے کر رو سکتی ہیں، یہی نہیں بلکہ کوئی اور عزیز رشتہ دار سیدہ کو بی کی غرض سے میت کے پاس جانے کی کوشش کرے تو اسے فوراً روک لیں۔ اس کے علاوہ خاوند کو دفنانے کے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھیں اور نہایت سرعت کے ساتھ تمام کام پنپائیں۔ یعنی اس بات کو یقینی بنائیں کہ خاوند کی میت کم سے کم وقت گھر میں رہے اور جلدی سے جلدی قبرستان پہنچا دی جائے جہاں اسے بحفاظت دفن کر دیا جائے۔ عقلمند بیویاں ان tips پر عمل کر کے فائدے میں رہیں گی۔

خبر پڑھ کر مجھے ایک خیال اور آیا کہ اگر حقیقت میں ہر دوسرے تیسرے ”خاوند سامراج“ کے ساتھ ایسا ہونے لگے تو پھر خاوند بیزار خواتین ایک دوسرے سے کچھ اس طرح افسوس کا اظہار کریں گی۔ ”بہن بڑا افسوس ہوا، سنا ہے تمہارا خاوند زندہ ہو گیا! اللہ نے مشکل آسان کر دی تھی لیکن پھر امتحان میں ڈال دیا۔ کوئی بات نہیں، صبر کرو میری بہن، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔ اگر اس قسم کے واقعات عام ہونا شروع ہو گئے تو وہ دن دور نہیں جب ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی میدان میں آجائیں گی اور کچھ اس قسم کی اشتہار بازی کریں گی۔ ”اگر آپ کا خاوند مردہ ہو کر زندہ ہو گیا ہے یا آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جائے گا تو فوراً ہماری خدمات حاصل کیجئے۔ ہماری کمپنی اس بات کو یقینی بنائے گی کہ مرنے کے فوراً بعد آپ کے خاوند کی تدفین آنا فانا کر دی جائے۔ آپ یقین کریں کہ اس فیلڈ میں ہمارا تجربہ سب سے زیادہ ہے اور اب تک ہماری کمپنی نے جتنے خاوند دفن کیے ہیں ان میں سے 90 فیصد اپنی قبروں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جبکہ 10 فیصد قبروں

ہے کہ سکھ بہت صاف گو اور سیدھے سادھے کھرے انسان ہوتے ہیں جبکہ اگر آپ ایک کنسلٹنٹ سے کوئی سیدھا سا سوال بھی پوچھیں گے تو آپ کو شاید ہی اس کا سیدھا جواب ملے، مثلاً ”دیکھئے! اس میں مختلف عوامل کا رفرما ہوتے ہیں، اگر آپ کا جی ڈی پی چھ فیصد سے زیادہ ہے تو آپ کے ملک میں بے روزگاری خود بخود کم ہو جائے گی تاہم کرنٹ اکاؤنٹ کا خسارہ ایک الگ چیز ہے، اس کو پورا کرنے کے لیے اگر حکومت اندرونی قرضے لیتی ہے تو وہ کوئی ایسی خطرناک بات نہیں، مقصد یہ ہونا چاہیے کہ درآمدات اور برآمدات کا فرق کم سے کم کیا جائے تاکہ بے روزگاری کی شرح میں.....!“ اس جواب پر یقیناً سردھنا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے دوسرے سوالات پر بھی کنسلٹنٹ صاحب اپنا دامن اس صفائی سے بچا کر لے جائیں گے کہ آپ دیکھتے رہ جائیں گے کنسلٹنٹ حضرات کی ایک خوبی ایسی ہے جس کا میں واقعی بہت معترف ہوں اور وہ یہ کہ ایک کہنہ مشق کنسلٹنٹ ایک ہی قسم کے اعداد و شمار کی مدد سے بیک وقت دو متضاد حقائق ثابت کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ پاکستان اکنامک سروے کسی کنسلٹنٹ کو تھما دیں اور اسے کہیں کہ ایک گھنٹے کے بعد اس کے حق میں اور مخالفت میں دو صفحات کی Fact Sheet تیار کر دے تو وہ حیرت انگیز طور پر ایسا کام کر دے گا اور آپ دنگ رہ جائیں گے بشرطیکہ آپ نے اسے اس کام کا مناسب معاوضہ دیا ہو۔

بات سکھوں سے شروع ہوئی تھی اور کنسلٹنٹ حضرات تک جا پہنچی۔ ویسے اب میں سوچ رہا ہوں کہ سکھ بھی کچھ اتنے برے کنسلٹنٹ نہیں ہوں گے اگر وہ بھی اپنے اندر ایسی خوبیاں پیدا کر لیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ البتہ انہیں جھوٹ بولنے کی مشق ضرور کرنی پڑے گی اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں بات بات پر قہقہہ لگانے سے بھی پرہیز کرنا پڑے گا کیونکہ جب وہ کنسلٹنٹ بن جائیں گے تو یہ کام دوسرے لوگ کیا کریں گے۔

سکھوں اور کنسلٹنٹ میں ایک قدر البتہ ضرور مشترک ہے کہ دونوں دھن کے پکے ہوتے ہیں۔ آپ لاکھ دلائل دیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوں گے بشرطیکہ آپ سردار جی کو شراب اور کنسلٹنٹ کو کسی نئے پراجیکٹ کا لالچ دے دیں۔ ایسے ہی کسی دھن کے پکے سردار نے امریکی صدر کو امرتسر سے فون کیا اور کہا ”جناب صدر! تیار ہو جائیں ہم آپ پر حملہ کرنے والے ہیں۔“ امریکی صدر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: ”سردار جی! آپ کی فوج کتنی ہے؟“ سردار جی نے جواب دیا ”بس میں اور میرا خاندان۔“ اس پر امریکی صدر نے کہا: ”سردار جی

## امپورٹڈ مشورے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دوسکھ دوستوں کو ”کاروبار“ کرنے کا شوق ہوا چنانچہ انہوں نے اپنی اپنی جمع پونجی اکٹھی کی جو کل ملا کر دوسو روپے بنی۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے سو روپے کی خطائیاں خریدیں اور اپنے اپنے ”چھابے“ لگا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ جب کافی دیر تک کوئی گاہک نہیں آیا تو ان میں سے ایک نے (جس کے پاس ایک روپیہ ”سرپلس“ تھا) دوسرے کو اپنا روپیہ دیتے ہوئے کہا ”سردار جی! ذرا دو خطائیاں تو دینا۔“ دوسرے سکھ نے ایک روپیہ لے کر اپنے ساجے دار کو دو خطائیاں فروخت کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے سردار نے وہی ایک روپیہ اپنے دوست کو دیتے ہوئے کہا: ”سردار جی! اب ذرا آپ دو خطائیاں دینا۔“ اس پر پہلے سکھ نے بھی وہی روپیہ لے کر دو خطائیاں اپنے پارٹنر کو ”فروخت“ کر دیں۔ شام تک دونوں سردار یہی ”economic activity“ کرتے رہے اور آخر کار اسی ایک روپے سے ایک دوسرے کے ”چھابے“ خرید کر فارغ ہو گئے!

اوپر بیان کیے گئے لطیفہ نما کہانی سے کچھ لوگ شاید یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کریں کہ ترقی پذیر ملکوں کی economic activity بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے جس قسم کی ان دوسکھوں نے اپنے کاروبار کے دوران کی لیکن وہ لوگ غلط سوچ رہے ہیں کیونکہ حکومتوں کی معاشی پالیسیاں سکھ نہیں بلکہ ”کنسلٹنٹ“ بناتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کنسلٹنٹ، سکھ نہیں ہو سکتے یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ سکھ، کنسلٹنٹ نہیں ہو سکتے! شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر کنسلٹنٹ گنجے ہوتے ہیں اور میں نے آج تک کوئی گنجا سکھ نہیں دیکھا! ویسے اس کی ایک اور وجہ بھی ممکن



## ”سب سے پہلے شکم“

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ زندگی میں جن کاموں کو کرنے میں لطف آتا ہے یا قدرت نے جن چیزوں میں مزا رکھا ہے وہ سب کی سب یا تو غیر اخلاقی ہیں یا پھر غیر قانونی یا پھر موٹاپا پیدا کرنے اور صحت خراب کرنے والی! اگر یقین نہیں آتا تو اس کیلئے کوآزما کر دیکھ لیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے کان میں شدید خارش ہوتی ہے اور آپ اپنا کان چیک کروانے کی غرض سے کسی ای۔ این۔ ٹی۔ سپیشلسٹ کے پاس جاتے ہیں تو وہ فوراً آپ کو مشورہ دے گا کہ کبھی آپ نے اپنے کان میں کوئی بھی نوکیلی چیز حتیٰ کہ ”کاسٹن بڈ“ وغیرہ بھی نہیں ڈالنی بصورت دیگر آپ کے کان میں انفیکشن ہو سکتی ہے یا کان کے پردے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ٹھیک ہے! آپ دل میں سوچتے ہیں کہ آئندہ کبھی کان کی طرف ”آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے“۔ تاہم احتیاطاً ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیتے ہیں کہ اگر بہت زیادہ خارش ہو تو پھر کان کو کیسے کھایا جائے؟ اس پر ڈاکٹر صاحب آپ کو کہتے ہیں کہ اس صورت میں اپنا رومال ”فولڈ“ کر کے کان پر رکھیں اور زور سے دبائیں، بے حد راحت ملے گی۔ آپ یقین کریں کہ راحت تو دور کی بات، اس حرکت سے شدید الجھن ہوتی ہے بلکہ خارش میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہاں، اگر آپ اپنی گاڑی کی چابی سے اپنا کان کھجائیں تو سرور و مستی کی وہ کیفیت آپ کو اپنے دل و دماغ میں محسوس ہوگی کہ جس سے آپ کو اپنی آنکھیں بند ہوتی محسوس ہوں گی اور ایسا لطف آئے گا کہ آپ ہر مرتبہ اپنے ڈاکٹر کے مشورے کو نظر انداز کر کے یہی فعل دہرائیں گے۔ تاہم یاد رہے کہ مزالینے کا یہ فارمولہ نہ صرف خرابی صحت کا باعث بن سکتا ہے بلکہ کسی حد

آپ جنگ سے پہلے مشورہ کر لیں کیونکہ میرے پاس جدید ترین جنگی جہاز ہیں جو ایٹمی ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“ سردار جی نے یہ بات سن کر کہا کہ وہ مشورہ کر کے دوبارہ فون کریں گے۔ دو دن بعد سردار جی نے دوبارہ فون کیا اور کہا کہ ”میرا فیصلہ اٹل ہے، جنگ ہو کر رہے گی اور اب تو میرے ساتھ امرتسر کے علاوہ لدھیانے کے لوگ بھی ہیں اور وہ سب کے سب ہاکیوں سے مسلح ہیں۔“ امریکی صدر نے یہ سن کر تمسخرانہ لہجے میں جواب دیا: ”سردار جی ایک دفعہ پھر مشورہ کر لیں کیونکہ میری فوج دس لاکھ سے زیادہ ہے۔“ سردار جی نے ایک مرتبہ پھر ”مشورہ“ کیا اور دو دن بعد فون کر کے کہا ”ہم نے فیصلہ بدل دیا ہے اب ہم جنگ نہیں کریں گے۔“ یہ سن کر امریکی صدر نے نہایت دلچسپی سے پوچھا ”بھلا وہ کیوں سردار جی؟“ سردار جی نے جواب دیا: ”اس لیے کہ ہمارے پاس دس لاکھ جنگی قیدی رکھنے کی جگہ نہیں ہے!“

یہ لطیفہ اپنی جگہ لیکن ایسا نہیں ہے کہ امریکی صدر کو صرف کوئی سکھ ہی دھمکی دے سکتا ہے، میرے نزدیک یہ کام کوئی بھی کر سکتا ہے مگر اس سے پہلے مشورہ بہت ضروری ہے اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مشورہ دینے والے ہی کو انگریزی میں کنسلٹنٹ کہتے ہیں۔ آپ اسے اس کی فیس ادا کریں، اس کے بعد اس کے مشورے پر عمل کریں جو زیادہ تر اپورٹڈ ہوتے ہیں تاہم اس کے نتیجے میں جو تباہی آئے گی اس کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ تیسری دنیا کے لوگ انہی کنسلٹنٹ حضرات کے اپورٹڈ مشوروں کی فصل کاٹ رہے ہیں۔

(6 دسمبر 2006ء)



دیکھنے کے بعد سیدھے بستر میں۔ لیجئے جناب یہ ہے وہ لائف اسٹائل جو ڈاکٹر اور غذائی ماہر تجویز کرتے ہیں۔

میرے ایک دوست کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی حفظانِ صحت کے اصولوں کے عین مطابق گزارتا ہے۔ یہ دوست صبح صادق کی بجائے دفتر جانے کے ٹائم سے صرف 15 منٹ پہلے اٹھتا ہے (لہذا واک چھوڑنی پڑتی ہے) ناشتے کے متعلق اس کا ایمان ہے کہ وہ بھاری بھر کم ہونا چاہئے کیونکہ ناشتے نے ہی باقی ماندہ دن کے لئے جسم کا ”ایندھن“ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ سونا ناشتے میں میرا دوست دو عدد دیسی گھی کے پراٹھے، دو انڈے، ایک گلاس دودھ، شہد میں ڈبوئے ہوئے بادام اور مکھن کی ایک ڈلی لینے کو ضروری سمجھتا ہے دفتر میں سارا دن چونکہ کام بہت ہوتا ہے اس لئے ساتھ ساتھ کھانے کی چھوٹی موٹی چیزیں چلتی رہتی ہیں۔ البتہ دوپہر کے بعد کھانے میں وہ اس بات کا قائل ہے کہ زیادہ heavy نہیں ہونا چاہئے ورنہ دفتر میں نیند آتی رہتی ہے تاہم ابلی ہوئی سبزیوں سے وہ پھر بھی اجتناب ہی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ محض سبزیاں کھانا مسلمان کا شیوہ نہیں اس لئے دوپہر کے کھانے میں گوشت کی ہانڈی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بعد رات کے کھانے تک وہ محض سموسوں، دہی بڑوں کی ایک آدھ پلیٹ، کیلے کا ملک شیک اور چند بیکری آئٹمز پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ میرا یہ دوست رات کا کھانا البتہ یہ کہہ کر کھاتا ہے کہ ”اب میں بد پرہیزی کرنے لگا ہوں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ سارا دن انسان کام اس لئے کرتا ہے کہ اچھا کھا سکے سو وہ رات کو خصوصاً اچھے کھانے کا انتخاب کرتا ہے۔ رات کے کھانے کا مینو بتانے کی اب چنداں ضرورت نہیں۔ اس کا اندازہ آپ پورے دن کے ”پرہیزی“ کھانے سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ البتہ سونے کا ٹائم اس نے رات ایک بجے کا فکس کیا ہوا ہے کیونکہ بقول اس کے اگر ”دی“ سے سویا جائے تو صبح اٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اب آپ اوپر دیئے گئے ان دونوں لائف سٹائل کا موازنہ کیجئے اور سوچئے کہ انسان کو کونسا لائف اسٹائل اپنانا چاہئے؟ ظاہر ہے دل کرے گا کہ دوسرا لائف اسٹائل ہی اپنایا جائے لیکن عقل کہتی ہے کہ پہلا طریقہ ہی بہتر ہے یہاں فیصلہ کرنے کے لئے اقبال نے ہماری مدد کی ہے، وہ پوچھتا ہے:

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟

میرا فیصلہ تو دل کے حق میں ہے مگر میں نے اپنے جس بساخور دوست کا ذکر کیا ہے

تک غیر اخلاقی بھی ہے۔

اب اپنے دماغ میں کھانے پینے کی چیزوں کا تصور لائیے اور ذرا سوچئے کہ آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟ لازماً آپ کے دماغ میں سری پائے، کلچے، دیسی گھی کے پراٹھے، مٹن کڑاہی، بونگ، ہریسہ، نہاری، لسی، مکھن اور اسی قسم کی دیگر ”زود ہضم“ اشیاء آئیں گی۔ ان چیزوں کو کھانے کے بعد میٹھا کھانے کو بھی دل کرتا ہے سو خوش خوراک حضرات اس ضمن میں رس ملائی، گلاب جامن، چاکلیٹ، فریش کریم کیک، شیر خورمہ، فرنی، کھیر وغیرہ تجویز کرتے ہیں جن کے کھانے کے بعد مستی کی کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ جو بیان سے باہر ہے۔ ایک مرتبہ پھر یاد رہے کہ یہ تمام اشیاء موٹا کرتی ہیں۔ اسی طرح اب اپنے ذہن میں چند ایسے کاموں کی فہرست بنائیں جو غیر قانونی ہوں یا غیر اخلاقی اور پھر ایک ایک کر کے ان تمام کاموں کو چشم تصور میں ہی کر ڈالئے۔ آپ کو صرف سوچ کر ہی لطف آجائے گا مگر ظاہر ہے کہ ایسے کاموں کی فہرست یہاں نہیں دی جاسکتی۔

اب ذرا سوچئے کہ آپ کس قسم کا لائف اسٹائل اپنانا چاہتے ہیں؟ ایسا جو غیر اخلاقی، غیر قانونی یا مضر صحت ہے یا پھر ایسا جو حفظانِ صحت کے اصولوں کے عین مطابق ہے؟ ہم نے دوسری قسم کے لائف اسٹائل کا ابھی تک ذکر نہیں کیا، چلیں ذرا اسے بھی تصور کرتے ہیں، یہ لائف اسٹائل کچھ اس قسم کا ہوگا:

صبح صادق کے وقت اٹھنا (چاہے اس وقت درجہ حرارت 3 ڈگری ہو اور آپ گرم رضائی میں سو رہے ہوں) اور اٹھتے ہی فوری طور پر چند ”ڈنڈ بیٹھکیں“ لگانا تاکہ رہی سہی نیند کا خمار بھی جاتا رہے۔ اس کے بعد ایک گھنٹے کی واک! واپس آکر براؤن بریڈ کے دو سلاٹس اور ایک کپ چائے بغیر چینی اور دودھ کے۔ آپ پر لازم ہے کہ آپ اسے ناشہ کہیں۔ دفتر میں تقریباً 10:30 بجے کے قریب پھر ایک کپ چائے بغیر چینی اور دودھ کے اور پھر 1:00 بجے دوپہر کا کھانا جو ابلی ہوئی سبزیوں یعنی مٹر، گاجر، سلاد کے پتے، کھیرے وغیرہ پر مشتمل ہو۔ تین بجے ایک اور منحوس قسم کا چائے کا کپ اور ساتھ میں دو عدد پھیکے اور بد مزہ بسکٹ۔ چھ بجے کے قریب ایک آدھ ایسا پھل جو نہ میٹھا ہو اور نہ لذیذ مثلاً جاپانی پھل، پیتا، میٹھا وغیرہ۔ ساڑھے سات بجے رات کا کھانا جو آدھی چپاتی اور ابلے ہوئے گوشت کی دو بوٹیوں پر مشتمل ہو۔ اس کھانے کے ایک گھنٹے کے بعد آدھ گھنٹے کی واک اور پھر ٹی وی کا خبرنامہ

## سرکاری بکرے

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر کبھی بڑی عید کے موقع پر بکروں کی فروخت کی ذمہ داری سرکاری اداروں کی ہو تو کیسا سماں ہوگا؟ مثلاً:

ایک بڑے سے ہال میں لاتعداد بکرے بندھے ہوئے ہیں۔ ہال کے شروع میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کھڑکی باہر کھلتی ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر ”ون ونڈ آپریشن“ کی تختی لگی ہوئی ہے۔ ایک کلرک نما شخص کھڑکی کے پیچھے بیٹھا لوگوں کو ٹوکن دے رہا ہے۔ ایک ٹوکن پانچ روپے کا ہے جو دس روپے میں مل رہا ہے۔ لوگ ٹوکن لے کر ہال میں داخل ہو رہے ہیں جہاں سے وہ اپنی پسند کا بکرہ منتخب کر سکتے ہیں۔ ایک شخص مناسب قسم کا ایک بکرہ پسند کرتا ہے اور ہال میں بیٹھے اہلکار سے پوچھتا ہے:

گا بک: ”اس بکرے کی قیمت کیا ہے؟“

اہلکار: ”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“

گا بک: ”کیا مطلب؟ تو پھر کسے معلوم ہے؟ آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟“

اہلکار: ”میرا کام یہاں بکروں پر نظر رکھنا ہے۔ قیمت بتانے کا کام ان صاحب کا

ہے جو کونے والی میز کے پیچھے بیٹھے ہیں، آپ ان کے پاس چلے جائیں۔“

گا بک حیران و پریشان ہو کر کونے والی میز کے پاس پہنچتا ہے۔ یہاں ایک

سپرٹنڈنٹ قسم کا شخص بیٹھا ہے۔

گا بک: ”جناب! اس بکرے کی قیمت کیا ہے؟“

اس کی رائے اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے ”میں سب سے پہلے پاکستان“ کے سلوگن کا قائل ہوں اور اتنے ہی شد و مد سے اس بات کا بھی حامی ہوں کہ ”سب سے پہلے شکم“ کے فلسفے کو بھی فروغ دیا جائے کیونکہ ”سب سے پہلے پاکستان“ اور ”وہ سب سے پہلے شکم“ والے نعروں کی یکجائی ہی سے بات مکمل ہوتی ہے ورنہ بقول اقبال:

”موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں“

(25 دسمبر 2006ء)

سپرٹنڈنٹ کے پاس پہنچتا ہے اور اسے رسید تھا کر کہتا ہے:

گا ہک: ”لیجئے جناب! اب آپ کی ساری دفتری کارروائی مکمل ہو گئی، اب جلدی سے مجھے اس بکرے کا valuation فارم دے دیں۔“

سپرٹنڈنٹ: ”لیکن وہ بکر تو اب نہیں ہے۔“

گا ہک: ”نہیں ہے؟ کیا مطلب؟“

سپرٹنڈنٹ: ”وہ بکر اسیکرٹری صاحب کے سالے کو پسند آ گیا تھا، وہ لے گئے ہیں۔“

گا ہک: ”کیا مطلب ”لے گئے“؟ کیا مفت لے گئے؟“

سپرٹنڈنٹ: ”نہیں جناب! میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ مفت کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس بکرے کی مارکیٹ ویلیو 5100 روپے assess کی گئی تھی سو وہ 5100 روپے جمع کروا کے لے گئے۔“

گا ہک: ”صرف 5100 روپے میں! اچھا چلیں کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے اس دوسرے بکرے کی قیمت میرا مطلب ہے ویلیو assess کر دیں، اس کی جسامت بھی بالکل پہلے والے بکرے جیسی ہے۔“

سپرٹنڈنٹ: ”ٹھیک ہے، آپ عید کے بعد آ جائیں۔“

گا ہک: ”کیا!!؟ عید کے بعد! کیسی باتیں کر رہے ہیں جناب؟ کیا قربانی میں عید کے بعد کروں گا؟“

سپرٹنڈنٹ: ”یہ تو میں نہیں جانتا لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ کا فارم نمبر 2856 ہے اس حساب سے آپ کی باری عید کے بعد ہی آئے گی۔“

گا ہک: ”او جناب کچھ مہربانی کریں، عید کے بعد باری لے کر میں کیا کروں گا؟ کوئی طریقہ نکالیں حضور!“

سپرٹنڈنٹ: ”آپ صورت سے شریف آدمی لگتے ہیں، چلیں آپ بھی کیا یاد کریں گے، آپ کل آ جائیں، آپ کے بکرے کا valuation فارم تیار ہوگا۔“

گا ہک: ”بڑی مہربانی جناب۔“

اگلے دن گا ہک خوشی خوشی جیب میں 5100 روپے ڈالے سپرٹنڈنٹ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

سپرٹنڈنٹ: ”بکرے کی قیمت؟ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہاں کسی بکرے کی کوئی قیمت نہیں۔“

گا ہک: ”کیا مطلب؟ تو کیا یہ سارے بکرے مفت ہیں!“

سپرٹنڈنٹ: ”نہیں جناب! یہ میں نے کب کہا؟ بھلا کوئی چیز مفت بھی ملتی ہے؟“

گا ہک: ”تو پھر اس بکرے کی قیمت کیوں نہیں بتاتے؟“

سپرٹنڈنٹ: ”جناب! میں نے کہا نا کہ یہاں بکروں کی قیمت نہیں ہوتی بلکہ ان کی مارکیٹ ویلیو assess کی جاتی ہے۔“

گا ہک: ”اچھا تو پھر اس کی مارکیٹ ویلیو ہی بتا دیں۔“

سپرٹنڈنٹ: ”اس کے لئے آپ کو مجوزہ فارم پر ایک درخواست ڈی سی او صاحب کو دینی پڑے گی۔ فارم باہر والی کھڑکی سے ملے گا اور ڈی سی او آفس میں جمع ہوگا۔ اس کی رسید لے کر میرے پاس آئیں، میں رسید جمع کر کے آپ کو Animal Valuation Form دوں گا، اس پر اس کا لے بکرے کی مارکیٹ ویلیو لکھی ہوگی۔“

گا ہک یہ سن کر باہر والی کھڑکی کے پاس پہنچتا ہے اور اس سے مجوزہ فارم طلب کرتا ہے۔ وہاں اسے بتایا جاتا ہے کہ فارم سو روپے کا ملے گا اور سو روپیہ سامنے نیشنل بینک کی برانچ میں ایک چالان فارم فل کر کے جمع کرنا ہوگا۔ گا ہک ایک گھنٹہ لگا کر سو روپیہ جمع کرواتا ہے اور پھر جمع شدہ چالان فارم کی کاپی لے کر کھڑکی والے کلرک کو دیتا ہے۔ کلرک جواباً اسے ایک تین صفحات کا فارم دیتا ہے جو ڈی سی او آفس میں جمع ہونا ہے۔ پشت پر فارم بھرنے کی ہدایات دی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اس فارم کے ساتھ شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی، بینک سٹیٹمنٹ، انکم ٹیکس کے سالانہ گوشوارے کی کاپی اور گھر کے ایک بل کی کاپی منسلک کرنی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سارے کاغذات اوتھ کمشنر سے تصدیق شدہ ہوں۔

تین دن کی محنت شاقہ کے بعد گا ہک دوبارہ بکروں کے سرکاری فروخت کے دفتر داخل ہوتا ہے۔ ان تین دنوں میں اس نے تمام کاغذات تیار کر کے نہ صرف اوتھ کمشنر سے تصدیق کروائے بلکہ ڈی سی او آفس میں جمع کروانے کے بعد رسید لینے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ سو وہ خوشی خوشی ایک بار پھر پانچ روپے کا ٹوکن دس روپے میں خرید کر سیدھا

## ”گنجه فرشته“

ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں سب فرشتے بستے ہیں، ان میں شیطان کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ جس کسی سے بات کریں وہ آپ کو اپنے کردار کے لحاظ سے قرون اولیٰ کا کوئی مسلمان لگے گا۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ اس نے کیسے ساری زندگی ایمانداری کے ساتھ بسر کی، اس کے پاس کرپشن کے ایک سو ایک مواقع تھے مگر اس نے ان مواقع سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اس نے آخرت میں اللہ کو بھی جواب دینا ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ آپ کو بتائیں گے کہ وہ ترقی کی دوڑ میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے کیوں رہے۔ اس لئے کہ وہ موقع پرست نہیں تھے اور اس لئے کہ انہوں نے ترقی کیلئے وہ ناجائز ذرائع استعمال نہیں کئے جن کے ذریعے ان کے دوست ان سے آگے نکل گئے۔ اسی طرح کچھ لوگ آپ کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ انہوں نے بہت اعلیٰ منصب ٹھکرائے کیونکہ انہیں قبول کرنے کی صورت میں ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا۔ اس طرح کے بہت سے لوگوں سے ملنے کے بعد میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ جب سارے کا سرا معاشرہ فرشتوں پر مشتمل ہے جو ہمہ وقت اپنی ”حمہ و ثنا“ میں مشغول رہتے ہیں تو معاشرے میں سارے شیطانی کام کون کر رہا ہے؟ کیونکہ مجھے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے مجھے بتایا ہو کہ وہ جعلی ادویات، جعلی موبل آئل، جعلی سگریٹ، جعلی کریمیں، جعلی دیسی گھی، جعلی دیسی انڈے، جعلی دیسی مرغیاں، پسے ہوئے جعلی گرم مصالے، جعلی چائے اور جعلی جمہوریت تیار کرتا ہے۔ کوئی نہیں مانتا کہ وہ قبضہ گروپ چلاتا ہے، کبھی کسی نے بھی اقرار نہیں کیا کہ وہ رشوت لیتا ہے، کبھی کسی نے اپنا تعارف اسمگلر کے طور پر نہیں کرایا، کبھی کوئی نہیں

گا ہک: ”سرکار! وہ بکرے کا فارم تیار ہے؟“  
 سپرنٹنڈنٹ: ”بالکل تیار ہے جناب۔ یہ لیں فارم، آپ کے بکرے کی ویلیو 16320 روپے assess کی گئی ہے۔ سامنے والے نیشنل بینک میں یہ فارم جمع کروا کر رسید لے آئیں اور اپنا بکرالے جائیں۔“  
 گا ہک: ”یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب! 16320 روپے! آپ نے تو کہا تھا کہ اس بکرے کی ویلیو 5100 روپے ہے۔“  
 سپرنٹنڈنٹ: ”نہیں جناب! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے ایسی کوئی غیر ذمہ دارانہ بات نہیں کی تھی۔ 5100 روپے اس بکرے کی نہیں بلکہ اس بکرے کی ویلیو assess کی گئی تھی جو آپ نے پہلے پسند کیا تھا۔“  
 گا ہک: ”لیکن یہ بکرہ بھی تو بالکل ویسا ہی ہے، اس کی اتنی زیادہ ویلیو کیوں assess کی گئی ہے؟“  
 سپرنٹنڈنٹ: ”جناب یہ تو آپ Auction Committee سے پوچھیں۔“  
 گا ہک: ”یہ Auction Committee کیا چیز ہے؟“  
 سپرنٹنڈنٹ: ”یہ کمیٹی بکروں کی ویلیو assess کرتی ہے۔“  
 گا ہک: ”ہوں! میں سمجھ گیا یعنی جو بکرہ سیکرٹری صاحب کے سالے کو پسند آجائے وہ 5100 روپے کا اور جو عام آدمی نے خریدنا ہو وہ 16320 روپے کا، یہ بڑی زیادتی ہے۔“  
 سپرنٹنڈنٹ: ”ویسے میرے پاس آپ کے مسئلے کا ایک حل موجود ہے۔“  
 گا ہک: ”وہ کیا؟“  
 سپرنٹنڈنٹ: ”آپ میری یہ چٹ رکھیں، اسے لے کر بکرہ منڈی چلے جائیں، وہاں کسی سے بھی شیدے کن ٹٹے کا پتہ کر کے اسے یہ چٹ دے دیں۔ وہ آپ کو یہی بکرا سات آٹھ ہزار میں دے دے گا۔ ہمارے ہاں سے آپ کو جو بکرہ ملے گا اس میں ہماری تنخواہیں بھی تو شامل ہیں اور ہاں میری مٹھائی نہ بھولنے گا۔“

(31 دسمبر 2006ء)

”فرشتوں“ کی سرکاری قسم بھی بہت عام ہے۔ یہ آپ کو ہر دفتر میں ہر جگہ مل جائیں گے۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ساری عمر ہر کام (اگر کوئی کام کیا ہے تو) میرٹ پر کیا ہے، سینئر افسر کے ناجائز حکم کی کبھی پرواہ نہیں کی، سرکاری وسائل کا بے جا اور ذاتی استعمال کبھی نہیں کیا وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی ایک ”فرشتہ صاحب“ اپنے ڈرائیور کو ہدایات دے رہے تھے: ”ہاں! دیکھو تم ایسا کرو کہ ڈبل کیبن یہیں چھوڑ جاؤ اور ٹیوٹا لے جاؤ۔ پہلے بیگم صاحبہ کا سوٹ درزی سے لے کر گھر پہنچانا پھر ان کی دوست کو ڈیفنس سے لے کر کنال ویو تک چھوڑنا ہے، سمجھ گئے ناں؟ شاباش!“ اسی دوران فون کی گھٹی بجتی ہے، صاحب فون اٹھاتے ہیں ”جی سر، جی سر، بالکل ٹھیک ہے سر، کوئی مسئلہ نہیں سر، میرٹ بھی میں نے ہی بنانا ہے سر، اس امیدوار کو ٹاپ پر لے آئیں گے، میرٹ لسٹ کی پرواہ نہ کریں۔ بہت شکریہ سر، بس ذرا میری پوسٹنگ کا خیال رکھئے گا، تھینک یوسر۔“

عورتوں کے بغیر چونکہ کوئی بات بھی مکمل نہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان پر بھی بات کی جائے۔ آج کل عورتوں پر رائے زنی کرنا کوئی آسان کام نہیں، نجانے کب حقوق نسواں بل کی کوئی شق لاگو ہو جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں لہذا اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ تمام عورتیں ”فرشتہ صفت“ ہوتی ہیں۔

سو آپ نے دیکھا کہ ہمارے چاروں طرف ”فرشتوں“ کی کس قدر فراوانی ہے، یہاں تو کوئی برا آدمی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ حیرت ہے کہ جس ملک میں ہر سال ساڑھے تین لاکھ افراد عمرے پر اور ڈیڑھ لاکھ افراد حج پر جاتے ہیں اور جہاں ”فرشتوں“ کی اس قدر بھرمار ہو، وہ ملک ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کے مطابق کرپشن میں سرفہرست ہو۔ اے میرے ”فرشتے“ بھائیو! اس پر احتجاج کرو۔

(6 جنوری 2007ء)

مانتا کہ وہ عہدوں اور مناصب کے حصول کے لئے وطن فروشی بھی کر سکتا ہے جبکہ یہ سبھی لوگ اپنا تعارف ایک صاحب کردار شخصیت کے طور پر کراتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھے لاہور سے باہر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت اس شہر میں ایک ہی ڈیپارٹمنٹل سٹور تھا، اس کے مالک سے ملاقات ہوئی، اس ”فرشتے“ نے اپنے کاروبار کی ترقی کے حوالے سے بتایا کہ یہ سب کچھ اس کی محنت اور ایمانداری کا ثمر ہے کہ آج وہ اس شہر کے سب سے بڑے سٹور کا مالک ہے۔ باتوں باتوں میں ملاوٹ کا ذکر چل نکلا، اس ”فرشتے“ نے بتایا کہ اکثر اس کے سٹور پر جعلی مشروبات بنانے والے آتے ہیں جو اسے کسی بھی مشہور برانڈ کی بوتل آدھے داموں دینے پر تیار ہوتے ہیں۔ یہ بات کرتے ہوئے موصوف نے با آواز بلند ”لا حول ولا قوۃ“ بھی پڑھی اور پھر وہ حدیث بھی سنائی جس میں کہا گیا ہے کہ ”ملاوٹ کرنے والا ہم میں سے نہیں“۔ میں اس مرد با کردار کی باتوں سے متاثر ہونے ہی لگا تھا کہ میرے دوست نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر نکلتے ہی میرے دوست نے جو اسی شہر کا رہنے والا تھا مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ان حضرات کی باتوں میں نہ آنا، موصوف شہر کے سب سے بڑے ذخیرہ اندوز ہیں یہی نہیں بلکہ جن بوتلوں کا وہ ذکر کر رہے تھے وہ پچھلے دنوں چھاپے کے دوران ان ہی کے سٹور سے برآمد ہوئی تھیں۔“

”فرشتوں“ کی ایک قسم ڈل کلاس فرشتوں پر بھی مشتمل ہے۔ یہ فرشتے اس وقت تک اس کلاس میں رہتے ہیں جب تک ان کا ہاتھ صحیح نہ پڑ جائے! ان کی ساری عمر ڈل سے اپر کلاس میں آنے میں لگ جاتی ہے۔ اگر یہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو ٹھیک ورنہ یہ ساری عمر grumble کرتے رہتے ہیں اور زمانے کو کوستے رہتے ہیں۔ آپ ان سے بات کریں تو یہ کہیں گے ”اصل میں جناب ہم شریف لوگ ہیں، ہم وہ کام نہیں کر سکتے جو لوگ کرتے ہیں۔ خدا کے فضل سے ساری عمر رزق حلال کھایا ہے، حرام کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا سو جناب ایسے میں تو ایسا ہوتا ہے۔“ بظاہر تو یہ باتیں بالکل ٹھیک ہیں مگر اس کا کیا کریں کہ یہی لوگ جابجا آپ کو ناجائز کام کرتے اور کرواتے نظر آتے ہیں، گاڑی کے ٹوکن بچانے سے لے کر اپنے بیٹے کو اے۔ ایس۔ آئی۔ لگوانے تک! جو ناجائز کام ان کے بس میں نہیں ہوتا، اس کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ آج تک انہوں نے کوئی ایسا ویسا کام نہیں کیا جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ایسے ویسے کام کی انہیں یا تو آفر نہیں ہوتی یا پھر حوصلہ نہیں ہوتا!



کا ہے کا فکر! نہایت بے نیازی سے گاڑی کو لاک کرتے ہیں کہ اگر ایک آدھ دروازہ کھلا بھی رہ گیا تو؟ who cares آپ نے تو انشورنس کروا رکھی ہے۔ اپنے گھر میں گیراج کے ہوتے ہوئے بھی گاڑی کو باہر کھڑا رکھتے ہیں تاکہ بار بار نکالنے میں آسانی ہو۔ اگر کوئی دوست گاڑی مانگنے آتا ہے تو بے فکری سے اسے چابی تھماتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”لے جاؤ یار! اور ہاں دیکھو اگر کوئی پستول وغیرہ دکھا کر گاڑی لے جانے کی کوشش کرے تو بے دھڑک دے دینا، یہ گاڑی انشورڈ ہے۔“ اسی طرح خود کسی بھی جگہ بے فکری سے گاڑی پارک کر دیتے ہیں چاہے وہاں پارکنگ سٹینڈ ہی نہ ہو (اور واپس آ کر گاڑی کو وہیں پارک کرکے مایوس بھی ہوتے ہیں) تاہم اگر خدا نخواستہ آپ کی ”انشورڈ گاڑی“ کو زلزلے کے جھٹکے کے نتیجے میں نقصان پہنچ جائے یا کار لفٹر آپ کی گاڑی اٹھاتے ہوئے گرا دے یا کسی وجہ سے آپ کی گاڑی کو آگ لگ جائے تو انشورنس کمپنی آپ سے کیا سلوک کرے گی؟ کیا کمپنی کا نمائندہ آپ کی تباہ شدہ گاڑی کی پوری رقم لے کر آپ کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا ہو جائے گا اور نہایت پر مسرت طریقے سے آپ کو رقم لوٹائے گا؟ یقیناً نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے آپ کو یاد دلایا جائے گا کہ ذرا ان کاغذات کو غور سے پڑھیں جو آپ نے انشورنس کی پہلی قسط جمع کرواتے وقت دستخط کیے تھے۔ جی ہاں! وہ چند کاغذات نہیں بلکہ کاغذات کا ایک پلندہ تھا جن پر لاتعداد مقامات پر آپ کے دستخط لئے گئے تھے جو اس وقت آپ نے خوشی خوشی کیے تھے۔ یاد ہے ان کاغذات پر نہایت باریک انگریزی لکھی ہوئی تھی جو صرف محذب عدسے سے ہی پڑھی جاسکتی تھی۔ شاید آپ نے اس وقت فرط جذبات میں ان کاغذات کو پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی تاہم اب اس کا وقت آگیا ہے۔ انشورنس کمپنی کا نمائندہ آپ کی خدمت میں ان کاغذات کی کاپی لے کر حاضر ہو جائے گا اور آپ کو دکھائے گا کہ آپ کا کلیم انشورنس معاہدے کی شق نمبر فلاں کی ذیلی شق فلاں کے تحت قابل قبول نہیں لہذا کمپنی کی طرف سے محض معذرت قبول کی جائے! آپ کی حیرانی دور کرنے کے لئے کمپنی کا نمائندہ آپ کو بتائے گا کہ ”سر! دراصل آپ کی گاڑی کسی ایکسیڈنٹ میں تباہ نہیں ہوئی لہذا اس نقصان کو ہمارا معاہدہ کو نہیں کرتا۔ سوری سر! Have a nice day تھینک یو!“

اب آپ ایک نیا کور موبائل فون خریدیں جس کی ایک سال کی گارنٹی ہو۔ فرض کریں ایک دن کے بعد آپ کا یہی فون خراب ہو جائے اور آپ اسے لے کر کمپنی کے پاس جائیں

## ملٹی نیشنل کمپنیاں

یہ دور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا ہے۔ اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں، آپ کو چاروں طرف انہی کمپنیوں کا جلوہ نظر آئے گا۔ ادویات، مشروبات، برگر، کچن آئٹمز، پیٹ، ریل اسٹیٹ، پٹرول، بنک، موبائل فون، بجلی کی مصنوعات، کپڑے، میک اپ کا سامان، کمپیوٹر غرض آپ جس چیز کے بارے میں سوچیں اس پر آپ کو کسی نہ کسی ملٹی نیشنل کا لوگو نظر آئے گا۔ یہ کمپنیاں اپنی مصنوعات فروخت کرنے کیلئے نہایت پرکشش اور دل فریب اشتہارات دکھاتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اپنے اشتہارات سے صارف کا دماغ چاٹ لیتی ہیں۔ یہ موبائل لیں، اس میں ریکارڈنگ ہے، یہ ٹیکس لیں، اس میں کال سب سے سستی ہے، یہ گاڑی لیں، یہ سٹیٹس سمبل ہے، اس بنک میں روپیہ جمع کروائیں، بہت منافع ہوگا، اس LCD ٹی۔وی کی تصویر بہترین ہے وغیرہ وغیرہ۔ تاہم یہ دلکش دعوے محض تب تک ہی اچھے لگتے ہیں جب تک آپ ان کمپنیوں کی کوئی چیز خرید نہیں لیتے یا ان کی کسی خدمت سے استفادہ نہیں کرتے۔ جس لمحے آپ نے یہ کام کر لیا اسی لمحے آپ پر یہ آشکار ہوگا کہ جو چیز جیسی نظر آتی ہے درحقیقت ویسی نہیں ہوتی۔ آئیے کچھ مثالوں کی مدد سے اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ ایک گاڑی خریدتے ہیں اور ساتھ ہی اس کی انشورنس کروا لیتے ہیں اور بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب آپ کی گاڑی ایکسیڈنٹ، چوری، ڈکیتی اور اس نوع کے دیگر ناگہانی خطرات سے مکمل طور پر محفوظ ہوگئی ہے۔ آپ خوش ہیں کہ آپ نے کس قدر دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے۔ اپنی گاڑی کی چابی اچھالتے ہوئے بازار سے گزر جاتے ہیں کہ اب



## رات گئے

ایک زمانہ تھا جب ہر برا کام صرف رات گئے ہوا کرتا تھا۔ چور، ڈکیت، رسہ گیر، بد معاش، اجرتی قاتل، راہزن غرض یہ کہ ہر لون ٹائپ آدمی رات ہونے کا انتظار کرتا اور جوں ہی رات ہوتی، وہ اپنے ”کام“ پر نکل کھڑا ہوتا۔ دن دیہاڑے وارداتیں تو فقط عید شب رات کو ہی دیکھتے میں آتی تھیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے، اب رات دن کی کوئی قید نہیں۔ ہمارے پاس بہت چوائس ہے یعنی ہم جس وقت چاہیں جہاں چاہیں لٹ سکتے ہیں۔ دن ہو یا رات، سنسان جگہ ہو یا گنجان آباد، اکیلے ہوں یا دوستوں کے ہمراہ، آپ کو لٹنے کے حوالے سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کے پاس موبائل فون ہے (جو کہ یقیناً ہوگا) اور تھوڑی بہت نقدی وغیرہ تو آپ کو کسی بھی وقت لوٹا جاسکتا ہے۔ تاہم افسوس اس بات کا ہے کہ معاشرے کے دیگر شعبوں کی طرح ڈکیتی اور راہزنی جیسے ”پرفیشن“ بھی اب ”نان پرفیشنل“ کے ہاتھوں میں آ گئے ہیں۔ جسے دیکھو ڈاکو بن رہا ہے اور جوڈاکو نہیں بن سکتا، وہ اچکا یا اٹھائی گیرہ بن جاتا ہے اور یہ سارا کام میرٹ کے عین مطابق ہو رہا ہے۔

جن لوگوں کو یہ سب سمجھنے میں دشواری پیش آرہی ہے، ان کی آسانی کے لئے گزارش ہے کہ جس طرح چند سال پہلے تک ایف ایس سی کرنے والے طالب علم کے پاس دو راستے ہوا کرتے تھے، اول، اگر اس کے نمبر زیادہ ہوتے تو وہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیتا، دوم، اگر نمبر کم ہوتے تو پری انجینئرنگ! میں اور اگر مزید کم ہوتے تو پھر بی اے میں داخلہ تو پکا تھا۔ بالکل اسی طرح ڈاکو، اچکا اور اٹھائی گیرہ sequence ہے۔ ڈاکو کا میرٹ سب سے

تاکہ تبدیل کروایا جاسکے تو کیا ہوگا؟ یقیناً آپ کی معصومیت پر ہنسا جائے گا! اول تو آپ کو بتایا جائے گا کہ فون میں پیدا ہونے والی خرابی گارنٹی میں کور نہیں ہوتی تاہم اگر آپ بہت ذہین ہیں اور کسی طریقے سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ فون کی خرابی گارنٹی میں کور ہوتی ہے تو آپ سے فون لے کر کہا جائے گا کہ دو ہفتے کے بعد آکر اپنا مرمت شدہ فون لے جائیں۔ آپ لاکھ کہیں کہ صرف ایک دن بعد ہی فون میں خرابی پیدا ہوئی ہے اس لئے آپ کو نیا فون تبدیل کر کے دیا جائے لیکن آپ کی ایک نہیں سنی جائے گی اور مجبوراً آپ کو اپنے نئے فون کی مرمت ہی کروانی پڑے گی۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں کو کال کرنے کا تجربہ بھی نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ اگر آپ نے فون کر کے کوئی معمول کی بات پوچھنی ہے تو وہ آپ کو جھٹ سے بتا دی جائے گی اور اس کے بعد کہا جائے گا ”کچھ اور جاننا چاہیں گے سر؟“ اگر آپ کا جواب ناں ہے تو کہا جائے گا ”ہمیں کال کرنے کا بہت بہت شکریہ، اپنا خیال رکھئے گا، اللہ حافظ!“ تاہم اگر آپ نے کوئی مشکل یا معمول سے ہٹ کر سوال داغ دیا تو آپ کی کال کو پہلے تو ہولڈ کروایا جائے گا اور اس کے بعد کہیں اور ٹرانسفر کر دیا جائے گا۔ اب آپ نے نئے سرے سے اپنا مسئلہ بیان کرنا ہے، پھر ہولڈ کروایا جائے گا اور پھر آپ کی کال ٹرانسفر کر دی جائے گی۔ اور ایک دفعہ پھر آپ کو اپنا مسئلہ دہرانا پڑے گا۔ یہ عمل تب تک جاری رہے گا جب تک آپ کا پیاناہ صبر لبریز نہ ہو جائے یا رابطہ منقطع نہ ہو جائے! کسی بھی صورت میں آخری حل آپ کو یہ بتایا جائے گا کہ آپ ان کے دفتر تشریف لا کر اس مسئلے کا حل جان سکتے ہیں (لیکن کوئی گارنٹی نہیں کہ آپ کا مسئلہ وہاں بھی حل ہو جائے گا!)۔

جو کچھ بھی ہو، ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی وجہ سے ملک میں کافی رونق دکھائی دیتی ہے۔ بلند و بالا عمارتیں، بڑے بڑے رزمین اشتہاری بورڈ، روشنیوں کی چکاچوند اور گہما گہمی! ہماری زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ہو جو ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کنٹرول میں نہ ہو لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، شاید اس لئے کہ اس سے پہلے متحدہ ہندوستان کا کنٹرول بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں ہی تھا۔!!!

(15 جنوری 2007ء)

میں ہیں اور فریقین اپنی زبان پر بھی قائم رہیں۔ ادائیگی کا طریقہ کار کریڈٹ کارڈ کے ذریعے یقینی بنایا جائے اور کسی بھی قسم کے جھگڑے کی صورت میں معاملہ اعلیٰ سطح کی ایک کمیٹی میں بھیج دیا جائے جس کا فیصلہ حتمی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کمیٹی کے تمام ممبران نہایت منجھے ہوئے چور ہونے چاہئیں۔ اسی طرح قتل کے نئے ٹھیکے ایک شفاف قسم کے ٹینڈر کے نظام کے تحت صرف بہترین قاتلوں کو دیئے جائیں اور اس قسم کے تمام ٹینڈر اسی ویب سائٹ پر ”آن لائن“ پر دستیاب ہوں۔ نئی بھرتیوں کے لئے اس ویب سائٹ پر ”کیریئر“ کے نام سے علیحدہ ایک ”بکس“ بنادیا جائے جہاں ابھرتے ہوئے چور، اچکے اور قاتل وغیرہ اپنا CV drop کر سکیں۔

5- ماہانہ نیوز لیٹر کا اجراء کیا جائے جس میں آئندہ ہونے والی تمام اہم تقریبات کی مکمل تفصیل ہوتا کہ جرائم پیشہ افراد کو صحیح طور پر منصوبہ بندی کرنے میں دشواری نہ ہو۔ اسی طرح رواں مہینہ میں ہونے والی وارداتوں کی مکمل تفصیل بھی اسی نیوز لیٹر میں درج ہو اور ہر ماہ ”Gangster of the Month“ کا اعلان کیا جائے اور اس کی تصویر بمعہ مکمل کوائف کے ساتھ شائع کی جائے۔

6- دوران واردات ”شہید“ ہونے والے مجرموں کے اہل خانہ کے لئے خصوصی بہبود فنڈ قائم کیا جائے جس سے اس کی مالی معاونت کی جاسکے۔ اگر اس خاندان کا کوئی بچہ جوان ہو تو اسے پولیس میں بھرتی کرانے کی کوشش کی جائے اور اگر کسی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہو تو اسے جگ ٹیکس لینے والے کسی گروہ کا ممبر بنادیا جائے۔

7- جرائم کے تمام شعبوں میں عورتوں کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ کسی بھی شعبے میں خواتین کے ساتھ امتیاز نہ برتا جائے۔

اپنی ان تجاویز کا ذکر میں نے ایک دوست سے بھی کیا (جو کہ خاصا بدگمان واقع ہوا ہے)۔ میرے دوست نے ان تمام تجاویز کو بغور سنا اور پھر پوری سنجیدگی کے ساتھ بولا کہ ”ہمارے جیسے ملکوں میں بد معاشی پہلے ہی institutionalize ہے لہذا ان تجاویز کی کوئی حیثیت نہیں“۔ اپنے دوست کی بات سن کر میں خاموش ہو گیا، یقیناً وہ سچ کہہ رہا تھا!!!

(19 جنوری 2007ء)

زیادہ ہے جبکہ اچکا اور اٹھائی گیرہ اس کے بعد آتے ہیں۔ جن لوگوں کے خیال میں ان تینوں حضرات میں کوئی خاص فرق نہیں، ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ڈاکو کی تعریف پر وہ مرد یا عورت پورا اترتا ہے جو اسلحہ دکھا کر لوٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو جبکہ اچکے وہ لوگ ہیں جو آپ کے ہاتھ سے کوئی چیز لے کر بھاگ جائیں (بغیر اسلحہ دکھائے) اور سب سے آخر میں اٹھائی گیرہ۔ یہ وہ مرد با حیا ہے جو اسلحہ بھی نہیں دکھاتا اور آپ کے سامنے آکر آپ سے کچھ چھینتا بھی نہیں۔ یہ بے چارہ فقط راہ چلتے کوئی چیز اٹھا کر بھاگ جاتا ہے۔ یہ definitions میں نے احتیاطاً بیان کی ہیں تاکہ کل کلاں کو جب آپ کا پالا ان میں سے کسی سے پڑے تو آپ کو پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔ ڈاکو حضرات کے ساتھ خصوصی احتیاط برتیں اور ان سے زیادہ chummy ہونے کی کوشش نہ کریں ورنہ کافی ”حیرت انگیز“ نتائج نکلیں گے! بات ہو رہی تھی ”پروفیشنل“ اور ”نان پروفیشنل“ کی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیگر شعبوں کی طرح ڈکیتی اور قتل وغیرہ کو بھی institutionalize کر دیا جائے تاکہ بہت سا ٹیلنٹ جو ادھر ادھر چھوٹی چھوٹی وارداتوں میں ضائع ہو رہا ہے، اسے مکمل طور پر ابھرنے کا موقع مل سکے۔ اس ضمن میں چند ایک سفارشات درج ذیل ہیں:

1- فوری طور پر ایک اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں اپنے زمانے کے منجھے ہوئے ڈکیت، نو جوانوں کو ٹریننگ دیں۔ کسی اعلیٰ پائے کے ریٹائرڈ اجرتی قاتل کو اس اکیڈمی کا سربراہ مقرر کیا جائے جبکہ اس کے بورڈ آف گورنرز میں ماہر رسد گیر اور نقب زن شامل ہوں۔

2- ایک ملک گیر تشہیری مہم کے ذریعے Talent Hunt کیا جائے تاکہ پسماندہ علاقوں سے بھی لوگوں کو آگے آنے کا موقع ملے اور ان کا احساس محرومی دور ہو سکے۔

3- وائٹ کالر کرکرام کرنے والوں کو کنسلٹنٹ کے طور پر ہائر کیا جائے تاکہ وہ فراڈ کرنے کے ان امور سے بھی پردہ اٹھا سکیں جن تک رسائی اس سے پہلے ممکن نہیں تھی۔

4- ایک ویب سائٹ تیار کی جائے جس میں کرائے کے قاتلوں کا مکمل ڈیٹا بیس ہو۔ جس کسی کو اجرتی قاتل کی خدمات حاصل کرنی ہوں، وہ اس ویب سائٹ کو کلک کرے اور اپنی پسند کے اجرتی قاتل کے ساتھ معاہدہ کر لے۔ اس ویب سائٹ کو نہایت ہی سائنٹیفک بنیادوں پر تیار کیا جائے تاکہ معاہدے کرنے والوں کے نام بھی صیغہ راز

ممکن ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگوں کو اس واقعہ کا ”کلائمکس“ پسند نہ آیا ہو لیکن حقیقت کچھ ایسی ہی ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی جان ہتھیلی پر لیے گھوم رہا ہے، یقین نہیں آتا تو تھوڑی دیر کے لیے سڑک پر گاڑی چلا کر رکھ لیں، آپ کو یقین آجائے گا کہ ہر شخص کس قدر خطرناک قسم کی جلدی میں ہے۔ دائیں بائیں سے گاڑیاں آپ کو سولکومیٹر کی رفتار سے اور ٹیک کرتی ہوئی گزر جائیں گی۔ سرخ اشارے پر رکتے ہوئے آپ کو ڈر لگے گا کہ کہیں کوئی گاڑی پیچھے سے آکر آپ کی گاڑی کو ٹکرائے اور محض آدھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد آپ سوچنے لگیں گے کہ اس سے زیادہ آسان کام تو موت کے کنوئیں میں گاڑی چلانا ہے، کم از کم وہاں ٹریفک تو نہیں ہوتی۔ یقیناً سڑکوں پر تیز رفتاری دکھانے والے لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہوں گے جو یقیناً کسی قسم کی ایمرجنسی کا شکار ہوں تاہم ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی ہوتی ہے۔ اگر آپ باقی لوگوں کا sample survey کر کے دیکھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ تمام لوگ یا تو برگر کھانے جا رہے ہیں یا جوس پینے، تھیر جا رہے ہیں یا کسی نمائش میں، ریسٹوران جا رہے ہیں یا کسی کیفے میں..... یا زیادہ سے زیادہ اپنے سسرال جا رہے ہیں!

یہاں ایک بات اور قابل غور ہے کہ ہر وقت جلدی میں ہونے کے باوجود ہم کبھی بھی کہیں بھی وقت پر نہیں پہنچ پاتے، اس کی وجہ آج تک سمجھ نہیں آسکی۔ دفتر ہو یا شادی کا کوئی موقع، کسی سے ملاقات کرنی ہو یا دعوت میں جانا ہو..... ”ہمیشہ دیر کر دیتے ہیں ہم“!!! (بے شک آتے ہوئے ہم سارے اشارے توڑ کر ہی کیوں نہ آئے ہوں)۔ تاہم یہ اصول ہر موقع پر لاگو نہیں ہوتا۔ ویزہ لگوانے جانا ہو، کسی خاتون سے ملنا ہو یا اپنے سے زیادہ بااثر آدمی سے ملاقات کرنی ہو، ہم ان موقعوں پر ہمیشہ وقت سے پہلے مقررہ جگہ پر پہنچتے ہیں۔

لوگوں کو اس قدر جلدی میں دیکھ دیکھ کر اب مجھے الجھن ہونے لگی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ساری قوم کو کسی نے ”فاسٹ فارورڈ“ کر دیا ہے۔ بقول منیر نیازی

منیر اس ملک پر آسیب کا سایا ہے یا کیا ہے

کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

منیر نیازی نے اس شعر میں جو دکھ بیان کیا ہے اسے میں سمجھ گیا ہوں اور اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں وطن عزیز میں ”پوسٹیوں“ کی بین الاقوامی انجمن کی ایک شاخ کھول لوں اور

## بندر کا تماشا

پھانک کافی دیر سے بند تھا اور ٹرین تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پھانک کے دونوں طرف گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا ایک اژدھام تھا تاہم اس رش کے باوجود ہر کوئی پھانک کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ آگے نکلنے کی اس کوشش میں ایک سائیکل سوار بھی شامل تھا۔ اس کی عمر تقریباً تیس پینتیس برس تھی اور اس کے چہرے سے بے چینی مترشح تھی۔ کچھ دیر کوشش کے بعد جب اسے پھانک کے قریب ہونے کا رستہ نہ ملا تو اس نے سائیکل کو اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پر اٹھایا اور پیدل چلنے لگا۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ اسی دوران ٹرین کی آواز سنائی دی۔ آواز سنتے ہی پوری ٹریفک میں ایک ہلچل مچ گئی تاہم وہ ”سائیکل سوار“ نوجوان ابھی بھی سائیکل سر پر اٹھائے چلا جا رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ اس نوجوان نے اسی حالت میں پھانک کو کراس کیا اور ریلوے لائن پار کر گیا، ساتھ ہی ٹرین برق رفتاری سے گزر گئی۔ اس نوجوان کے ریلوے لائن پار کرنے اور ٹرین کے گزرنے کا وقفہ بمشکل پانچ سیکنڈ کا ہوگا، ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے ٹرین اسے کچل ہی دے گی۔ میں نے دل میں سوچا کہ نہ جانے اس شخص کو کیا ایمرجنسی تھی کہ اس نے اتنا بڑا رسک لے کر ریلوے لائن کراس کی۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے گاڑی گنیر میں ڈالی اور پھانک کھلنے کے بعد ریلوے لائن کراس کر کے سڑک پر ہولیا۔ جونہی میں سڑک پر پہنچا، میری نظر اسی شخص پر پڑی اور میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شخص جس نے تھوڑی دیر پہلے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ریلوے لائن پار کی تھی، اب نہایت اطمینان سے سڑک کے کنارے کھڑا ”بندر کا تماشا“ دیکھ رہا تھا!

## یوم نفرت

ایک دفعہ ایک ماتحت نے اپنے افسر سے کہا کہ ”سر! اگر میں آپ کو ایک پرلے درجے کا نالائق اور بیہودہ شخص کہوں تو آپ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟“ افسر نے جواب دیا ”میں تمہیں نوکری سے فارغ کر دوں گا۔“ ماتحت نے پوچھا کہ ”سر! اگر میں آپ کے لیے یہی الفاظ اپنے دل میں سوچوں تو پھر؟“ افسر نے جواب دیا ”پھر میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔“ یہ سن کر ماتحت بولا ”سر پھر سمجھ لیں کہ میں نے دل میں آپ کے لیے یہی سوچا ہے۔“ یہ لطفہ مجھے ویلنٹائن ڈے کے موقع پر یاد آیا۔ بظاہر اس لطفہ کا ویلنٹائن ڈے سے دور تک بھی تعلق نظر نہیں آتا تاہم جس طرح ویلنٹائن ڈے محبت کے اظہار کے طور پر منایا جاتا ہے اسی طرح ایک دن ایسا بھی ہونا چاہیے جس دن لوگ کھل کر نفرت کا اظہار کر سکیں۔ ان دن کو ”یوم نفرت“ کہا جائے اور اس دن لوگ اپنے دشمنوں کو مختلف طریقوں سے wish کریں۔ یوم نفرت کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس دن نفرت کا اظہار (اس ماتحت کی طرح) دل میں نہیں بلکہ برملا کیا جائے گا۔ جس طرح ویلنٹائن ڈے کے موقع پر دل والے ایک دوسرے کو تہنیتی کارڈ، سرخ گلاب اور چاکلیٹ بھیجتے ہیں اسی طرح یوم نفرت کے موقع پر اپنے دشمنوں کو اور ان لوگوں کو جن سے شدید نفرت ہونے لگی ہوگی برا بھلا کہا جائے۔ سرخ گلاب کی جگہ کاٹے بیجے جائیں اور چاکلیٹ کی جگہ چتندر بھیجی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یوم نفرت سے پوری قوم کا نہ صرف کتھارس ہوگا بلکہ اگر یہ دن ایمانداری سے منایا جائے تو کم از کم اس ایک دن کے لیے ہمارے ملک سے منافقت ختم ہو جائے گی۔

لوگوں کو جوق در جوق اس میں شمولیت کی دعوت دوں۔ جن لوگوں کو اس قسم کی انجمن کے بارے میں زیادہ آگاہی نہیں، اُن کے لیے یہ لطفہ پیش ہے:

دنیا کے سست ترین لوگوں نے ایک روز مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ان کی ایک انجمن ہونی چاہیے۔ چنانچہ باہمی رضامندی سے انہوں نے ایک شخص کو صدر اور دوسرے کو جنرل سیکرٹری بنا دیا۔ طے یہ پایا کہ انجمن کا اجلاس ہر ”بیس سال“ کے بعد باقاعدگی سے ہوا کرے گا۔ عہدوں کی تقسیم کے تقریباً پانچ سال بعد جنرل سیکرٹری صاحب ایک روز پیدل جا رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر انجمن کے صدر پر پڑی جو ایک سوئس میل فی گھنٹہ رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے پاس سے گزرے۔ سیکرٹری کو صدر کی یہ تیز رفتاری ”خلاف آئین“ لگی لہذا انہوں نے فوری طور پر ایک شوکار نوٹس تیار کر کے صدر صاحب کو بھیجا دیا (واضح رہے کہ ”فوری نوعیت“ کا یہ کام کرنے میں انہیں پانچ سال لگے)۔ اس نوٹس میں صدر صاحب سے جواب طلب کیا گیا کہ ”کیوں ناں آپ کی پھرتی کی وجہ سے آپ کو صدر کے عہدے سے ہٹا دیا جائے؟“ صدر صاحب کو جب یہ نوٹس ملا تو اس وقت انجمن کا اجلاس ہونے میں دس سال باقی تھے لہذا انہوں نے سوچا کہ نوٹس کا جواب اُسی اجلاس میں دیں گے۔ خیر اگلے دس سال بعد جب اجلاس منعقد ہوا تو صدر صاحب نے یہ جواب دیا کہ ”دوستو! جب میں کار چلا رہا تھا تو غلطی سے میرا پاؤں بریک کی بجائے ایکسیلیٹر پر جا پڑا جس کی وجہ سے رفتار تیز ہو گئی تاہم پھر میں نے سوچا کہ اب ایکسیلیٹر سے پیر کون اٹھائے؟“

مجھے یہ تو نہیں پتا کہ ایسی کسی انجمن کا حقیقت میں کوئی وجود ہے یا نہیں تاہم اگر کبھی اس قسم کی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی تو یقیناً اس کا ہیڈ کوارٹر ہمارے کوئی سرکاری دفتر ہوگا۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ عجلت پسندی اور سست روی جیسی دو متضاد خوبیاں ہماری قوم میں بدرجہ اتم موجود ہیں یعنی بیک وقت ہم عجلت پسند بھی ہیں اور سست بھی۔ سست ایسے کہ بین الاقوامی ”پوسٹیو“ کی انجمن کے تاحیات صدر منتخب ہو جائیں اور عجلت پسند ایسے کہ ڈرائیونگ میں ”مانیکل شو میکز“ کو بھی مات دے دیں تاہم یہ جتنے لوگ آپ کو جلدی میں نظر آتے ہیں، ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنہوں نے آگے جا کر ”بندر کا تماشا“ ہی دیکھنا ہوتا ہے!!!

(3 فروری 2007ء)



موصول ہوں گے۔ ایران کے صدر احمدی نژاد اور ویزا ویلا کے صدر ہوگو شاویز یقیناً اپنے پیغامات صدر بش کو بھیجنے میں پہل کریں گے، اس سے خصوصاً امریکہ اور ایران کے درمیانی سفارتی تعلقات استوار ہونے میں بھی مدد ملے گی۔ ظاہر ہے کہ اس روز امریکی صدر بھی کسی نہ کسی کو ضرور دیکھیں گے اور میرے خیال سے قرعہ اسامہ بن لادن یا ملا عمر میں سے کسی ایک کے نام نکلے گا اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ ان دونوں کے درمیان ”ٹائی“ ہو جائے۔ دنیاوی نفرت اکٹھا کرنے کی اس دوڑ میں ٹونی بلیر اور کنڈولیزا رائس بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق صدر بش کے بعد بالترتیب دوسرے اور تیسرے نمبر پر آئیں گے۔

اب ذرا اپنے ارد گرد نظر دوڑائیے اور سوچئے کہ وہ کون لوگ ہوں گے جنہیں آپ یوم نفرت کے موقع پر دیکھنا چاہیں گے۔ چشم زدن میں پوری ایک فہرست آپ کے ذہن میں تیار ہو جائے گی۔ اس فہرست میں آپ کا پڑوسی بھی ہو سکتا ہے جو آپ کو جلانے کے لیے لسی پی کر آپ کے گھر کے عین سامنے پہنچ کر ڈکار مارتا ہے یا آپ کا وہ رشتہ دار ہو سکتا ہے جس نے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر آپ کو مناسب پروٹوکول نہیں دیا یا پھر آپ کا وہ دوست جو آپ کی ہر سچی جھوٹی بات پر ہاں میں ہاں نہیں ملاتا یا پھر آپ کی سابقہ محبوبہ ہو سکتی ہے جو ہمیشہ ویلنٹائن ڈے کے موقع پر بیمار پڑ جاتی ہے۔

یوں کہنے کو تو یہ سب آپ کے پڑوسی دوست رشتہ دار یا محبوب ہیں اور محبت کے حقدار ہیں تاہم جب آپ نفرت کے حقداروں کی لسٹ بنانے بیٹھیں گے تو یہی نام آپ کے ذہن میں آئیں گے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ کسی ملک دشمن یا دہشت گرد کا نام آپ کی فہرست میں شامل نہیں ہوگا اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ان ملک دشمن ٹائپ لوگوں سے آپ کا کیا لینا دینا کہ ان سے نفرت کی جائے۔ نفرت کرنے کے لیے اپنے دوست، رشتہ دار، پڑوسی یا محبوب کیا کم ہیں اور یوں بھی ”زمینی حقائق“ اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ آپ اپنے کسی اصل دشمن سے نفرت کریں۔

(18 فروری 2007ء)

کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہوں گے جو ”یوم نفرت“ کے آئیڈیا سے ہی نفرت کریں گے۔ ان میں محبت کا پرچار کرنے والی تنظیمیں بھی ہو سکتی ہیں۔ تاہم کم از کم اس ایک دن ہمیں کھل کر ان تنظیموں کی مخالفت کرنا ہوگی اور عوام کو بتانا ہوگا کہ صرف محبت ہی نہیں بلکہ نفرت کا اظہار بھی انسان کا بنیادی حق ہے اور اس حق کا اظہار کرنے سے کسی کو بھی نہیں روکا جاسکتا۔ گوکہ ویلنٹائن ڈے سال میں صرف ایک دن یعنی 14 فروری کو ہی منایا جاتا ہے تاہم دل والے عملی طور پر سارا سال ہی ”valentine mode“ میں رہتے ہیں جبکہ ہم تو صرف سال کا ایک دن نفرت کے کھلم کھلا اظہار کے طور پر مانگ رہے ہیں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ہمارا کھارس ہو سکے۔ ذرا سوچیں کہ جس شخص سے آپ شدید نفرت کرتے ہیں اس دن اسے فون ملائیں گے اور کہیں گے ”کیسے، کیسے مزاج ہیں جناب! آج چونکہ یوم نفرت ہے تو میں نے سوچا کہ سب سے پہلے آپ کو wish کروں، سو جناب! آپ پر اللہ کا عذاب نازل ہوا!“

ظاہر ہے کہ تہوار کی مناسبت سے غیر ملکی کمپنیاں بھی میدان میں آجائیں گی اور نئے تہنیتی کارڈز بازار میں لے آئیں گی جن سے نفرت کے اظہار میں مدد ملے گی۔ ان کارڈز میں نفرت انگیز عبارتیں لکھی ہوں گی اور ہو سکتا ہے کچھ کمپنیاں اس سے بھی دو قدم آگے جائیں اور کارڈز میں کچھ جدید قسم کی گالیوں کا اندارج بھی کر دیں۔ اس دن کے لیے تاریخ کا تعین کرنا بھی نہایت اہم ہے۔ سب سے موثر تاریخ جو میرے ذہن میں آئی ہے وہ ”نائین الیون“ ہے کیونکہ یہ وہ تاریخ ہے جس کی بدولت دنیا میں نفرت اپنے عروج کو پہنچی تاہم اس تاریخ میں ایک قباحت ہے کہ یوم نفرت اس تاریخ کو منانے سے ایسا تاثر ملے گا جیسے یہ مغربی تہوار ہے۔ ہمارے ہاں اکثر ایسے تہواروں پر مختلف حلقوں کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے لیکن اس کا ایک حل میں نے یہ کالم لکھ کر پیش کر دیا ہے تاکہ سندر ہے کہ اصل میں یہ ذہنی اختراع اس کمترین کی تھی لہذا اسے سو فیصد ”دیسی تہوار“ ہی سمجھا جائے۔

مجھے یقین ہے کہ یوم نفرت کا یہ آئیڈیا پاکستان سے باہر بھی مقبول ہوگا اور عالمی سطح پر بھی لوگ اپنی نفرت کا اظہار اس ایک دن کریں گے۔ عالمی لیڈران بھی اس روز ایک دوسرے کو تہنیتی پیغامات بھیجیں گے اور مجھے یقین ہے کہ اس دوڑ میں بھی دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ سب سے آگے رہے گی یعنی سب سے زیادہ پیغامات جناب صدر جارج بش کو ہی

سکتا کہ یہاں سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ ایک اعلیٰ اخلاق کے باکردار انسان بن جائیں گے۔“

تھانوں کے باہر کچھ اس قسم کی تحریر آویزاں ہونی چاہیے کہ ”خبردار! اس عمارت کی حدود میں شریف آدمی کا کوئی کام نہیں، کمزور دل والے حضرات اس کے سامنے سے گزرنے سے بھی پرہیز کریں۔“ ایک عدد وارنگ شادی ہالوں میں لڑکانے میں بھی کوئی حرج نہیں جیسے کہ ”خبردار! شادی کی رسم انجام دینے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی قباحتوں کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے، ادارہ اس ضمن میں کسی بھی قسم کی ذمہ داری قبول نہیں کرے گا۔“ اور اسی طرح ریستورانوں میں جہاں کچھ سال پہلے کہیں کہیں یہ عبارت لکھی نظر آتی تھی کہ ”یہاں سیاسی گفتگو کرنا منع ہے“ وہاں اب یہ عبارت لکھوا دینی چاہیے کہ ”اپنی جیب دیکھ کر آرڈر دیں، ایسا نہ ہو کہ مہینے کے آخر میں آپ اپنے دوستوں سے ادھار مانگتے پھریں۔“

ہسپتال بھی وارنگ دینے کے لیے موزوں جگہ ہے۔ یہاں کچھ ایسی تنبیہ ہونی چاہیے کہ ”مریض کی موت کسی بھی وقت اور کسی بھی وجہ سے واقع ہو سکتی ہے، اس ضمن میں ڈاکٹروں کی غفلت کو مورد الزام ٹھہرانا محض وقت کا ضیاع ہوگا۔“ جبکہ مہنگے پرائیویٹ کلینک کے باہر وارنگ ذرا مختلف ہونی چاہیے جیسا کہ ”ذہنی طور پر تیار ہو کر آئیں کہ آپ کا کسی معمولی سی وجہ سے بھی آپریشن کیا جاسکتا ہے تاہم اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ آپریشن کامیاب ہو۔ ڈاکٹر آپ سے بات کرنے کا پابند نہیں، اس کے لئے محض آپ کے کرائے گئے ٹیسٹ ہی کافی ہیں اور آپ کے لئے لاطینی زبان میں لکھا ہوا نسخہ! اپنی باری کا اطمینان سے انتظار کریں اور کم از کم دس ہزار روپے جیب میں ڈال کر آئیں۔ شکریہ۔“

عورتوں کے حقوق کی تنظیموں اور این جی اوز کو بھی اپنے اداروں کے باہر کسی نہ کسی قسم کی وارنگ آویزاں کر دینی چاہیے جو کچھ اس طرح کی ہو سکتی ہے کہ ”یہاں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک سے امداد لے کر اس امداد کو انہی کے ایجنڈے کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لہذا صرف ہم خیال خواتین و حضرات ہی دادرسی کے لئے رجوع کریں۔“

اداروں، جگہوں اور اشیاء کے ساتھ ساتھ کچھ انسان بھی ایسے ہیں جو نہ صرف مضر صحت بلکہ مضر صحبت ہوتے ہیں۔ ایسے انسانوں کے جسموں پر پکڑوں کے اوپر "warning"

## وارنگ!!!

کہتے ہیں کہ اچھی صحت محض سست رفتاری سے مرنے کا ایک ممکنہ ذریعہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان نے مرنا تو بہر حال ہے تاہم اچھی صحت موت کی جانب اس سفر کو محض سست کر دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں سگریٹ کی ڈبی پر ”تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے“ لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ کہنا ذرا سا مشکل ہے کہ اس عبارت کے نتیجے میں کتنے لوگوں نے سگریٹ سے پیچھا چھڑایا اور موت کی جانب اپنے سفر کو سست کر لیا لیکن ایک بات حتمی طور پر ضرور کہی جاسکتی ہے کہ سگریٹ کے علاوہ بھی بے شمار ایسی چیزیں اور عادتیں ہیں جو سگریٹ سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہیں اور میرے خیال میں ان سب کے بارے میں بھی خبردار کیا جانا چاہیے۔ سب سے پہلی مثال جو اس ضمن میں میرے ذہن میں آتی ہے وہ اسلحے کی ہے۔ کیا کبھی آپ نے موزر، کلاشکوف یا رائفل وغیرہ پر لکھا دیکھا ہے کہ ”خبردار! اس اسلحے کا استعمال کئی معصوم جانیں ضائع کر سکتا ہے۔“ یقیناً اگر اسلحہ پر اس نوع کی تنبیہ درج نہیں ہوتی تو پھر بیچاری سگریٹ کی چھوٹی سی ڈبی کا کیا قصور ہے؟

اسلحے کے علاوہ بھی کچھ جگہیں اور ادارے ایسے ہیں جو انسانی صحت بلکہ جان کے لئے خطرہ ہیں لیکن ان کے بارے میں عوام الناس کو آگاہ کیا جانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ مثال کے طور پر ہر سرکاری دفتر کے باہر یہ وارنگ آویزاں ہونی چاہیے ”خبردار! سرکاری دفاتر کے روز روز چکر لگانے سے آپ کو دل کا عارضہ، بلڈ پریشر اور اس نوع کی دیگر بیماریاں ہو سکتی ہیں۔“ اسی طرح اعلیٰ تعلیمی اداروں کے باہر اس قسم کی سختی لگی ہونی چاہیے ”خبردار! زیادہ پڑھ لکھ جانے سے آپ کا دماغ خراب ہونے کا اندیشہ ہے، ادارہ اس بات کی گارنٹی نہیں دے



## بیزاری

من حیث القوم ہم میں دو متضاد خوبیاں بیک وقت موجود ہیں، حد سے زیادہ خوش مزاجی اور حد سے زیادہ بیزاری۔ تاہم ہمارا پلہ بیزاری میں نسبتاً زیادہ بھاری ہے۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ہم بیزاری ایکسپورٹ کر سکتے ہیں جبکہ خوش مزاجی ہمیں دوسرے ملکوں سے امپورٹ کر لینی چاہیے، اس سے بیلنس آف ٹریڈ بھی بہتر ہو سکتا ہے۔

بیزار لوگوں کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ آپ کو چپے چپے پر مل جائیں گے، دکانوں میں، ریسٹوران میں، پارکوں میں حتیٰ کہ شادیوں میں بھی یہ ساری دنیا سے الگ ہی بیزار بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ جب بھی آپ کسی شادی پر جائیں، وہاں نوٹ کریں تو یقیناً آپ کو چند لوگ ایسے ضرور مل جائیں گے جو بالکل گم صم اور سب سے الگ تھلگ بیزار بیٹھے ہوں گے۔ اگر ان کے بچے بھی ان کے پاس شرارتیں کرتے ہوئے آئیں گے تو وہ انہیں بھی ڈانٹ کر بھگا دیں گے۔ ان لوگوں کے چہرے بالکل سپاٹ ہوتے ہیں اور ان سے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ شادی بیاہ کی تقریبات کو عموماً یہ لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بیزار لوگوں کی چند نشانیاں اور بھی ہیں، ان کی ڈکشنری میں شکریے کا لفظ نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی بھی بات شروع کرنے سے پہلے لوگ ”براہ مہربانی“ یا ”معاف کیجئے گا“ جیسے تکلفات میں نہیں پڑتے۔ اگر اتفاقاً راہ چلتے کسی سے ٹکرا جائیں تو معذرت کرنا تو درکنار، ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی بیزاری مزید پھیل کر منہ کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔ اسی طرح اپنے

tags لگے ہونے چاہیے تاکہ لوگ ان سے ہشیار رہیں۔ مثال کے طور پر بورئخص کا ٹیگ کچھ اس طرح ہونا چاہیے کہ ”حضرات! مجھ سے ہوشیار رہیں، میں محض bore نہیں بلکہ borior ہوں۔“ اسی طرح منافق کا ٹیگ یہ ہونا چاہیے کہ ”خبردار! میری کہی ہوئی باتوں پر اندھا دھند یقین مت کریں، میرے قول و فعل میں تضاد ہے۔“ سرکاری افسر کا ٹیگ یہ ہو سکتا ہے ”میں صرف اپنے اعلیٰ افسر کی عزت کر سکتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً لہذا آپ کی عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔“ کاروبار کرنے والے حاجی صاحبان کا وارننگ ٹیگ یہ ہونا چاہیے ”میری داڑھی سے دھوکا نہ کھائیں، میں مذہبی انتہا پسند نہیں بلکہ کاروباری انتہا پسند ہوں۔“ استاد کے لئے بھی ایک ٹیگ بنایا جاسکتا ہے جس پر صرف یہ مصرع لکھنے سے ہی کام چل جائے گا ”دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو۔“

بات سگریٹ کی ڈبی پر دی گئی وارننگ سے شروع ہوئی تھی اور انسانوں کے warning tags تک جا پہنچی۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی تمام warnings، چاہے وہ اداروں کے بارے میں ہوں یا جگہوں کے بارے میں، اشیاء کے متعلق ہوں یا انسانوں کے، محض بیکار ہوتی ہیں اور ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ خیال بالکل غلط ہے۔ ہم لوگ وارننگ کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو یہ بھی نہیں سوچتے کہ وارننگ دینے والا اسے عملی جامہ بھی پہنا سکتا ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہر کوئی ہمیں محض دھمکی دے کر ہی اپنا الو سیدھا کر لیتا ہے۔ اپنے اسی طرز عمل کے نتیجے میں ہم نے اپنے ارد گرد بے شمار بدمعاش اکٹھے کر لئے ہیں جن میں سے تو کچھ تو ایسے ہیں جو صرف نام کے بدمعاش ہیں اور ویسا ہی کردار ادا کر رہے ہیں جیسا کہ فلم ”پھنے خان“ میں علاء الدین مرحوم نے کیا تھا!

(5 مارچ 2007ء)

دوم: ”اور.....!“

اول: ”بس.....!“

دوم: ”کام ٹھیک جا رہا ہے؟“

اول: ”ہوں!!!“

(لمبا وقفہ)

دوم: ”اچھا اب میں چلتا ہوں، مجھے ابھی چودھری صاحب کے جنازے پر

بھی جانا ہے۔“

اول: ”میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، مجھے بھی اسی جنازے میں جانا

ہے۔“

یقیناً ایسی ”ایمان افروز“ گفتگو سننے کے بعد کسی کا بھی ”ایمان“ تازہ ہو سکتا ہے۔ یہاں نوٹ کرنے کی ایک بات یہ ہے کہ بہت سے بیزار لوگ، پیدائشی بیزار نہیں ہوتے بلکہ حالات انہیں بیزار بنا دیتے ہیں بالکل اسی فلمی مجرم کی طرح جو عدالت میں کہتا ہے ”جج صاحب! میں مجرم نہیں تھا، حالات نے مجھے مجرم بنا دیا!“ ایسے لوگوں کی بیزاری کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ میرے ایک دوست کے مطابق ایسے لوگوں کی بیزاری کی سب سے بڑی وجہ خواتین ہیں۔ بظاہر یہ وجہ کافی حیرت انگیز نظر آتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم لوگ جتنی جلدی خواتین کی طرف منتقل ہوتے ہیں اتنی ہی جلدی ان سے بیزار بھی ہو جاتے ہیں۔ اس بیزاری کی وجہ، ان کی نہ ختم ہونے والی وہ فرمائشیں ہیں جنہیں پورا کرنا کسی شریف آدمی کے بس کا کام نہیں اور اگر فرمائشیں کرنے والی خاتون سے آپ کی شادی ہو چکی ہے تو پھر آپ کی بیزاری ذیل میں دیئے گئے فارمولے کی مدد سے calculate کی جاسکتی ہے:

$$B = mc^2$$

جہاں B برابر ہے بیزاری کے، m برابر ہے میرج کے اور c برابر ہے روشنی کی رفتار کے! (آئین سٹائن کی روح مجھے معاف کرے!)

جن لوگوں کو یہ کالم پڑھ کر سخت بیزاری ہوئی ہے انہیں اس شخص سے عبرت پکڑنی چاہیے جو اپنی بیوی کی بلی سے بے حد بیزار تھا۔ ایک روز اس نے فیصلہ کیا کہ بلی کو گھر سے کس دور پھینک دیا جائے تاکہ بلی دوبارہ گھر واپس نہ آ سکے۔ چنانچہ اس نے بلی کو گاڑی میں

کاروبار میں بھی یہ لوگ ایسی ہی بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان پر شیخ سعدی کے اس قول کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا کہ ”بدمزاج دکاندار کے شہد پر کھیاں بھی نہیں بیٹھتیں۔“ ہمارے ان بیزار دوستوں کی دکان سے اگر آپ ہزاروں روپے کی بھی خریداری کریں گے تو یہ آپ کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے بقیہ روپے آپ کے سامنے پھینک دیں گے اور یہ حرکت کرتے وقت ان کے چہرے پر چھائی ہوئی نخوست مزید نمایاں ہو جائے گی۔

بیزاری اصل میں ایک کیفیت کا نام ہے اور یہ کیفیت اب ہمارے معاشرے کے ہر شعبے میں سراپت کر گئی ہے۔ بیزار لوگوں کی کمپنی میں آپ بے حد بور محسوس کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بیزار لوگوں کو بور بھی کہا جاتا ہے، ایسے لوگوں کی گفتگوں کچھ اس قسم کی ہوتی ہے:

بیزار نمبر 1: ”السلام علیکم“

بیزار نمبر 2: ”وعلیکم!“

اول: ”کیا حال ہے؟“

دوم: ”ٹھیک“

(وقفہ)

اول: ”اور.....!“

دوم: ”بس.....!“

(ایک اور لمبا وقفہ)

اول: ”کام ٹھیک جا رہا ہے؟“

دوم: ”ہوں!!!“

(ایک طویل خاموشی)

اول: ”حاجی صاحب کے جنازے میں گئے تھے؟“

دوم: ”ہاں! تم گئے تھے؟“

اول: ”ہاں۔“

دوم: ”لیکن وہاں تم سے ملاقات نہیں ہوئی؟“

اول: ”ہاں..... شاید..... پتہ نہیں.....!!!“

(ایک اور طویل خاموشی)

## ”اس سٹم“ بم

راجو بلیکی میرا پرانا محلے دار ہے۔ فلموں کی ٹکٹیں بلیک میں بیچنے کے علاوہ کوئی خاص کام نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے راجو بلیکی کے نام سے پکارتے ہیں تاہم جب سے فلمیں فلاپ ہونا شروع ہوئی ہیں اور لوگوں نے سینما گھروں کی جگہ پلازے بنانا شروع کئے ہیں، راجو بلیکی کا کام بھی ٹھپ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل وہ نئے نئے کام کرنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ راجو کوئی چھوٹے موٹے پلان نہیں بناتا بلکہ اس کے منصوبوں کی مالیت کروڑوں میں ہوتی ہے۔ اسے اس بات کا بہت غم ہے کہ محض سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ راجو کے بقول بے شمار لوگ اس کے آئیڈیے چرا کر اور اس کے منصوبوں پر عمل کر کے کروڑ پتی بن چکے ہیں۔

پچھلے دنوں راجو میرے گھر آیا تو خوشی سے اس کی آنکھیں چمک رہیں تھیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولا کہ اس دفعہ اس نے ایسا منصوبہ بنایا ہے جو اس کی زندگی بدل دے گا۔ میں نے تفصیل پوچھی تو راجو نے کہا ”سنا ہے آج کل ایٹم بم کی بہت ڈیمانڈ ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ میں ایٹم بم بناؤں گا۔“ یہ سن کر میرا ماتھا ٹھکا اور میں نے پوچھا کہ یہ مشورہ کس نے دیا؟ راجو بولا ”آپ اس بات کو چھوڑیں، آپ صرف یہ دیکھیں کہ اس کام میں کتنا پیسہ ہے!“ میں نے کہا ”وہ تو ٹھیک ہے راجو! لیکن تم ایٹم بم کیسے بناؤ گے؟“ راجو بولا ”سرجی! آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں، میں خود تو ایٹم بم نہیں بناتا، میں نے جیمز بانڈ کی ایک فلم دیکھی تھی، اس میں ولن، روس کی بلیک مارکیٹ سے ایٹم بم خریدتا ہے جو اسے ایک بریف کیس میں

ڈالا اور گھر سے کچھ فاصلے پر لا کر پھینک دیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ بلی اس سے پہلے ہی گھر واپس پہنچ چکی ہے۔ اگلے روز اس نے بلی کو دوبارہ گاڑی میں ڈالا اور اس دفعہ گھر سے ایک دو راقتادہ مقام پر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے موبائل فون سے گھر فون کیا اور اپنی بیوی سے پوچھا ”سنو! کیا تمہاری بلی گھر میں موجود ہے؟“ اس کی بیوی نے جواب دیا ”ہاں! موجود ہے اور میرے سامنے بیٹھی ہے“ اس پر اس شخص نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولا ”ذرا اس بد بخت کو فون دینا، میں گھر کا راستہ بھول گیا ہوں!“

(11 مارچ 2007ء)

راجو بلیکی تو چلا گیا لیکن میں سوچ میں ڈوب گیا۔ اگر واقعی اس طرح ہونے لگے جیسے راجو سوچ رہا تھا تو کیا ہو؟ یعنی اگر خدا نخواستہ واقعی راجو جیسے لوگ روس کی بلیک مارکیٹ سے بریف کیس بم خرید کر بیچنے لگیں تو شاید کچھ اس قسم کا نقشہ ہو:

راجو: ”سوکا ایک..... سوکا ایک.....!“

گا ہک: ”یہ سوکا ایک کیا ہے؟“

راجو: ”یہ بریف کیس ایٹم بم ہے جو سولین ڈالر کا ایک ملے گا۔“

گا ہک: ”لیکن تمہارے پاس تو دو بریف کیس ہیں، کیا دونوں سولین ڈالر کے ہیں؟“

راجو: ”نہیں..... صرف پہلا بریف کیس سولین ڈالر کا ہے جبکہ دوسرا دوسو

ملین ڈالر کا ہے!“

گا ہک: ”لیکن ان کی قیمتوں میں فرق کیوں ہے؟ دیکھنے میں تو ایک جیسے لگتے ہیں!“

راجو: ”آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں، جناب عالی! یہ پہلا بریف کیس کوریا کا بنا ہوا ہے اور دوسرا روس کا۔“

گا ہک: ”کیا ان بموں کی کوئی گارنٹی وغیرہ بھی ہے؟“

راجو: ”کیسی باتیں کرتے ہیں جناب! بالکل گارنٹی ہے، بے شک یہیں چلا

کے چیک کر لیں! کوریا والے کی ایک سال کی گارنٹی ہے جبکہ روس

والے کی پانچ سال کی اور اگر بم نہ چلے تو پیسے واپس!“

گا ہک: ”اچھا یا صحیح صحیح بھاؤ لگاؤ، سولین ڈالر تو بہت زیادہ ہیں۔“

راجو: ”باؤ جی! آپ بتا دیں کتنے پیسے دیں گے؟“

گا ہک: ”میرے خیال میں تو کوریا والے کے پچاس ملین ڈالر کافی ہیں۔“

راجو: ”نہیں سرکار! اتنے کی تو میری خرید نہیں ہے۔“

گا ہک: ”بہر حال یار جو بھی ہے، میں اس کے زیادہ سے زیادہ ساٹھ ملین ڈالر

دے سکتا ہوں۔“

راجو: ”او جناب! صبح کا وقت ہے، ابھی تو بونی بھی نہیں ہوئی، آپ پہلے

فراہم کیا جاتا ہے اور وہ یہ بریف کیس بم ڈالروں سے بھرے بریف کیس کے بدلے اپنے سے ایک بڑے ولن کو بیچ دیتا ہے۔“

میں نے راجو کو سمجھانے کی کوشش کی فلموں میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے، حقیقت میں ویسا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ سابقہ سوویت یونین کے بعض ریاستوں میں ایٹم بموں کی بلیک مارکیٹیں تو ہیں لیکن وہاں راجو جیسے بندے کا پہنچنا تقریباً ناممکن ہے لیکن میری باتوں کا راجو پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ سنی ان سنی کر کے بولا ”سرجی! آپ مجھے رٹی رٹائی کتابی باتیں نہ سنائیں۔ میرا ایک دوست روس میں رہتا ہے اور اس نے مجھ سے ویزہ بھجوانے کا وعدہ کیا ہے۔ بس ایک دفعہ میں روس پہنچ جاؤں، اس کے بعد وہاں کی بلیک مارکیٹ ڈھونڈنا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔“ میں نے اسے ایک دفعہ پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ محض روس کا ویزہ ملنے سے کام نہیں چلے گا لیکن اس دفعہ اس نے کسی قدر بدتمیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ”سرجی! لگتا ہے آپ نے ایف۔ ایس۔ سی۔ نہیں کی!! آپ کو شاید پتا نہیں کہ ایف۔ ایس۔ سی۔ کی ایک کتاب میں ایٹم بم بنانے کا پورا فارمولا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایٹم بم کی تصویر تو انٹرنیٹ پر بھی مل جاتی ہے، بس اور کیا چاہیے؟ آپ مجھے ایف۔ ایس۔ سی۔ کی کتاب لادیں اور انٹرنیٹ سے مجھے ایٹم بم کی تصویر نکال دیں، میرا کام ہو جائے گا۔“ میں نے حیرت سے کہا ”لیکن یار! یہ سارا کام کرنے کے لیے بہت بڑا پلانٹ لگانا پڑتا ہے جہاں بہت سارے سائنسدان کام کرتے ہیں، اس کے علاوہ یورینیم اور.....“ تاہم راجو نے ایک دفعہ پھر میری بات کاٹی اور قہقہہ لگا کر بولا ”سرجی! ایک تو آپ پڑھے لکھے لوگ ہر آسان کام کو مشکل بنا دیتے ہیں۔ آپ بس مجھے ایف۔ ایس۔ سی۔ کی کتاب اور ایٹم بم کی تصویر دے دیں، میری علاقہ غیر میں بھی ایک بندے سے بات ہوئی ہے، اس نے کہا ہے کہ اسے محض بم کی تصویر دے دی جائے تو وہ ہو بہو ویسا ہی بم بنا دے گا۔ رہی بات یورینیم کی تو میرا خیال ہے ایک آدھ کلو تو اکبری منڈی سے بھی مل ہی جائے گا۔“

میرا ارادہ راجو سے کچھ اور بھی باتیں پوچھنے کا تھا تاہم اس کے تیور دیکھتے ہوئے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ویسے بھی اسے دیر ہو رہی تھی کیونکہ بقول راجو کے اس نے بینک بھی جانا تھا جہاں اس نے بم بنانے کے لیے سرمائے کے حصول کی خاطر قرض کی درخواست دینی تھی۔

## Wanted!!!

آج کل کرکٹ کا ورلڈ کپ کھیلا جا رہا ہے۔ قومی ٹیم پہلے ہی مرحلے میں شکست کے بعد مقابلے سے باہر ہو چکی ہے۔ اس دوران کوچ باب وولمر کا پر اسرار ”قتل“ بھی ہوا جس کی وجہ سے ورلڈ کپ کی میڈیا کوریج میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ان حالات میں وہ لوگ بھی کرکٹ کے متعلق تجزیے لکھنے لگے جو اس سے پہلے صرف ”کپاس کی فصل پر امریکن سنڈی کا حملہ اور اس کے مضر اثرات“ جیسے نازک موضوعات پر ہی قلم اٹھاتے تھے۔ ان تجزیہ نگاروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی آج کرکٹ میں اپنا حصہ ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے اور سوچا ہے کہ یونیورسٹی اور سول سروسز اکیڈمی کے زمانے میں کھیلے گئے کئی کرکٹ میچوں پر مشتمل اپنے وسیع تجربے کو بروئے کار لا کر قوم کو اس نازک بحران سے نکلنے کا راستہ بتاؤں!!

سب سے پہلے تو ہمیں کرکٹ بورڈ کے چیئرمین کا خالی عہدہ پر کرنا چاہیے۔ یوں تو اس آسامی کے لئے کئی امیدوار ہوں گے تاہم سہولت کی خاطر میں نے ایک اشتہار ڈرافٹ کیا ہے تاکہ موزوں امیدوار کو چننے میں کوئی دقت نہ ہو اور سلیکشن کا عمل بھی شفاف نظر آئے جس سے ناقدین کے منہ بند ہو سکیں۔ اشتہار کچھ یوں ہے:

Wanted”

چیئرمین کرکٹ بورڈ“

”کرکٹ بورڈ کو اپنے چیئرمین کا عہدہ پر کرنے کے لئے اہل افراد سے درخواستیں اور نااہل افراد سے سفارشاتیں مطلوب ہیں۔ آئیڈیل امیدوار کی عمر 45 سال سے کم نہ ہو اور وہ

گا ہک ہیں، چلیں آپکے لیے دس فیصد ڈسکاؤنٹ کر دیتا ہوں، آپ نوے ملین ڈالر دے دیں، اس میں آپ کی ڈلیوری بھی فری کر دوں گا!“

گا ہک: ”نہیں نہیں..... نوے ملین ڈالر بہت زیادہ ہیں، آخری بات کرتا ہوں، نہ تمہاری نہ میری، ڈلیوری سمیت ستر ملین ڈالر..... بولو منظور ہے؟“

راجو: ”لیں سر کا ر! آپ بھی کیا یاد کریں گے، یہ لیں اپنا بریف کیس اور لائیں میرا چیک!“

میں یہ مضحکہ خیز مکالمہ سوچ سوچ کر محفوظ ہو رہا تھا کہ اچانک راجو دوبارہ آن ٹپکا تاہم اس مرتبہ وہ کچھ افسردہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولا کہ آپ ٹھیک کہتے تھے، یہ کوئی آسان کام نہیں لیکن پھر اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ بولا ”لیکن سرجی! میں مایوس نہیں ہوا، میں نے ایٹم بم کا آئیڈیا تو ”ڈراپ“ کر دیا ہے تاہم اب مجھے کسی نے اسی کام سے ملتا جلتا لیکن آسان مشورہ دیا ہے کہ میں کسی سٹیج ڈانس کی سی ڈی بناؤں اور اسے بلیک مارکیٹ میں ”آسٹم بم“ کے نام سے بیچوں، سنا ہے ایٹم بم سے زیادہ تباہی مچاتی ہے۔“ راجو کی بات سن کر میں ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا اور پھر اچانک ہی ہاتھ ملا کر اسے رخصت کر دیا مبادہ وہ مجھ سے sample CD نہ مانگ لے!!!

(25 مارچ 2007ء)



”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، میچ سے پہلے ہم نے دس ہزار ڈالر چندہ اکٹھا کر کے جیکا کی ایک مسجد میں دیا تھا لہذا یہ بات غلط ہے کہ ”جونسا“ ہم نے میچ کی تیاری نہیں کی!!“

”کپتان صاحب! یہ تو بہت اچھی بات ہے اور نہایت نیک کام ہے جو آپ نے اور آپ کی ٹیم نے کیا تاہم میرا سوال کرنے کا مقصد آپ سے کرکٹ کی پریکٹس کے بارے میں پوچھنا تھا، کہیں اس میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟“

”نہیں.....“ ”جونسا“ میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میچ پریکٹس کے دوران بھی ہم نے کوئی نماز قضا نہیں کی، بس خدا کی یہی مرضی تھی کہ ہم ہار جائیں۔“

”کپتان صاحب! کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کی ٹیم کے بہت سے کھلاڑی ان فٹ ہیں؟ اور آپ کا بھی وزن کچھ زیادہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے آپ میں اور ٹیم میں وہ پھرتی نہیں رہی جو بین الاقوامی میچوں کو جیتنے کے لئے درکار ہوتی ہے؟“

”نہیں.....“ ”جونسا“ پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا وزن رکی پونٹنگ کے وزن سے یہی کوئی بیس تیس چالیس پچاس کلو زیادہ ہوگا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کھلاڑی کچھ زیادہ ان فٹ نہیں ہیں۔ صرف ایک دو کھلاڑی ہیں جو باؤنڈری لائن سے تھروہ نہیں کر سکتے اور دو چار کھلاڑی زیادہ بھاگ نہیں سکتے۔ باقی سب ٹھیک ٹھاک ہیں اور ماشاء اللہ ہٹے کٹے ہیں۔“

”یہ تو آپ نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ ٹیم میں بہت سے ”کٹے“ ہیں۔“

”بھائی! کٹے نہیں، میں نے ”ہٹے کٹے“ کہا ہے۔“

”جی جی.....“ اچھا یہ بتائیں کہ اس ہار کے بعد آپ کا آئندہ کیا پلان ہے؟“

”پلان کیا ہونا ہے..... جنید جمشید اور ٹیم کے صالح نو جوانوں کے ساتھ مل کر ”دورے“ کروں گا۔“

کپتان کے انٹرویو کا یہ نمونہ تیار کرتے ہوئے میں نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ بورڈ کے چیرمین کی آسامی کے ساتھ ساتھ قومی کرکٹ ٹیم کے گیارہ آسامیوں کے لئے بھی Wanted کا اشتہار تیار کر لیا جائے تاکہ تمام بھرتیاں ایک ہی دفعہ مکمل ہو جائیں۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر یہی قومی ٹیم کرکٹ ورلڈ کپ جیت جاتی تو ہمارا رویہ کیا ہوتا؟ پھر اسی ٹیم کا ایئر پورٹ پر والہانہ استقبال ہوتا، ان پر ان کے وزن سے دو گنی پھولوں کی پتیاں

پچھلے چھ ماہ سے پاکستان میں مقیم ہو۔ دوہری شہریت رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ پارٹ ٹائم جاب کرنے کے خواہش مند افراد بھی درخواست دے سکتے ہیں۔

تجربہ: امیدوار کو کرکٹ کھیلنے کا کم از کم دو سال کا تجربہ ہونا چاہیے۔

اہلیت: امیدوار اس قابل ہو کہ کرکٹ کے نامور کھلاڑیوں کی بے عزتی کر سکے اور کوچ یا مینجر کی حیثیت سے بورڈ کے ساتھ منسلک کھلاڑیوں کو کھڑے کھڑے فارغ کر سکے۔

ذمہ داریاں: کوئی خاص نہیں، تاہم اس کے فرائض میں یہ شامل ہوگا کہ وہ غیر ملکی دورے میں ٹیم کے ساتھ جائے اور جن دنوں ٹیم غیر ملکی دورے پر نہیں ہوگی، ان دنوں بھی وہ ہفتے میں کم از کم دو دفعہ بلا مقصد بیرون ملک سفر کرے گا۔ ہر میچ کے دوران وہ ٹیم کے ساتھ ڈریسنگ روم میں موجود ہوگا اور ٹیم کو لمحہ بہ لمحہ موقع پر ہدایت جاری کرے گا اور اگر ضرورت پڑی تو وہ کھلاڑی کی حیثیت سے ٹیم میں بھی شامل ہو جائے گا۔ بالفاظ دیگر بورڈ کا چیرمین بیک وقت کپتان، کوچ، مینجر، کھلاڑی اور ڈاکٹر کے فرائض سرانجام دے گا۔

نوٹ: ٹیم کی کامیابی کے موقع پر چیرمین کا منہ سے ”توتی“، بجانا اضافی قابلیت تصور کی جائے گی۔ خواہش مند افراد اپنا CV بمعہ سیپل برائے ”ڈوپ ٹیسٹ“ اور دو عدد پاسپورٹ سائز تصویر (چہرے کی) بورڈ کے ہیڈ کوارٹر میں اگلے پندرہ دن تک جمع کروادیں۔ کامیاب امیدوار کو missed call کر کے مطلع کر دیا جائے گا۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اس اشتہار کی اشاعت کے بعد بورڈ کے چیرمین کی تقرری کا مسئلہ نہایت ہی خوش اسلوبی اور میرٹ کے مطابق حل ہو جائے گا۔ اس کے بعد قومی کرکٹ ٹیم کے حوالے سے ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے میچ ہارنے کے بعد کپتان کا انٹرویو!! قوم کو مبارک ہو کہ میں نے بالآخر اس ”پیچیدہ مسئلے“ کا حل بھی ڈھونڈ لیا ہے اور کپتان کی رہنمائی کے لئے انٹرویو کا ایک خاکہ ترتیب دیا ہے جو کوئی بھی کپتان، میچ ہارنے کے بعد بلا کھٹکے دے سکتا ہے، انٹرویو کچھ یوں ہے:

”کپتان صاحب! میچ ہارنے کے بعد آپ کے کیا تاثرات ہیں؟“

”میرے خیال میں خدا نہیں چاہتا تھا کہ ”جونسا“ ہم یہ میچ جیتیں!!!“

”آپ نے بالکل ٹھیک کہا، ہر بات میں خدا کی مرضی شامل ہوتی ہے لیکن پھر بھی شکست کی کوئی توجہ ہوگی جیسے کہ کھلاڑیوں کی میچ پریکٹس نہ ہونا.....؟؟؟“



## ”میں ڈائٹنگ پر ہوں“

آپ نے کبھی نوٹ کیا ہے کہ لوگ کسی بزرگ پوائنٹ پر جا کر عموماً ایک ڈبل برگر بمعہ لارج فریج فرانز آرڈر کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی تاکید کرتے ہیں کہ انہیں ”ڈائٹ“ سو فٹ ڈرنگ دی جائے؟؟؟ اگر آپ ان لوگوں سے اس ”ڈبل ڈیکر“ قسم کی آرڈر کے ساتھ ڈائٹ مشروب لینے کی وجہ پوچھیں تو یہ نہایت فخریہ لہجے میں آپ کو جواب دیں گے کہ ”اصل میں آج کل میں ڈائٹنگ پر ہوں!!!“ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے جواب کے بعد آپ یقیناً اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے کیونکہ آپ ڈائٹنگ پر نہیں ہیں اس لیے آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس کیفیت کے دوران انسان کس قسم کے مراحل سے گزرتا ہے اور ان مراحل میں اسے کیسی خوراک لینی چاہیے!!!

ڈائٹنگ کرنے کا خیال مردوں کو اس وقت آتا ہے جب ان کا وزن اڑھائی سو پاؤنڈ سے تجاوز کر جائے اور عورتوں کو اس وقت جب ان کی کوئی ہم عمر انہیں ”آٹی“ کہہ کر بلائے۔ یہ دونوں ایسے ”مقامات آہ فغاں“ ہیں جہاں انسان کو اپنی ذات کا ”عرفان“ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ آشکار ہوتا ہے کہ اب اسے ڈائٹنگ شروع کر دینی چاہیے۔ تاہم یہ ”ایک سولین ڈالر کا سوال ہے“ ہے کہ آخر ڈائٹنگ کیسے کی جائے؟ کھانا آدھا کر دیا جائے؟ روزانہ دو گھنٹے ورزش کی جائے؟ یا پھر دونوں کام ایک ساتھ شروع کر دیئے جائیں؟ شروع شروع میں ڈائٹنگ کرنے والے کا مورال چونکہ بہت بلند ہوتا ہے اس لیے وہ وزن کم کرنے کو بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتا ہے تاہم ”یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے..... اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب

نچھاور کی جاتیں اور انہیں نوٹوں میں تول دیا جاتا۔ ٹی وی کے ہر پروگرام میں انہیں دعوت دی جاتی جہاں ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے اور اس کھلاڑی کو بھی سر پر بٹھایا جاتا جس بیچارے نے پورے ورلڈ کپ میں محض ٹیم کو پانی پلانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ لیکن شاید خدا کو ہماری حیت واقعی منظور نہیں تھی کیونکہ!!

خدا نے آج تک اُس ”ٹیم“ کی حالت نہیں بدلی  
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

( یکم اپریل 2007ء )

بڑھ کر آدھ پر اٹھے کے برابر ہو جاتا ہے اور آدھے پر اٹھے کے ساتھ تو ظاہر ہے کہ پورا آملیٹ کھانا پڑے گا اور چائے بھی پینی پڑے گی۔ چونکہ یہ سارا عمل صبح کے وقت ہوتا ہے تو لا محالہ واک بھی چھوڑنی پڑ جاتی ہے۔ تاہم ”ڈائنٹ زدہ“ شخص اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ کوئی بات نہیں ابھی شام کو واک کرنی ہے، اُس وقت ساری کسر نکل جائے گی۔

آخر شام ہوتی ہے اور ایک دفعہ پھر واک کا ٹائم ہو جاتا ہے، لیکن اُس وقت تو ٹی وی پر ایک نہایت مقبول پروگرام چل رہا ہوتا ہے، اسے دیکھ کر بغیر کیسے اٹھا جا سکتا ہے؟ ”ڈائنٹ زدہ“ شخص سوچتا ہے کہ ضروری نہیں واک ٹھیک نو بجے ہی کی جائے، دس بجے کی گئی واک بھی اتنا ہی فائدہ دے گی لہذا اپنے آپ پر جبر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، ویسے بھی جبر کرنے سے کم از کم وزن کم نہیں ہوتا۔ اپنا موڈ خوشگوار رکھنا چاہیے اور موڈ خوشگوار کا بہترین طریقہ اس وقت یہ ہے کہ ٹی وی دیکھا جائے۔ اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھتے دیکھتے وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا اور گیارہ بن جاتے ہیں۔ اب اس وقت کون واک کرتا ہے؟ ویسے بھی جب نیند کا غلبہ ہو تو واک نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن کل سے یہ نہیں ہوگا (جمائیاں)، صبح بھی واک ہوگی اور شام کو بھی، بلکہ دوپہر کو بھی..... (انگڑائیاں) ہر وقت واک ہوگی..... ساری دنیا واک کرے گی..... ساری دنیا کے خلاف واک کروں گا..... واک..... واخ..... خر..... خر..... (خراٹے)!!!

میرے خیال میں ”ڈائنٹ زدہ“ شخص کے اگلے تین چار دن کی تفصیل دینے کی بجائے اب ڈائریک آٹھویں دن کا احوال ذہن میں لاتے ہیں:

ناشتہ: ایک پراٹھا، ایک انڈہ اور ایک کپ چائے۔ اگر کوئی کہے کہ ”مکھن نہیں کھاؤ گے؟“ تو جواب ”نہیں میں ڈائننگ پر ہوں!“

واک: وقت نہیں ہے، دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔  
لنچ: دوست ملنے آگئے تھے، کھانا کسی ریسٹوران میں کھایا لیکن ”ڈائنٹ سوفٹ ڈرنک“ کے ساتھ!!!

شام کی چائے: ایک کپ چائے کے ساتھ بیٹھے بسکٹ اور اگر کوئی پیٹری آفر کرے تو ”نوشینکس“ میں ڈائننگ پر ہوں!“

ڈنر: کچھ خاص نہیں، بس جو گھر میں پکا ہو..... آلو گوشت اور چاول وغیرہ۔ اور اگر کوئی کہے کہ بیٹھے میں فرنی ہے تو جواب ”نہیں بھئی! کتنی دفعہ بتاؤں کہ میں ڈائننگ پر

کے جانا ہے“ والے شعر کا مطلب اُسے چند دنوں بعد پوری طرح سمجھ میں آ جاتا ہے اور جن قارئین کو اب تک اس تمام کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اُن کی آسانی کے لیے میں ابھی تشریح کیے دیتا ہوں۔

اپنے ذہن میں ایک ایسے شخص کا تصور لائیے جس نے ابھی ڈائننگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ کے خیال میں ایسا شخص سب سے پہلے کیا کرے گا؟ کیا وہ اپنا ڈائنٹ چارٹ بنائے گا؟؟؟ جی نہیں!!! وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ سب سے پہلے وہ اپنا من پسند کھانا ڈٹ کر کھائے گا کیونکہ آنے والے دنوں میں ڈائننگ کی وجہ سے وہ خدا کی نعمتوں سے محروم رہے گا اس لیے ڈائننگ شروع کرنے سے پہلے ایک دفعہ جی بھر کے وہ سب کچھ کھالے گا جن چیزوں کی شکل دیکھنے کی بھی اجازت آئندہ دنوں میں نہیں ہوگی۔

پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد ڈائننگ کے متعلق سوچنا دنیا کا آسان ترین کام ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں ڈائننگ شروع کرنے والا شخص یہ سوچتا ہے کہ آہستہ آہستہ وزن کم کرنے کی بجائے کیوں نہ ایک ”کریٹش پروگرام“ کے ذریعے یکدم وزن کم کیا جائے! اس لیے کل سے تمام مرغن غذائیں، روٹی، چاول، میٹھا، تلی ہوئی چیزیں اور بیکری آئٹم بند! اب صرف ابلی ہوئی سبزیاں اور سلاد کے پتے وغیرہ کھائے جائیں گے اور اس کے علاوہ صبح شام آدھ گھنٹہ واک کی جائے گی، وزن خود بخود ایک ہفتے میں پانچ کلو کم ہو جائے گا!

اس پروگرام پر تقریباً دو دن خیر و عافیت سے عمل درآمد ہوتا ہے۔ تیسرے دن اچانک ”ڈائنٹ زدہ“ شخص کو ایسی گھی کے پراٹھے کی بھینی بھینی خوشبو کچن میں کھینچ کر لے آتی ہے۔ وہاں بچوں کے لیے سکول کا ناشتہ تیار ہو رہا ہے، انڈے تلے جا رہے ہیں، ڈبل روٹی پر مکھن لگایا جا رہا، جام اور مارلیٹ کے جار ناشتے کی میز پر پیپوں بیچ سجا کر رکھے ہیں۔ اب ڈائننگ کرنے والے کا امتحان ہے تاہم اس مرحلے پر وہ ”چکھنے“ کے بہانے پر اٹھے کا ایک لقمہ (لگ بھگ ایک چوتھائی پراٹھا) انڈے کے ساتھ منہ میں ڈالتے ہوئے کہے گا ”بھئی میں تو ڈائننگ پر ہوں، تم لوگ تو ڈٹ کر کھاؤ!“ اور اُس کے بعد ”اوہو..... آملیٹ میں مرچیں بہت زیادہ ہیں، ذرا جلدی سے ایک چمچ جام کا دینا!“ اب ظاہر ہے کسی چیز کے چکھنے میں کوئی قیامت نہیں آ جاتی، ڈائننگ کی ہے کوئی فاقہ تو نہیں کیا۔ تاہم پھر یہ سلسلہ یہاں نہیں رکتا۔ ”چکھنا“ پھر ایک روٹین بن جاتی ہے اور ساتھ ہی لقمے کا سائز ایک چوتھائی پراٹھے سے

ہوں۔“

واک: پسندیدہ ٹی وی پروگرام کے بعد.....!!!

نہ جانے کیوں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ڈانٹنگ کرنے والا شخص ایک ماہ بعد جب اپنا وزن کرتا ہے تو اس میں خاطر خواہ کمی کی بجائے الٹا اضافہ نظر آتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی کسی مسئلہ ”فیثا غورث“ سے کم نہیں اور اس کا حل بھی کوئی ”فیثا غورث“ ہی دے سکتا ہے، میں نہیں!!! تاہم یہ مسئلہ کچھ کچھ تیسری دنیا کی حکومتوں سے ملتا جلتا ضرور ہے۔ یہ حکومتیں بھی اپنے ادوار میں اپنے تئیں عوام کی فلاح و بہبود کے بہتیرے کام کرتی ہیں تاہم جب ان کا دور ختم ہوتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ترقی کا پہیہ آگے کی بجائے پیچھے کو گھمایا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک کی حکومتیں بھی اپنے پروگراموں میں اُسی طرح کی ڈنڈی مارتی ہیں جس طرح ”ڈانٹ زدہ“ شخص اپنے ”ڈانٹ پروگرام“ میں ڈنڈی مارتا ہے!!!

## حق مغفرت کرے.....!!!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پراپرٹی کا کاروبار عروج پر تھا۔ انہی دنوں رانا صاحب مرحوم کی آبائی زمین ایک نہایت پوش قسم کی ہاؤسنگ سوسائٹی نے منگے داموں خرید لی اور رانا صاحب کے دارے نیارے ہو گئے۔ ساتھ ہی ان کا رنگ ڈھنگ، رہن سہن، لباس، بول چال کا طریقہ، غرض سب کچھ بدل گیا۔ بنیان اور دھوتی کی جگہ ٹی شرٹ اور جینز نے لے لی اور حقے کی جگہ پائپ نے! ظاہر ہے کہ ان لوازمات کے ساتھ وہ گاؤں میں نہیں رہ سکتے تھے لہذا اسی ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک مکان خرید کر شفٹ ہو گئے اور پراپرٹی کا کاروبار شروع کر دیا۔ بڑے لڑکے کو اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیا تا کہ ان کا ہاتھ بٹاسکے اور باقی بچوں کو ”کھوتی سکول“ سے اٹھا کر ایک انگریزی سکول میں داخل کروا دیا جس کا فائدہ رانا صاحب کے بچوں کو تو کچھ خاص نہیں ہوا تاہم اس انگلش میڈیم سکول کے بچوں کو نہایت شستہ قسم کی گالیاں ازبر ہو گئیں۔

یہ سارا بندوبست کرنے کے بعد رانا صاحب نے اپنی تربیت کی طرف بھی توجہ دینی شروع کی۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے اپنے آپ کو خود ہی groom کرنا شروع کر دیا تا کہ نئی سوسائٹی کے رنگ ڈھنگ اپنانے میں انہیں کوئی وقت نہ ہو۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ اونچی سوسائٹی سے تعلق استوار کرنے کے لیے انہیں ”ڈرنک“ شروع کر دینی چاہیے۔ موصوف کو یہ مشورہ بہت پسند آیا اور اگلے ہی روز انہوں نے اپنے گھر ایک ”پارٹی“ رکھ لی جس میں علاقے کے چیدہ چیدہ معززین کو بلایا گیا اور ان کی تواضع ”دلیسی ٹھڑے“ سے کی گئی۔

رانا صاحب نے یہ جملے اسی ترتیب کے ساتھ یاد کر لیے تھے اور محفلوں میں مناسب موقعوں پر pause دے کر وہ جملے بولا کرتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ لوگ رانا صاحب کی انگریزی سے اس قدر متاثر ہوتے کہ اپنی انگریزی بھول کر اردو میں اور اس کے بعد پنجابی میں بات کرنا شروع کر دیتے۔

رانا صاحب کو اپنی قائدانہ صلاحیتوں پر بھی بے پناہ اعتماد تھا اسی وجہ سے انہوں نے سیاست میں دخل اندازی کی کوشش کی لیکن دال نہ لگی تاہم انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ سیاست کے رموز و اوقاف سیکھنے کے لیے انہوں نے ایک ٹھیکیدار سے دوستی کر لی جو کنٹونمنٹ میں مختلف چیزوں کا ”سپلاز“ تھا۔ یہ دوستی ان کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئی اور ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب انہوں نے سوچا کہ پراپرٹی کا کاروبار بند کر کے ”سپلاز“ بنا جائے تاہم پھر کچھ ذاتی مجبوریوں کی بنا پر اپنی اس ”پراگریسو“ سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ بہر حال سیاست سے شغف جاری رکھا اور دوبار اپنے علاقہ کے کونسلر بھی منتخب ہوئے۔ رانا صاحب کا ارادہ یہاں سے اور آگے جانے کا تھا تاہم ”سالوں“ نے ٹکٹ نہیں لینے دی۔ شاید انہیں اپنی بہن کے سہاگ کی عزت کا زیادہ خیال تھا۔ سیاست کے ساتھ ساتھ رانا صاحب کو فلم بینی کا بھی بہت شوق تھا۔ یہ شوق انہیں اس وقت بھی تھا جب وہ گاؤں میں رہا کرتے تھے تاہم اس وقت انہیں ”پتر شاہیہ دا“ اور ”کا کے دا کھڑاک“ جیسی فلمیں پسند تھیں۔ شہر آ کر جب ان کی دوستی پروفیسر صاحب سے ہوئی تو رانا صاحب نے محسوس کیا کہ اپر کلاس صرف انگریزی فلمیں دیکھتی ہے لہذا انہوں نے بھی فوری طور پر ایک ڈی وی ڈی پلیئر خریدا اور پروفیسر صاحب سے ان کی پسندیدہ فلموں کو فہرست لے لی اور پھر ایک دن ہال روڈ جا کر وہ تمام فلمیں خرید کر لے آئے اور ڈرائنگ روم میں موجود برتنوں کے شوکیس میں سجا دیں۔ کوئی ان سے ان کی پسندیدہ فلم کے بارے میں پوچھتا تو نہایت پر اعتماد لہجے میں جواب دیتے کہ ”ویسے تو مجھے ”لارڈ آف دی رنجز“ زیادہ پسند ہے لیکن Titanic کا بھی جواب نہیں“ اور ساتھ ہی واضح کر دیتے کہ انہیں پنجابی فلمیں پسند ہیں اور نہ ہی زندگی میں انہوں نے کبھی پنجابی فلمیں دیکھی ہیں اور انہیں یہ بھی نہیں پتا کہ ”وے اک تیرا پیار مینوں ملیا“ والا گانا فلم ”سالاحب“ کا ہے جو لاہور کے ایک سینما میں متواتر پانچ سال تک لگی رہی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ”سرکاری وضاحت“ کے بعد سوال کرنے والا بالکل مطمئن ہو جاتا۔

علاقے میں ان کی اس پارٹی کا چرچہ بہت عرصے تک رہا۔ رانا صاحب نے اپنی ”Capacity Building“ کی غرض سے علاقے کے ایک پروفیسر سے بھی دوستی گانٹھ لی تاکہ اس کے زیر سایہ وہ اپنی تربیت کا عمل تیز کر سکیں اور اپنے آپ کو اپر کلاس کے طور طریقوں سے پوری طرح ہم آہنگ کر لیں۔ کسی حد تک انہیں اس دوستی کا فائدہ بھی ہوا تاہم پھر بھی رانا صاحب اپنے اصل سے جان نہ چھڑوا سکے۔ گاؤں سے جب ان کے دوست ٹولیوں کی صورت میں اپنے یار سے ملنے آتے تو رانا صاحب کی حالت قابل دید ہوتی۔ اس وقت رانا صاحب کے دوست انہیں گاؤں کی پرانی باتیں یاد دلاتے، ان سے مذاق کرتے اور طعنے دیتے کہ ”رانا جب سے امیر ہو کر شہر آیا ہے، اپنے دوستوں کو لفٹ ہی نہیں کرواتا۔“ لیکن ان سب باتوں کا رانا صاحب پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ اپنی نئی دنیا میں مگن رہنا چاہتے تھے اور اس نئی دنیا میں انہیں کوئی بھی پرانی چیز قبول نہیں تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنی پرانی بیوی بھی بدلتا چاہتے تھے تاہم پھر بیوی اور اپنے سالوں کا ڈیل ڈیل کر ہمت نہیں ہوئی۔ پھر بھی رانا صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی بیوی کا ”گٹ اپ“ تبدیل کر دیا تاکہ اسے کچھ presentable بنایا جاسکے۔ بیوی نے اپنا ”گٹ اپ“ تو تبدیل کر لیا لیکن چہرے پر موجود ابدی دیہاتی پن دور نہ ہو سکا اور اس ساری تگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیوی گاؤں میں اپنے ماں باپ کے گھر جانے کے قابل رہی نہ ہی شوہر کے ساتھ شہر کی دعوتوں میں۔

”جینٹری“ میں شامل ہونے کے لیے ضروری تھا کہ رانا صاحب انگریزی بھی سیکھتے۔ پھر انہیں ایک مرد دانانے یہ مشورہ دیا کہ انگریزی بولنے کے لیے انگریزی سیکھنا ضروری نہیں، اس کے لیے صرف ”سپوکن انگلش“ کا آنا ضروری ہے۔ یہاں ایک دفعہ پھر ان کے پروفیسر دوست، رانا صاحب کے کام آئے جن کی صحبت میں انہوں نے انگریزی کے چند جملے یاد کر لیے جو وہ بے تکان ہر جگہ بولتے تھے، کچھ جملے یوں تھے:

”Hello“

”Good to see you“

”Yes, you are right“

”Same here“

”My pleasure“

## حامد ”قرضی“ یا حامد ”نوسر باز؟“

میرا دوست حامد ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا اور بظاہر خوشحال قسم کا نوجوان ہے تاہم اس میں ایک بری عادت ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی سے قرض مانگتا رہتا ہے۔ اس کی یہ عادت اس قدر مشہور ہو چکی ہے کہ اس کے جاننے والے اب اسے حامد ”قرضی“ کے نام سے بلاتے ہیں! بسا اوقات حامد قرض اینٹھنے کے لیے ایسے طریقے بھی استعمال کرتا ہے جن پر نوسر بازی کا گمان ہوتا ہے، ان کی تفصیل آگے آئے گی۔

حامد کا قرض لینے کا طریقہ واردات خاصا دلچسپ ہے۔ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس جیسے خوش پوش اور خوش گفتار شخص کو ادھار مانگنے کی عادت ہوگی۔ حامد نے ایک مناسب قسم کی گاڑی رکھی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں ہر وقت پندرہ ہزار کا موبائل فون بھی ہوتا ہے اس لیے جب وہ کسی سے نہایت پر اعتماد لہجے میں کچھ رقم قرض کے طور پر مانگتا ہے تو دینے والا یہ سمجھ کر پیسے دے دیتا ہے کہ شاید اتفاقاً حامد کے پاس روپے نہیں ہیں ورنہ اس پر کبھی ادھار مانگنے کی نوبت نہ آتی۔ اس کی ان چالاکیوں کی وجہ سے لوگ اب حامد ”قرضی“ کو نوسر باز بھی سمجھنے لگے ہیں لیکن حامد کو ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ قرض لینے کے لیے جس قسم کی ڈھٹائی درکار ہوتی ہے وہ حامد میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جس نے اسے ایک ”سکہ بند قرضی“ بنا دیا ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ حامد کے قرض اینٹھنے کے طریقے خاصے دلچسپ ہیں۔ ایک ایسا شخص جو حامد کو زیادہ نہیں جانتا، اس کے جال میں با آسانی آجاتا ہے اور حامد کو قرض دے

اولاد کی طرف سے رانا صاحب نے کچھ زیادہ خوشیاں نہیں دیکھیں۔ مرحوم کی ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے۔ دو بیٹے باقاعدہ لنگے جبکہ ایک پولیس میں اے ایس آئی ہو گیا تھا۔ اس بیٹے پر رانا صاحب کو بہت ناز تھا کیونکہ اس کی وجہ سے رانا صاحب کا نہ صرف اپنے گاؤں میں بلکہ محلہ میں بھی کافی ”ٹیکا“ ہو گیا تھا۔ گاؤں کی حد تک تو ”ٹیکا“ ٹھیک تھا لیکن شہر میں اپنے علاقے میں وجہ شہرت ان کا یہ بیٹا نہیں بلکہ اکلوتی لڑکی تھی۔ یہ شہرت بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھی کہ علاقے کے بس سٹاپ کا نام ان کی بیٹی کے نام پر ”رانی سٹاپ“ رکھ دیا گیا۔ اس دن رانا صاحب کا سینہ فخر سے پھول گیا اور اس قدر پھول گیا کہ انہیں ہسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹروں نے ان کا تفصیلی معائنہ کیا اور پھر اعلان کیا کہ انہیں فالج ہو گیا ہے، اب یہ ساری عمر چل پھر نہیں سکیں گے۔ اس دن کے بعد سے رانا صاحب چار پائی سے لگ گئے اور تمام ”سوشل سرگرمیاں“ خود بخود ختم ہو گئیں اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب صبح کاذب کے وقت رانا صاحب کی روح نفسِ غصری کو پرواز کر گئی۔ اس روز رات کو گھر میں بچوں نے ایک عدد پارٹی کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں پارٹی کینسل نہ کرنی پڑ جائے، لڑکوں نے باپ کی میت سورج نکلنے سے پہلے ہی گاؤں روانہ کر دی جہاں رانا صاحب کی نماز جنازہ ان کے رشتہ داروں اور پرانے دوستوں کی موجودگی میں ادا کی گئی۔ رانا صاحب کی تدفین ان کی وصیت کے مطابق ان والد بابا چراغ دین کے پہلے میں کی گئی۔ ”حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا“!!!

(16 اپریل 2007ء)



چونکہ ان کے ساتھ بے تکلفی کا وہ عالم نہیں جو اوپر بیان کیا گیا ہے لہذا ان سے پیسے اینٹھنے کے لیے حامد نے ایک درمیانی راہ نکالی ہے۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے اچانک وہ اپنے کسی کو لیگ کو فون ملا کر پوچھتا ہے ”ڈیر! اس وقت تمہارے پاس کتنا کیش ہے...؟“ دوسری طرف سے کو لیگ کی گھرائی ہوئی آواز آتی ہے ”کیوں؟ خیر ہے؟“ حامد کہتا ہے ”ہاں خیر ہی ہے! اصل میں آج گاڑی کی لیز جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے اور میں غلطی سے چیک بک گھر بھول آیا ہوں۔ اب اس وقت بینک سے ایک صاحب لیز کا چیک لینے کے لیے آئے بیٹھے ہیں اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیا کروں۔ اسی لیے تمہیں فون کیا ہے کہ اگر کچھ کیش تمہارے پاس ہو تو میں انہیں ادائیگی کر دوں، تم کل مجھ سے چیک لے لینا۔“ اس مختصر لیکن پر اثر مکالمے کے بعد حامد اپنے اس کو لیگ سے کم از کم اتنے روپے حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے جتنے اس وقت اس کو لیگ کی جیب میں ہوتے ہیں۔ وعدے کے مطابق حامد ”قرضی“ اگلے روز اس رقم کا چیک بھی اپنے دوست کو دے دیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ”تورا بورا“ بینک کا چیک لاہور میں کیش نہیں ہو سکتا!!!

پچھلے دنوں حامد میرے پاس آیا تو کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ شاید مجھ سے بھی قرض مانگنے کا منصوبہ بنا کر آیا ہے لیکن تھوڑی دیر گفتگو کے بعد پتا چلا کہ موصوف کے ساتھ ”ہاتھ“ ہو گیا ہے۔ یعنی جو فارمولا وہ قرض اینٹھنے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا تقریباً اسی فارمولے کے تحت حامد کا کوئی کو لیگ اس سے چند ہزار روپے ادھار لے گیا ہے۔ حامد نے مجھے اس ”واردات“ کی تفصیل تو نہیں بتائی تاہم مجھے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ کسی نے حامد کے قرض مانگنے سے پہلے ہی خود حامد سے اس وقت قرض مانگ لیا جب وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اب گزشتہ ایک ماہ سے وہ حامد کو قرض واپس کرنے میں لیت و لعل سے کام لے رہا ہے۔ میں یہ پوری سچویشن سن کر خاصا محظوظ ہوا اور مجھے وہ دیہاتی یاد آ گیا جس کی بھینس کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے ایک دوا دی اور کہا کہ ”دوا کو پائپ میں ڈال کر بھینس کے منہ میں ڈال دینا، پھر دوسرے سرے سے پائپ میں پھونک مار دینا، دوا بھینس کے اندر چلی جائے گی۔“ یہ سن کر وہ دیہاتی بولا ”وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب لیکن اگر مجھ سے پہلے بھینس نے پھونک ماری تو پھر؟“ حامد نے جب یہ لطیفہ سنا تو قہقہہ لگا کر بولا ”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، لاؤ اب اسی خوشی میں ایک ہزار روپیہ نکالو، میں بٹوہ گھر بھول آیا

بیٹھتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے پاس پیسہ نکلوانے کا ایک آرٹ یہ ہے کہ وہ کبھی آپ سے اپنے لیے ادھار نہیں مانگے گا بلکہ آپ کے سامنے کسی تیسرے شخص کا دکھڑا سناٹے گا اور کہے گا کہ ”میرے گھر کام کرنے والی ماسی کی بیٹی کی اگلے ماہ شادی ہے۔ بے چاری بیوہ عورت اکیلی چھ گھروں کا کام کرتی ہے اور کوئی کمانے والا نہیں۔ اس قدر خوددار عورت ہے کہ آج تک کبھی اس نے مجھ سے پیسے نہیں مانگے لیکن اس موقع پر مجبور ہو کر مجھ سے پندرہ ہزار کی التجا کر بیٹھی ہے۔ اب تم خود ہی سوچو کہ میں بھلا کیا کر سکتا تھا تاہم پھر بھی میں نے جیسے تیسے کر کے اپنی لگی بندھی آمدنی میں سے پانچ ہزار نکال کر اسے دے دیئے۔ یار! میں بہت لنگار شخص ہوں لیکن اتنا بے غیرت بھی نہیں کہ کسی مجبور کی حسب توفیق مدد نہ کروں۔ تمہارے جیسا کاروباری ہوتا تو اسی وقت سیف میں ہاتھ ڈال کر پورے پندرہ کیا بیس ہزار پیش کر دیتا۔!!!“ یہاں رک کر حامد ”قرضی“ آپ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے گا اور ساتھ ہی اپنے انداز میں بے نیازی پیدا کرنے کی غرض سے سگریٹ سلگائے گا۔ اگر تو اسے لگا کہ آپ بلیک میل ہو گئے ہیں تو لا پرواہی سے بولے گا ”خیر چھوڑو! تم یہ بتاؤ کاروبار کیسا جا رہا ہے؟“ اور اگر اسے یہ محسوس ہوا کہ ابھی آپ کو مزید exploit کرنے کی ضرورت ہے تو پھر وہ اپنی تقریر کا سلسلہ وہیں سے جوڑے گا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ حامد ”قرضی“ اسے فارمولا نمبرون کا نام دیتا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس فارمولے کی کامیابی کا تناسب تقریباً 70 فیصد ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس فارمولے کے تحت لیے گئے پیسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

حامد کے پاس قرض حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے لیکن یہ طریقہ صرف بے تکلف دوستوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس طریقے کے تحت حامد ”قرضی“ نہایت بے تکلفی سے اپنے دوستوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر خود ہی پیسے نکال لیتا ہے اور ساتھ ہی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ دراصل میں بٹوہ گھر بھول آیا ہوں اس لیے احتیاطاً تم سے یہ روپے لے لیے ہیں کہیں کوئی ضرورت نہ پیش آجائے۔ کل تم مجھ سے خود ہی یہ پیسے واپس مانگ لینا کیونکہ تمہیں تو پتا ہے مجھے یہ چھوٹی موٹی باتیں یاد نہیں رہتیں۔“ اور حامد کی یہ بات غلط نہیں ہے کیونکہ اسے واقعی یہ ”چھوٹی موٹی“ باتیں یاد نہیں رہتیں!!!

حامد کا تیسرا فارمولا اپنے ان دوستوں کے لیے ہے جو اس کے ساتھ دفتر میں کام کرتے ہیں۔

ہوں!!!“ یہ سن کر میں نے حامد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یار تم اچھے خاصے معقول انسان ہو اور تم نے ایک مناسب قسم کا معیار زندگی بھی اپنا رکھا ہے پھر تم کیوں ہر کسی سے قرض مانگتے پھرتے ہو؟ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ لوگ تمہیں حامد ”قرضی“ کہیں۔ میری بات سن کر حامد زیر لب مسکرایا اور بولا ”اگر ایک ملک کا صدر ”کرزئی“ ہو سکتا ہے تو میں ”قرضی“ کیوں نہیں ہو سکتا؟“

میرے خیال میں حامد کرزئی صاحب کو حامد ”قرضی“ کی ان باتوں کا فوری نوٹس لینا چاہیے کیونکہ حامد ”قرضی“ کی حرکتیں ان کے لیے مزید بدنامی کا باعث بن رہی ہیں۔

(23 اپریل 2007ء)

## بوڑھا راجا، جوان رانی

ایک خبر کے مطابق لاہور میں ایک مقامی عدالت نے جوان دریائی گھوڑی کے ساتھ بوڑھے گھوڑے کا جوڑا بنانے پر چڑیا گھر کی انتظامیہ کو نوٹس جاری کر دیا ہے۔ لاہور کے چڑیا گھر کے دریائی گھوڑے کو راجا کہا جاتا ہے جبکہ اس کے لیے انتالیس لاکھ روپے کے عوض منگوائی جانے والی مادہ کو رانی کا نام دیا گیا ہے۔ راجا کی عمر اڑتیس برس اور وزن تین ٹن ہے جبکہ اس کی تنہائی دور کرنے کے لیے افریقہ سے جو دریائی گھوڑی لائی گئی ہے اس کی عمر صرف سات برس اور وزن ایک ٹن ہے۔ چڑیا گھر کی انتظامیہ نے جب دونوں کا ملاپ کروانے کی کوشش کی تو راجا نے رانی کو اپنے دانتوں سے زخمی کر دیا جس پر دونوں کو الگ الگ رکھا جا رہا ہے۔

بظاہر یہ خبر خاصی دلچسپ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً نہایت سبق آموز ہے۔ اس خبر میں جو کرب پوشیدہ ہے اسے کوئی ”اہل نظر“ دریائی گھوڑا ہی سمجھ سکتا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کا خیال ہو کہ اس قصے میں دریائی گھوڑے راجا کی بجائے رانی کے دکھ کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو حقیقتاً زیادہ مظلوم ہے تاہم رانی اپنا دکھ کم کرنے کے لیے کچھ ایسے آپشنز استعمال کر سکتی ہے جو شاید راجا استعمال نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر رانی کو چاہیے کہ وہ فوری طور پر راجا کے خلاف 109 کا پرچہ کٹوائے اور اگر اس ضمن میں اسے کسی قسم کی کوئی مشکل پیش آئے تو وہ کسی این۔ جی۔ او۔ سے رابطہ قائم کرے جو نہ صرف رانی کو قانونی مدد فراہم کرے گی بلکہ اسے کینیڈا کی امیگریشن دلوانے میں معاونت بھی کرے گی۔

تنظیم کے pattern پر اپنی ایک تنظیم بنائے جو صرف مادہ جانوروں خصوصاً دریائی گھوڑیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرے۔ تاہم اس کام کو شروع کرنے سے پہلے رانی کو اپنے گٹ اپ میں کچھ تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ سب سے پہلے تو اسے اپنی وضع قطع ماڈرن کرنا ہوگی اور رانی کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ occasional smoker بن جائے۔ اس کے بعد اسے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں پائی جانے والی دریائی گھوڑیوں سے رابطہ قائم کرنا ہوگا اور انہیں اپنی دکھ بھری داستان سنانا ہوگی تاکہ یہ ممالک فوری طور پر رانی کی تنظیم کے لیے وافر فنڈز کا انتظام کر دیں۔ جس دن رانی یہ سب کرنے میں کامیاب ہوگئی اس دن پورے ملک کے دریائی گھوڑے رانی کے تالاب کے باہر لائن لگا کر کھڑے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کثرت ان دریائی گھوڑوں کی ہوگی جو گرین کارڈ یا کینیڈین امیگریشن کی لالچ میں رانی سے شادی کے خواہشمند ہوں گے۔ یہاں ایک مرتبہ پھر رانی کو ان مفاد پرست دریائی گھوڑوں پر لعنت بھیجنا ہوگی اور اپنے لیے کوئی ایسا جیون ساتھ تلاش کرنا ہوگا جو حقیقتاً اس سے محبت کرتا ہوتا ہے اس مرحلے پر شاید یہ کام اتنا آسان نہ رہے۔ لیکن ایک اور کام جو رانی یہاں سرانجام دے سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی جیسی دیگر تنظیموں کو ساتھ ملا کر ایک ”پریشر گروپ“ تشکیل دے جو ”تحفظ حقوق مادہ مویشیاں بل“ منظور کروائے تاکہ آئندہ راجا جیسے کسی تین ٹن کے خبیث نر کو رانی جیسی ایک ٹن کی نازک اندام ”عقیقہ“ کو دانت دکھانے کی جرات نہ ہو سکے۔ تاہم اس ساری جدوجہد کے باوجود رانی کی شکل اور عادتیں ایسی ہو جائیں گی جیسی عموماً ہمارے یہاں کی فلمی ہیروئنوں کی نانیاں ہوتی ہیں۔

آخر میں چند مشورے راجا کے لیے بھی ضروری ہیں۔ راجا کو چاہیے کہ فوری طور پر اپنا سنیا سی طرز زندگی ترک کر دے بلکہ ہو سکے تو پہلی فرصت میں کسی ”سنیا سی باوا“ سے رجوع کرے۔ رانی کی طرح راجا کو بھی اپنا رہن سہن تبدیل کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ راجا کو چاہیے کہ کوئی اچھا سا جم جوائن کر لے، ہلکی پھلکی غذا کھائے اور سارا سارا دن پانی میں بیٹھے رہنے کی بجائے کچھ چہل قدمی کرنا شروع کرے۔ گوکہ رانی کو اس سے الگ کر دیا گیا ہے تاہم اب بھی رانی اسی احاطے میں کہیں ہوگی اور وہ یقیناً راجا میں مثبت تبدیلیاں نوٹ کرے گی۔ لیکن جو بے ہودہ حرکت کر کے راجا رانی کو زخمی کر چکا ہے اسے رانی کے ذہن سے محو کرنا راجا کے لیے کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ راجا کو یہ کام چیلنج سمجھ کر کرنا ہوگا اور اگر وہ کامل یکسوئی

جہاں تک راجا کا تعلق ہے تو خبر میں بتایا گیا ہے کہ اس دریائی گھوڑے کو 1974ء میں افریقہ کے چڑیا گھر سے خریدا گیا تھا اور اس وقت اس کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ چڑیا گھر کی انتظامیہ نے اس کے لیے مادہ کا بندوبست نہ کیا اور 33 برس تک اسے تنہا زندگی بسر کرنا پڑی۔ خبر میں مزید بتایا گیا ہے کہ چڑیا گھر میں قید دریائی گھوڑوں کی طبعی عمر 40 برس ہوتی ہے اور طویل عرصے تک تنہا رہنے کی وجہ سے راجا صنف نازک کو بھول چکا ہے اس لیے اسے رانی پسند نہیں آئی اور اس نے اس پر حملہ کر دیا۔ یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ مسلسل 33 برس تک تنہا زندگی گزارنے کے بعد راجا میں یقیناً ”درویشانہ“ خصوصیات پیدا ہوگئی ہوں گی اور جب رانی کو راجا کے پاس بھیجا گیا تو عین ممکن ہے کہ اس وقت راجا ”نروان“ پانے کے قریب ہو اور رانی کی آمد اس کی ”تپسیا“ میں خلل کا باعث بنی ہو۔

خبر میں اس خدشے کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ راجا نے تو تنہائی کا لمبا عرصہ کاٹ لیا اور اب اس کی عمر پوری ہونے کو ہے لیکن کہیں رانی کو بھی ایسی ہی زندگی نہ بسر کرنی پڑ جائے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ رانی کا ہم عمر ”جیون ساتھی“ فوری طور پر تلاش کیا جائے تاکہ وہ راجا جیسی اذیت ناک زندگی بسر کرنے سے بچ سکے۔ میرے خیال میں رانی کے جیون ساتھ کی تلاش چڑیا گھر کی انتظامیہ کے لیے یقیناً ایک مسئلہ ہوگی کیونکہ اول تو رانی کا ہم عمر دریائی گھوڑا ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں اور دوم یہ کہ رانی کو ایک well settled قسم کے دریائی گھوڑے کی ضرورت ہوگی جو اس سے عمر میں تو بے شک ایک دو سال بڑا ہو لیکن ذہنی طور پر ”میچور“ ہوتا کہ رانی اس کی company میں بلا خوف و خطر زندگی گزار سکے۔ راجا کے تجربے کے بعد یقیناً رانی کے لاشعور میں ایک خوف بیٹھ گیا ہوگا جسے اب کوئی سمجھ دار دریائی گھوڑا ہی دور کر سکتا ہے چنانچہ چڑیا گھر کی انتظامیہ کو چاہیے کہ رانی کے جیون ساتھ کی تلاش کے ضمن میں ”کنوارے پن“ کی شرط نہ رکھیں بلکہ ”شادی شدہ یا رنڈوئے“ دریائی گھوڑوں کا آپشن بھی کھلا رکھیں تاکہ رانی کے لیے بہتر سے بہتر ”بر“ ڈھونڈا جا سکے تاہم اس بات کا خیال رہے کہ ”شادی کے امیدوار“ دریائی گھوڑے عمر میں زیادہ بڑے نہ ہوں۔

قطع نظر اس بات سے کہ رانی کا جیون ساتھ ڈھونڈا جائے، رانی کے لیے ایک آپشن یہ بھی ہے کہ وہ اب ساری زندگی کے لیے دریائی گھوڑوں پر لعنت بھیج دے اور حقوق نسواں

## ایک مثالی شہری

آپ نے اکثر تقاریر میں جو عموماً قومی دن یا اس نوع کے دیگر موقعوں پر کی جاتی ہیں، یہ سنا ہوگا کہ ہمیں ایک مثالی شہری بن کر اس ملک اور ریاست کی خدمت کرنی چاہئے یا یہ کہ ہم میں سے ہر کوئی اگر اپنی جگہ ایک مثالی شہری بن جائے تو پورا ملک خود ہی مثالی بن جائے گا وغیرہ وغیرہ.....!

شاید آپ کا جواب یہ ہو کہ مثالی شہری وہی ہے جو قانون کا پابند ہے لیکن آپ کا یہ جواب غلط ہے۔ کیونکہ جو قانون کا پابند ہے، وہ مثالی نہیں بلکہ ”مجبور“ شہری ہے اور مجبور شہری مثالی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر آخر یہ مثالی شہری کون ہے؟ میں نے اس سوال پر بہت غور کیا ہے اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ”ایک مثالی شہری“ وہ ہے جو تمام سرکاری اعلانات، دعوؤں، اعداد و شمار اور بیانات کو بلاچوں چراں نہ صرف تسلیم کرے بلکہ مناسب موقعوں پر ان پر مسرت و اطمینان کا اظہار بھی کرے۔ آئیے چند مثالوں کے ذریعے ”مثالی شہری“ کی خصوصیات جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرض کریں کہ اسلم ایک مثالی شہری ہے جس کے گھر کی بجلی پچھلے آٹھ گھنٹے سے بند ہے۔ اسلم شکایت درج کرانے کی غرض سے واپڈا کے دفتر فون کر کے درخواست کرتا ہے کہ اس کی بجلی لوڈ شیڈنگ کے گھنٹوں کے علاوہ بند نہ کی جائے کیونکہ شدید گرمی کی وجہ سے اس کے بچے بلک رہے ہیں اور بوڑھے والدین بے حال ہیں۔ اس پر ڈیوٹی پر موجود اہلکار جواب دیتا ہے کہ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لوڈ شیڈنگ نہیں بلکہ لوڈ مینجمنٹ ہے نوٹ فرمالیں۔ دوسری

کے ساتھ یہ کام کرے تو کوئی بعید نہیں کہ رانی ایک مرتبہ پھر راجا کی جانب ملتفت ہو جائے، البتہ اس کام کو کرنے کے لیے راجا کے پاس وقت کچھ کم ہے اور اگر چڑیا گھر کی انتظامیہ نے رانی کے لیے ایک جوان دریائی گھوڑا تلاش کر لیا تو پھر راجا کے لیے ”سنیاس“ لینا ہی مناسب ہوگا۔

راجا کا کیس چڑیا گھر کے دیگر زجانوروں کے لیے باعث عبرت بھی ہے۔ جس طرح راجا کے طرز عمل کی وجہ سے رانی کو اس سے الگ کر دیا گیا، عین ممکن ہے کہ اسی طرح اپنی ماداؤں پر ظلم کرنے والے دیگر جانوروں کو بھی ان سے الگ کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں ان زجانوروں کی طبیعت صاف ہو جائے گی اور انہیں اپنی ماداؤں کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا۔ پتا نہیں دریائی گھوڑے راجا کو اخبار کی سہولت میسر ہے یا نہیں لیکن پھر بھی اس کے لیے ایک آخری مشورہ ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو رانی سے معافی مانگے، امید ہے رانی انکار نہیں کرے گی۔

(29 اپریل 2007ء)

دیکھیں اور ہو سکے تو تھانے دار صاحب سے سفارش کر دیں کہ امجد کو گھر واپس بھیج دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی تھانے دار صاحب کہیں گے امجد کو دوبارہ تھانے بھیج دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ اس درخواست کا مقصد تھانے دار صاحب کی دل آزاری کرنا یا ان کے قانونی فرائض میں مداخلت کرنا ہرگز نہیں۔ بھابھی کو سلام، بچوں کو پیار۔ والسلام!

اسلم (ایک مثالی شہری)

اس درخواست کے نتیجے میں ایس پی صاحب اسلم کو دفتر بلا کر بتاتے ہیں کہ امجد سے تفتیش کی جارہی ہے اور جو نہی تفتیش مکمل ہوگی قانون کے مطابق امجد کو گھر بھیج دیا جائے گا۔ یہ سن کر ہمارا ”مثالی شہری“ بالکل مطمئن ہو جاتا ہے اور گھر جا کر امجد کی بیوی کو تسلی دیتا ہے کہ ”پولیس ریفارمز“ کے بعد ہر کام قانون کے دائرے میں رہ کر کیا جا رہا ہے، پولیس اہلکار اور افسران میرٹ پر تعینات کئے جا رہے ہیں جن کا کام صرف عوام کی مدد اور حفاظت کرنا ہے۔ لہذا پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں، امجد آجائے گا۔“

اسلم کا خیال بالکل درست ثابت ہوتا ہے کیونکہ چند دن بعد امجد واقعی گھر واپس آ جاتا ہے لیکن اس کے گھر والے اسے گھر لانے کی بجائے ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کروا دیتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ان مثالوں کے ذریعے ہم نے ایک مثالی شہری کا مختصر سا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثالی شہری کی چند خصوصیات اور بھی ہیں، مثلاً اسے جلسے جلوسوں، ہڑتالوں اور گھیراؤ جلاؤ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ کسی قسم کے احتجاج میں حصہ نہیں لیتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اخبارات کی بجائے ہمیشہ ”سرکاری پینڈ آؤٹ“ پر یقین کرتا ہے۔ اسی طرح مثالی شہری نجی چینلز کی نشریات، خصوصاً کسی بڑے واقعے کی براہ راست کوریج دیکھنے سے اجتناب کرتا ہے اور ایسے موقعوں پر ہمیشہ سرکاری ٹی وی پر پٹھانے خان کا صوفیانہ کلام دیکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔

ایک مثالی شہری مہنگائی کی بھی بالکل پرواہ نہیں کرتا بلکہ اس کے ذہن میں ہر وقت سرکاری اعداد و شمار گردش کرتے رہتے ہیں۔ جس سے اسے یہ پتا چلتا رہتا ہے کہ وطن عزیز میں مہنگائی خطے کے دیگر ممالک کی نسبت سب سے کم ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک مثالی شہری کی نظر ہر وقت ”جی ڈی پی گروتھ ریٹ، فارن ایکسچینج ریٹ روز اور ٹیکس ریفارمز“ جیسے اعشاریوں

بات یہ کہ تین دن سے بجلی لوڈ منیجمنٹ کی وجہ سے نہیں بلکہ مرمتی کام کی وجہ سے بند ہے جس کا شیڈول گزشتہ ہفتے اخبار کے صفحہ 7 پر تفصیلاً دیا گیا تھا اور تیسری بات یہ کہ بجلی آئندہ تین روز بھی اسی شیڈول کے تحت آٹھ گھنٹے کے لئے مرمتی کام کی وجہ سے بند رہے گی، مزید نوٹ فرما لیں۔ شکریہ!“

اسلم چونکہ ایک مثالی شہری ہے اس لئے وہ یہ تمام باتیں نہ صرف نوٹ کر لیتا ہے بلکہ اپنے تمام گھر والوں کو بھی سمجھاتا ہے کہ آئندہ لوڈ شیڈنگ کی بجائے ”لوڈ منیجمنٹ“ کا لفظ استعمال کیا جائے اور بجلی کی بندش پر احتجاج کی بجائے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا جائے کہ واپڈا کے اہلکار کھیموں اور لائنوں کی مرمت میں مصروف ہیں جس سے اہل محلہ ہی کو فائدہ ہو گا۔

دوسری مثال میں فرض کریں کہ علاقے کے تھانیدار نے اسلم کے بھائی کو گرفتار کر لیا ہے اور بغیر کسی پرچے کے تھانے میں بند کر دیا ہے جہاں اس کی ”تواضع“ کی جارہی ہے اور مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ گزشتہ ہفتے اپنے محلے میں ہونے والی ڈکیتی کا اعتراف کر لے۔ اسلم بطور ”مثالی شہری“ بھائی کی بازیابی کے لئے متعلقہ ایس پی کو درخواست دیتا ہے جو کچھ اس قسم کی ہے:

محترم ایس پی صاحب، سلام مسنون!

امید آپ خیریت سے ہوں گے۔ عرض یہ ہے کہ گزشتہ روز میرے علاقے کے تھانے دار صاحب گھر تشریف لائے اور میرے بھائی امجد کی بابت دریافت کیا۔ امجد کی زوجہ، جو کہ ایک پردہ دار خاتون ہیں، نے تھانے دار صاحب کو بتایا کہ امجد گھر پر موجود نہیں تاہم تھانے دار صاحب نے اپنی ”بھابھی“ کی بات کو مذاق جانا اور گھر میں داخل ہو کر خود پورا گھر گھوم کر دیکھا اور امجد کو موجود نہ پا کر مطمئن ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تھانے دار صاحب نے گھر میں موجود خواتین سے نہایت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ”گپ شپ“ کی اور ساتھ ہی تاکید بھی کر دی کہ شام کو جو نہی امجد گھر، آئے اسے فوراً تھانے بھیج دیا جائے۔ تھانے دار صاحب کی ہدایت کے عین مطابق امجد کو گھر آتے ہی تھانے بھیج دیا گیا لیکن تا حال امجد کی تھانے سے واپسی نہیں ہوئی۔ تھانے دار صاحب کی ”بھابھی“ (امجد کی زوجہ) کے پر زور اصرار پر میں یہ درخواست آپ کو بھیج رہا ہوں تاکہ آپ خود اس معاملے کو



## سکس ملین ڈالر مین

آج سے تقریباً تین برس قبل ٹی وی پر ایک انگریزی فلم سیریز دکھائی جاتی تھی جس کا نام ”سکس ملین ڈالر مین“ تھا۔ اس فلم کا مرکزی کردار کرنل سٹیو تھا جو بطور ”سکس ملین ڈالر مین“ فلم کا ہیرو تھا۔ سٹیو، بنیادی طور پر ایک خلاء باز تھا جسے ایک حادثے کے نتیجے میں تقریباً مردہ قرار دے دیا جاتا ہے لیکن پھر امریکی سائنسدان اسے اپنی ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر ایک ”بائیونک“ آدمی بنا دیتے ہیں۔ یعنی ایک ایسا شخص جو غیر معمولی قوت کا حامل ہوتا ہے، جس کی نظر بہت دور تک یا باسانی چیزوں کو دیکھ سکتی ہے اور جو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ ان سائنسدانوں نے اس بائیونک شخص میں یقیناً کچھ مردانہ خصوصیات بھی پیدا کی ہوگی تاہم فلم ان خصوصیات کا احاطہ کرتی ہوئی نظر نہیں آتی! فلم کی ہر قسط میں سکس ملین ڈالر مین مختلف محیر العقول کارنامے سرانجام دیتا ہے، کبھی وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے بل بوتے پر لوگوں کو قدرتی آفات سے بچاتا ہے اور کبھی ملک دشمن عناصر کا قلع قمع کرتا ہے۔

پچھلے دنوں اس فلم کی ایک سی ڈی میرے ہاتھ لگ گئی اور میں نے ایک ہی نشست میں اس کی کئی قسطیں دیکھ ڈالیں۔ جونہی سی ڈی ختم ہوئی میں نے فیصلہ کیا کہ جو بھی پہلا شخص میرے سامنے آئے گا اسے میں یہ فلم سیریز دیکھنے کا مشورہ ضرور دوں گا۔ اس جذباتی فیصلے کے فوراً بعد جس شخص سے میری ملاقات ہوئی وہ ”راجو بلیکی“ تھا۔ راجو بلیکی نے آج کل فلموں کی ٹکٹوں کی بلیک کا کام چھوڑ کر سی ڈی فروخت کرنے کا کام شروع کیا ہوا ہے۔ جب میں نے راجو کو سکس ملین ڈالر مین کے بارے میں بتایا تو اس نے حیران ہونے کی بجائے

پر ہوتی ہے جو اسے معیشت کی باریکیاں سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس طرح مثالی شہری ہر پندرہ دن کے بعد پٹرول کی قیمت بڑھنے سے بھی نہیں گھبراتا بلکہ اسے وہ محض ایک ”معمول کار و بدل“ سمجھتا ہے جس کی اس کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں۔

مختصراً یہ کہ ایک مثالی شہری سرکاری اعلانات اور دعوؤں کی زندہ تصویر ہوتا ہے اور وہ کسی بھی قسم کے پروپیگنڈے کے زیر اثر بدگمانی یا بد اعتمادی کو دل میں جگہ نہیں دیتا۔ ابھی اس کالم کی کچھ سطریں لکھنی باقی تھیں کہ اچانک بجلی چلی گئی۔ گو کہ یہ بجلی کسی ”لوڈ مینجمنٹ“ کے شیڈول کے بغیر گئی تھی تاہم ایک ”مثالی شہری“ ہونے کے ناطے میں نے یہ فرض سمجھا کہ اس پر کسی قسم کی برہمی یا احتجاج کا اظہار کیے بغیر بالکل مطمئن اور مسرور ہو کر سو جاؤں کیونکہ مجھے پتا ہے کہ ایک دن اس ملک میں ڈیم بنیں گے جس سے بجلی کا بحران ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اس لیے کسی قسم کی بدگمانی کو دل میں جگہ دیے بغیر میں یہ خوش کن تصور ذہن میں لا کر سونے لگا ہوں کہ اسلم کی طرح میں بھی ایک ”مثالی شہری“ ہوں جو ہر دعوے اور اعلان کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے!!!

(21 مئی 2007ء)

”بہلی میں نے سکس ملین ڈالر مین کی بات کی ہے کسی پارلیمنٹ خاتون کے عاشق، سابق ایم این اے اور سابق سفیر کی نہیں!!!“

”بس تو پھر آپ کے یہ ڈالر مین میرے کسی کام کے نہیں، اس سے اچھے تو ”خان صاحب“ ہیں جو سرکاری مال کھاتے وقت میرا اتنا خیال رکھتے ہیں جتنا اپنا رکھتے ہیں۔“

میں نے دل ہی دل میں خاں صاحب کو بطور سکس ملین ڈالر مین visualize کیا اور پھر لا حول پڑھ کر فون بند کر دیا۔ اب میرا صبر کا پیمانہ کچھ کچھ لبریز ہونے لگا تھا۔ مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس فلم سیریز کے متعلق میرے جیسے خیالات رکھتا ہو لیکن تا حال مجھے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے ایک سینئر افسر کا نمبر ڈائل کیا۔

پروڈوکل سے لبریز رسمی گفتگو کے بعد میں نے ان سے اس فلم سیریز کا ذکر کیا تو انہیں فوراً یاد آ گیا کہ یہ سیریز ان کی سروس کے شروع کے سالوں میں ٹی وی پر دکھائی جاتی تھی اور نہایت مقبول تھی۔

”لیکن تمہیں اچانک اس سکس ملین ڈالر مین کا خیال کیسے آ گیا؟ صاحب نے پوچھا۔“

”بس سر! میں نے تو یہ سیریز حال ہی میں سی ڈی پر دیکھی ہے اور دیکھنے کے بعد سوچ رہا ہوں کہ کاش ہمارے ہاں بھی کوئی سکس ملین ڈالر مین میجا بن کر آجائے۔“

”دیکھو نوجوان! پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی میجا نہیں آیا کرتا اور دوسری بات یہ کہ ہم خود کیا کسی سکس ملین ڈالر مین سے کم ہیں؟“

”کیا مطلب سر؟“ میرا ماتھا ٹھکا کیونکہ مجھے یہ بات بھی کچھ کچھ ویسی لگی تھی جیسی راجو بلیکی نے کی تھی۔

”مطلب یہ کہ ہم لوگ جو سروس میں آتے ہیں، سب سے بہترین ہیں۔ انگریزی میں کہا جائے گا کہ We are the choosen one and we are the best۔“

جتنی طاقت ہمارے پاس ہے، اتنی کسی کے پاس نہیں۔ تمہارا ملین ڈالر مین بھی وہ کام نہیں کر سکتا جو ہم لوگ کر سکتے ہیں، سمجھ مائی ڈیر!“

”سمجھ گیا سر.....“ میں نے ایک اچھے سامع کی طرح ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جواب دیا۔

فون بند کرنے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا کہ امریکی سائنسدان اتنی مشکلوں سے ایک بائیونک شخص بنانے میں کامیاب ہوئے اور وہ بھی ایک فلم کی حد تک۔ جبکہ ہمارے

ہنسنا شروع کر دیا، میں نے وجہ پوچھی تو بولا:

”سر جی! آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں، اس طرح کے ڈالر مین تو یہاں بھرے پڑے ہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو راجو؟ میں نے یہاں اس طرح کا تو ایک بھی شخص نہیں دیکھا!“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”سر جی! ہمارے علاقے کے کونسلر ”پرنس جورا“ کو تو آپ جانتے ہی ہیں، دنیا کا کونسا کام ہے جو وہ نہیں کروا سکتا؟ کیا وہ آپ کے سکس ملین ڈالر مین سے کم ہے؟؟؟“

”مثلاً..... وہ کیا کام کر سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کچھ بھی کر سکتا ہے سر جی! مثلاً وہ پلاٹوں پر قبضہ کر سکتا ہے، ان کے جعلی کاغذات تیار کروا سکتا ہے۔ کیا آپ کا امریکی ڈالر مین یہ کر سکتا ہے؟“

”یقیناً نہیں!!! لیکن تم اس کے علاوہ کوئی اور مثال دو۔“

”دوسری مثال اپنے سلیم بھائی کی ہے، وہ جب چاہیں پورا شہر بند کروادیں۔ کیا آپ کا سکس ملین ڈالر مین یہ کر سکتا ہے؟“

”نہیں..... وہ یہ کام نہیں کر سکتا لیکن راجو تم غلط سوچ رہے ہو، یہ سب عام لوگوں کی مثالیں ہیں جبکہ میں تمہیں ایک ایسے مافوق الفطرت انسان.....“

”سر جی! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، کیا یہ عام لوگ ہیں؟ یہ لوگ تو بہت خاص ہیں بلکہ یہ لوگ ہمارے ملک کے کرتا دھرتا ہے؟“

اس مرحلے پر آ کر میں نے راجو کے ساتھ مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا (اور شاید راجو نے بھی) اس لئے یہ فلمی تبصرہ یہیں ختم ہو گیا۔ چونکہ فلم کے متعلق گفتگو کی تشنگی برقرار تھی اس لئے میں ”بہلی“ کو فون ملایا اور اسے فوری طور پر یہ فلم سیریز دیکھنے کا مشورہ دیا۔ پوری بات سننے کے بعد بہلی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

”یہ..... جو سکس (sex) ملین ڈالر مین صاحب ہیں یہ.....“

”جہی میں نے سیکس ملین نہیں بلکہ سکس ملین ڈالر مین کہا ہے۔“ میں نے تملاکر کہا۔

”اوہ..... اچھا“ بہلی نے مایوسی سے کہا..... ”خیر تمہارے سکس ملین ڈالر مین صاحب اگر مجھے ڈیفیس میں ایک کوٹھی، ایک پراڈو اور دو لاکھ روپے مہینہ دے دیں تو میں انہیں مانوں کہ واقعی وہ کوئی توپ چیز ہے۔“

## نخرے نوکری کے

کنفیوشس نے کہا تھا ”آپ زندگی میں وہ کام کریں جس کا آپ کو شوق ہے پھر آپ کو ساری عمر کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا“۔ کنفیوشس کا یہ قول جب بھی میرے ذہن میں آتا ہے، دماغ کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں جہاں دوسرے بہت سے اچھے کام نہیں ہو رہے وہاں یہ بھی نہیں ہو رہا کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق اپنے کیریئر کا انتخاب کر لے۔ جسے کاروبار کرنا چاہیے، وہ سرکاری ملازم بن گیا ہے، جسے قضائی بننا چاہیے، وہ ڈاکٹر بنا ہوا ہے، جسے ڈاکٹر بننا چاہیے، وہ پروفیسری کر رہا ہے، جسے پروفیسر بننا تھا، اس کا دل اداکاری میں اٹکا ہوا ہے، جو اداکار بننا چاہتا تھا، وہ موچی بن گیا ہے اور جسے موچی بننا چاہیے وہ پولیس میں بھرتی ہو گیا ہے اور جو بے چارہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، وہ پرائمری سکول کا ٹیچر بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر دوسرا آدمی اپنے کام اور نوکری سے بیزار ہے۔

تاہم ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو پسند نہ پسند کے چکر میں نہیں پڑتا بلکہ اس کا مسئلہ صرف ٹھاٹھ باٹھ ہے چنانچہ اگر آپ ایسے لوگوں سے پوچھیں کہ وہ کس قسم کی جاب کرنا پسند کریں گے تو ان میں سے زیادہ تر کا جواب کچھ اس قسم کا ہوگا ”تنخواہ کم از کم ایک لاکھ، تیرہ سو سی سی کی گاڑی بمبے پانچ سو لیٹر پیٹرول اور باوردی ڈرائیور، کسی کو جواب دہی نہ کرنی پڑے یعنی انڈینڈنٹ آفس، اوقات کار صبح آٹھ سے تین بجے تک تاہم باس (یعنی خود) کے لیے دس تا ایک بجے، جمعہ کو ہاف ڈے اور ہفتہ کو اتوار سمیت چھٹی“۔

لیجئے ہوگئی چھٹی.....! ظاہر ہے کہ وطن عزیز میں دیگر نعمتوں کی طرح ایسی ملازمتوں

یہاں ایسے ”ملین ڈالرمینوں“ کا انبار لگا ہوا ہے اور ہم بے خبر ہیں۔ ہمارے یہاں کے ”ملین ڈالرمین“ کچھ ایسے کام بھی کر سکتے ہیں جو امریکیوں کے تصور میں بھی نہیں آ سکتے۔ مثلاً ہمارے ”ملین ڈالرمین“ بھتہ اکٹھا کر سکتے ہیں، لڑکیاں اٹھا سکتے ہیں، سرکاری خزانے لوٹ سکتے ہیں، پلاٹوں پر قبضے کر سکتے ہیں اور ”ڈنڈے کے زور پر“ اسلام بلکہ اسلام آباد کو ریغمال بنا سکتے ہیں!!! لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ لوگ ملین ڈالر تو دور کی بات، کوڑیوں کے بھاؤ بکنے والے بھی نہیں۔ ان کے برعکس اصل سکس ملین ڈالرمین وہ ہے جو ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات اور نا انصافی کے خلاف جہاد کرے۔ ہمیں ایسا سکس ملین ڈالرمین نہیں چاہیے جو ”سکس ملین ڈالروں“ کے عوض سکس ملین لوگ مروادے!!!

(4 جون 2007ء)

ہوتے ہیں لیکن اگر آپ ان لوگوں سے بھی گفتگو کر کے دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ لوگ اتنی بھی چھوٹی نوکری کے خواہشمند نہیں ہوتے، مثلاً:

”صاحب جی! بڑے لڑکے نے پڑھائی مکمل کر لی ہے، اسے کوئی چھوٹی موٹی نوکری دلادیں تاکہ گھر کے خرچ کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔“

”اچھا! یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تمہارے لڑکے نے ایم۔اے۔ کر لیا ہے، کس مضمون میں ایم۔اے۔ کیا ہے؟“

”ایم۔اے۔ تو نہیں کیا صاحب جی، ایف۔اے۔ کے امتحان دیئے ہیں، آپ کی دعا سے ضرور پاس ہو جائے گا۔“

”بھئی اس قابلیت پر تو چوکیدار، نائب قاصد اور ڈرائیور کی نوکری ہی مل سکتی ہے اور وہ بھی آج کل اتنا آسان نہیں ہے۔“

”صاحب جی! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، کیا میں نے اپنے بیٹے کو چوکیدار بھرتی کراؤں گا؟ ماشاء اللہ آپ کو اللہ نے اتنی اچھی سیٹ دی ہوئی ہے، کم از کم کوئی اچھی نوکری تو ہو جس سے میرا بیٹے کی سسرال میں ”ٹہور“ بن جائے۔“

اب ظاہر ہے کہ ان بزرگوار کے بیٹے کی سسرال میں ”ٹہور“ بنوانے کے لیے آپ کو اپنی ہی کرسی چھوڑنی پڑے گی۔ یہاں ایک لطف کی بات یہ ہے کہ اگر آپ نے کسی سے سفارش کر کے ایسے کسی شخص کو بھرتی کروا بھی دیا تو چند ماہ کے بعد وہ بزرگوار دوبارہ وارد ہوں گے اور اس دفعہ ان کا مدعا اپنے برخوردار کی نوکری بچانے سے متعلق ہوگا:

”صاحب جی! وہ اپنا لڑکا جہاں بھرتی ہوا تھا، محکمے والوں نے اسے وجہ بتائے بغیر ہی فارغ کر دیا ہے۔“

”کیا؟؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کسی وجہ کے بغیر فارغ نہیں کیا جاسکتا، یقیناً کوئی وجہ ہوگی!“

”کوئی خاص وجہ نہیں صاحب جی، حافظ آباد میں اس کے سالے کی بڑی لڑکی کی شادی تھی، اس نے بیس دن کی چھٹی مانگی جو نہیں ملی، پھر بیچارہ مجبوراً پندرہ دن کے لئے بیوی بچوں کو لے کر شادی میں شرکت کرنے چلا گیا، واپس آیا تو ظالموں نے ہاتھ میں نوکری سے فارغ کرنے کا پرچہ پکڑا دیا۔“

”کیا وہ ان پندرہ دن کی چھٹی لے کر گیا تھا؟“

کی بھی کمی نہیں لیکن ساتھ ہی اس قسم کی ملازمتوں کے چاہنے والوں کی بھی کچھ کمی نہیں تاہم اگر ان چاہنے والوں سے ان کی قابلیت پوچھی جائے تو جواب میں فقط بی۔اے۔ کا لفظ سنائی دے گا اور وہ بھی بغیر انگریزی کے! ایسے ہی کسی چاہنے والے سے میں نے ازراہ مذاق کہا کہ ایسی ایک ملازمت میری نظر میں ہے جہاں اس ناچیز کی سفارش پر اسے لگایا جاسکتا ہے اس لئے وہ فوری طور پر انگریزی میں درخواست ٹائپ کروا کے مجھے بھجوا دے۔ جواباً دو دن کے بعد موصوف کی ایک ایس۔ایم۔ ایس۔ موصول ہوئی جس میں یہ کہنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث درخواست نہیں بھجوا سکتے لہذا میں اپنی طرف سے درخواست ٹائپ کروا کے دستخط کے لیے انہیں بھیج دوں۔ ایس۔ایم۔ ایس۔ کا اصل متن کچھ یوں تھا:

"Rite later wanting da job 4 me very bizi 2 day 2 tomorrow thkx"

ظاہر ہے کہ ایسی شستہ انگریزی میں بھیجی گئی ایس۔ایم۔ ایس۔ کو سمجھنے میں مجھے خاص دقت پیش آئی۔ موصوف اب جب بھی مجھے ملتے ہیں تو گلہ ضرور کرتے ہیں کہ میں انہیں اتنی اچھی نوکری ”ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی“ نہ دلوا سکا اور میں جواباً شرمندگی سے سر جھکا لیتا ہوں اور مجھے وہ سردار جی یاد آجاتے ہیں جو میٹرک کرنے کے بعد ایک انیر لائن کے دفتر میں ”جنرل منیجر“ کی آسامی کے لیے انٹرویو دینے کے لئے پہنچ گئے تھے۔ انٹرویو لینے والے نے جب سردار جی کی ”قابلیت“ معلوم کی تو اس نے معنی خیز الفاظ میں سوال کیا کہ ”سردار جی! کیا ڈیڑھ لاکھ تنخواہ کافی ہوگی؟“ سردار جی نے چمکتی آنکھوں سے فوراً ہاں میں سر ہلادیا۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا کہ ”یقیناً آپ ساتھ میں ایک بڑی گاڑی اور ایک لکڑی فلیٹ لینا بھی پسند کریں گے؟“ جواباً سردار جی نے بے یقینی کے عالم میں ایک دفعہ پھر سر ہلادیا۔ اس پر انٹرویو لینے والے نے غور سے سردار جی کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا ”یقیناً خوبصورت بیوی فراہم کرنا بھی ہماری انیر لائن کی ذمہ داری ہوگی؟“ سردار جی فوراً چونکے اور پوچھا ”آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے؟“ جواب ملا ”مذاق کا یہ سلسلہ آپ ہی نے تو شروع کیا ہے!!!“

ان بڑی نوکریوں کے علاوہ کچھ عام لوگ بیچارے چھوٹی موٹی نوکریوں کے متنی بھی

## ایک ”جینس“ کا بجٹ

مجھے کافی دنوں سے ایک جینس کی تلاش تھی اور بالآخر آج مجھے وہ جینس مل ہی گیا۔ اس کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسا کہ عموماً جینس لوگوں کا ہوا کرتا ہے یعنی پیشانی پر بکھرے بال جن میں سفیدی نمایاں تھی، سفید قمیض کے ساتھ ٹائی جس کی ناٹ بٹن سے نیچے جھول رہی تھی۔ چہرے پر بڑے فریم کی عینک، نیلی جینز اور پیر میں سینڈل!!! میری اس سے ملاقات ایک کافی ہاؤس میں ہوئی جہاں وہ ایک گھنٹے سے بیٹھا خود سے باتیں کئے جا رہا تھا اور ساتھ ہی ایک پنسل سے کاغذ پر کچھ نوٹ بھی کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ چونک کر خلاء میں گھورنے لگ جاتا اور پھر یکا یک ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے رکھی ہوئی کافی کا گھونٹ بھر لیتا جو شاید اس وقت تک ٹھنڈی برف ہو چکی تھی۔ میں کافی دیر تک اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس وقت میری دلچسپی نقطہ عروج پر پہنچ گئی جب موصوف نے یکا یک ایک بلند آواز قہقہہ لگایا اور اپنا ہاتھ اس طرح میز پر مارا گویا ان کے سامنے کوئی اور بھی بیٹھا ہو۔ اس مرحلے پر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس گیا اور اجازت لے کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے نہایت خوش دلی سے میری طرف دیکھا اور پھر دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ میں نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ اپنے ہی خیال میں مگن رہا اور پھر تھوڑی دیر بعد چونک کر میری طرف دیکھ کر بولا ”میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟“ میں نے مسکرا کر جواب دیا ”جی! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں آپ سے اجازت لے کر یہاں بیٹھا ہوں، اس سے پہلے میں سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔“ یہ سن کر اس نے مطمئن ہو جانے والے انداز میں سر

”نہیں صاحب جی! چھٹی تو ظالموں نے دی ہی نہیں لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ بندہ کسی کے ”جین مرن“ میں بھی نہ جائے۔ آپ مہربانی کر کے ذرا ان کے بڑے صاحب کو فون ”کھڑکائیں“ کہ وہ فوری طور پر اسے نوکری پر واپس لے لے۔“

یہاں آپ لاکھ ان بزرگوار کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ جن کی وہ بات کر رہے ہیں وہ بڑے صاحب کوئی ”سالا صاحب“ نہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ احوال تو ان لوگوں کا تھا جو من پسند نوکریاں لینے کے خواہشمند ہوتے ہیں تاہم یہاں ایک بات واضح رہے کہ ضروری نہیں کہ من پسند نوکری کرنے والے اپنے کام سے بھی محبت کریں۔ جیسا کہ کنفیوشس نے کہا تھا کہ اپنے کام سے محبت نہ کرنے والوں کے پاس کام نہ کرنے کے بہترے بہانے ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ باس اچھا نہیں ہے (یعنی وہ کام بہت لیتا ہے) یا پھر یہ کہ کام کرنے کا ماحول ٹھیک نہیں ہے (یعنی دفتر میں سارے کے سارے صورت حرام مرد بھرے ہوئے ہیں) اس قسم کے تمام لوگوں کے لیے میرا ایک ہی مشورہ ہے جو میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ”اگر آپ ایک گھنٹے کی خوشی چاہتے ہیں تو اپنی نیند پوری کر لیں، اگر پورے دن کی خوشی چاہتے ہیں تو پکنک پر چلے جائیں، اگر ایک ہفتے کی خوشی چاہتے ہیں تو چھٹی لے کر تفریحی مقام پر چلے جائیں، اگر ایک ماہ کی خوشی چاہتے ہیں تو شادی کر لیں، اگر ایک سال کی خوشی چاہتے ہیں تو وراثت میں دولت حاصل کر لیں اور اگر ساری عمر کی خوشی چاہتے ہیں تو اس کام سے محبت کرنا سیکھیں جو آپ کرتے ہیں!!“

(11 جون 2007ء)



”اصل میں بات یہ ہے کہ یہ گن مین میں نے اس وقت سے ہی رکھے ہوئے ہیں لیکن اب مجھ میں انہیں نوکری سے فارغ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“

اس جواب پر میں نے گھور کر اس ”جیننس“ کی طرف دیکھا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ”دس ہزار روپے میں نے اپنے کریڈٹ کارڈ کی قسط ادا کرنی ہوتی ہے جبکہ باقی کے دس ہزار سے میں نے بچوں کے تعلیمی اخراجات، گھر کا کرایہ، بجلی اور ٹیلی فون وغیرہ کا بل، ڈاکٹر اور ہسپتال کا خرچہ، کچن کے اخراجات اور.....“

”لیکن یہ سب کچھ تو دس ہزار میں پورا نہیں ہو سکتا؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ابھی میری پوری بات ہی کہاں سنی ہے؟ ابھی تو میں نے تمہیں باقی کے خرچے بھی سنانے ہیں جیسے میرے عملے یعنی ڈرائیور، خانساں، مالی، نائی، پلبر اور الیکٹریشن وغیرہ کی تنخواہیں جو کل ملا کر تقریباً بائیس ہزار بنتی ہے اور جن اخراجات کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے وہ بھی تقریباً بیس ہزار کے قریب ہی بنتے ہیں۔ اس طرح ٹوٹل بیالیس ہزار روپے بنے جبکہ میرے پاس صرف دس ہزار بچے تھے جس کا مطلب ہے کہ میرے بجٹ کا خسارہ بیس ہزار روپے ہو گیا جو میری کل آمدنی کا صرف پانچ فیصد ہے۔“ اس نے فخریہ لہجے میں یہ ساری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

اب میں کچھ کچھ زچ ہونے لگا تھا کیونکہ مجھے یہ شخص ”جیننس“ نہیں بلکہ پاگل لگنے لگا تھا تاہم میں نے اپنی اندرونی کیفیت اس پر عیاں نہ ہونے دی اور پوچھا ”آپ کی باتوں سے تو لگتا ہے کہ آپ کے پاس گاڑی بھی ہے تو کیا اس کی مینینے کی قسط کا خرچہ نہیں ہوتا؟“

”بالکل ہوتا ہے لیکن فی الحال اس کی قسطیں بینک والوں نے کچھ سالوں کے لئے ساقط کر دی ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”بھئی میں نے تمہیں اپنے انکل کے بارے میں بتایا تو ہے، وہ کافی اثر و رسوخ کے مالک ہیں، وہ چاہیں تو بینک والوں کو کہہ کر یہ قسطیں معاف بھی کروا سکتے ہیں لیکن فی الحال انہوں نے اتنی ہی کرم فرمائی کی ہے کہ یہ قسطیں پانچ سال کے لئے defer کروادی ہیں۔“

”لیکن آخر پانچ سال بعد بھی تو یہ پیسے جمع کروانے ہوں گے، تب یہ پیسے کہاں سے آئیں گے؟“

ہلایا اور ایک مرتبہ پھر کاغذ پر کچھ نوٹ کرنے لگا، اس مرتبہ مجھ سے رہا نہ گیا: ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اوہ..... یہ..... کچھ نہیں..... بس ذرا بجٹ بنا رہا ہوں۔“

”بجٹ..... کیسا بجٹ؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”بھئی اپنے گھر کا بجٹ..... اور کیسا بجٹ؟“

”اوہ..... اچھا اچھا“ میری دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ ”کیا میں آپ سے کچھ سوال کر سکتا ہوں؟“

”ہاں ہاں بالکل کر سکتے ہو۔“

”آپ کی ماہانہ آمدنی کتنی ہے؟“

”میری ماہانہ آمدنی کل ملا کر تقریباً پچیس ہزار روپے ہے، اس کے علاوہ پانچ سات ہزار اوپر سے بھی ہو جاتے ہیں۔“

”اوپر سے کیا مطلب؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا کیونکہ مجھے اس ”جیننس“ سے اس قدر صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔

”مطلب یہ کہ میرے ایک دور کے انکل ہیں جو ہر ماہ امریکہ سے میرے لئے کچھ پیسے بھجوا دیتے ہیں۔ میں اسے اوپر کی آمدنی کہتا ہوں کیونکہ ان پیسوں کے عوض کبھی کبھی مجھے ان کے کچھ کام کرنے پڑتے ہیں جو میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔“ موصوف نے مزید صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اوکے! اچھا یہ بتائیے کہ آپ نے ابھی تک اپنی اس پچیس ہزار بلکہ تیس ہزار والی آمدنی کا کیا بجٹ بنایا ہے؟“

”بجٹ تو میں نے تقریباً بنا ہی ڈالا ہے۔ سب سے پہلے تو میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پانچ پانچ ہزار ماہوار پر دو عدد گن مین رکھوں گا تاکہ کوئی میرے یا میرے گھر والوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے۔“

”کیوں؟ کی آپ کو کسی سے جان کا خطرہ ہے؟“

”نہیں، اب تو کچھ خاص نہیں تاہم چند سال پہلے تک اپنے ایک ہمسائے سے میرا جھگڑا ضرور رہتا تھا لیکن اب اس سے بھی ”مفاہمت“ ہو گئی ہے۔“

”تو پھر ان گن مینوں کی اب کیا ضرورت ہے؟“

## جنت اور جہنم

جہاز نے بوسٹن ائر پورٹ پر لینڈنگ کے لئے اپنے پیسے کھولے تو میں نے اپنی نظریں کھڑکی سے نیچے جما دیں۔ بوسٹن شہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ سمندر کے کھلے پانی میں جا بجا کشتیاں تیر رہی تھیں جن پر لگی لائٹوں نے پانی میں عجیب سا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ نیلے شفاف سمندر کے کنارے بلند و بالا عمارات روشنیوں سے چکا چوند تھیں۔ میری نظریں ابھی سمندر پر ہی تھیں کہ چانک جہاز لینڈ کر گیا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ کب سمندر کا کنارہ ختم ہوا اور رن وے شروع ہو گیا۔ ایسا دلکش نظارہ میں نے اس سے پہلے کم ہی دیکھا تھا۔ بوسٹن کے لوگان انٹرنیشنل ائر پورٹ سے باہر نکلتے نکلتے مجھے تقریباً دو گھنٹے لگ گئے اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ امریکی میری شخصیت سے متاثر ہو گئے تھے۔ شاید اسی لئے انہوں نے میرے سامان میں موجود تمام اشیاء کو نہایت محبت سے دیکھا بلکہ انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے دستانے چڑھائے کہ کہیں میری چیزوں کی ”بے حرمتی“ نہ ہو جائے۔ میرے بٹوے میں موجود چھوٹی چھوٹی پرچیاں (جن پر میں نے مختلف چیزیں یادداشت کے لئے نوٹ کی ہوئی تھیں) بھی نکال کر ایک طرف علیحدہ کر دیں تاکہ بعد میں تسلی سے ان کا دیدار کیا جاسکے۔ جب انہوں نے میرے تمام سوٹ کیسوں سے اپنی عقیدت کا اظہار مکمل کر لیا تو پھر فرط جذبات سے مغلوب ہو کر مجھے الوداع کہا اور ساتھ میں معافی بھی مانگی کہ ان کی وجہ سے میرا قیمتی وقت برباد ہوا۔ ظاہر ہے کہ میں نے ان بیچاروں کو معاف کر دیا!

بوسٹن سے آگے میری منزل پلے مٹھ (Plymouth) تھی جو نیو ہیمپشائر

”اللہ مالک ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا اور پھر ایک سگریٹ سلگا کر اس کے دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرنے لگا۔ اس کی بے فکری دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے کہا ”کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنے بجٹ میں کچھ غیر ضروری اخراجات رکھے ہیں جو کہ آپ کی آمدنی سے مطابقت نہیں رکھتے؟ اور اس کے علاوہ آپ نے کچھ غیر ضروری قرضے بھی لے رکھے ہیں جن کا سود آپ کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ کھا جاتا ہے۔“

”میرے عزیز! یہی تو تمہارا بچپنا ہے۔ آج سے چند سال پہلے تک میری آمدنی محض پانچ ہزار روپیہ مہینہ تھی جو بڑھ کر اب تیس ہزار ہو چکی ہے۔ آج میرے پاس گاڑی ہے، موبائل ہے، لیپ ٹاپ ہے، ملازموں کی فوج ہے اور کیا چاہئے؟ اور جہاں تک سود کی ادائیگی کا تعلق ہے تو میرے عزیز اسے سود نہیں بلکہ Debt Servicing کہتے ہیں۔ ویسے تم نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے لہذا اب تم جاؤ، مجھے ابھی تقریر بھی لکھنی ہے۔“

”اور یہ تقریر آپ نے کہاں کرنی ہے؟“ میں نے اٹھتے ہوئے آخری سوال پوچھا۔

”جیل روڈ پر واقع دماغی امراض کے ایک ہسپتال میں!!!“ اس ”جینس“ نے جواب دیا۔

(16 جون 2008ء)

لئے میں خاموش ہو گیا۔

ان باتوں سے قطع نظر، امریکی نہایت زندہ دل لوگ ہیں۔ راہ چلتے آپ کو دیکھ کر ہیلو کہیں گے اور ہاتھ ہلائیں گے۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ کریں گے، بات بات پر آپ کا شکریہ ادا کریں گے اور ان سے کوئی غلطی ہو جائے یا ان کا کندھا آپ سے ٹکرا جائے تو معافی مانگ مانگ کر آسمان سر پر اٹھالیں گے۔ ہمارے یہاں اس بات پر معافی مانگنا تو دور کی بات الٹا یار لوگ آپ کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

امریکیوں کی حس مزاح بھی بہت خوب ہے۔ امریکن ائر لائن کی جس پرواز سے میں بوٹنن آیا تھا اس کے کپتان (جو یقیناً امریکی تھا) نے لینڈنگ سے پہلے کچھ اس قسم کا اعلان کیا:

”خواتین و حضرات! تھوڑی دیر میں ہم بوٹنن کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ آج 4 جولائی ہے اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ امریکہ کا قومی دن ہے اس لئے شاید آپ یہاں آتش بازی کے مظاہرے دیکھ سکیں۔ آپ میں سے جو امریکی ہیں وہ یقیناً اس بات پر خوش ہوں گے کہ آج کے روز امریکہ آزاد ہوا تھا اور جو امریکی نہیں ہیں وہ بے شک اس بات پر خوش نہ ہوں۔“

ظاہر ہے کہ اس قسم کا اعلان کوئی امریکی پائلٹ ہی کر سکتا تھا۔ اپنے ہاں کے اعلانات تو آپ کو پتہ ہی ہیں کہ کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔ ”خواتین و حضرات! جہاز کا پائلٹ کیپٹن جنجوعہ آپ سے مخاطب ہے ہم اس وقت گیارہ ہزار میٹر کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے ٹھٹھہ کے اوپر سے گزر رہے ہیں اور انشاء اللہ 15 منٹ بعد کراچی ائرپورٹ پر لینڈ کریں گے، اللہ حافظ۔“

ایک اور بات جو میں نے امریکیوں میں نوٹ کی وہ ان کا تکیہ کلام ہے۔ حیرت انگیز طور پر تمام امریکیوں کا ایک ہی تکیہ کلام ہے اور وہ ہے ”Amm“ ایک اوسط امریکی اپنی روز مرہ گفتگو میں اس Amm کا استعمال کچھ اس طرح کرتا ہے۔

"Amm.. well... I am not sure.. but you well get a bus from the downtown... Amm... but you have to confirm it before you go.. Amm.I... hope you understand".

(New Hampshire) سٹیٹ کا ایک چھوٹا سا ٹاؤن ہے۔ بوٹنن سے پلے متھ تک کا فاصلہ تقریباً اڑھائی گھنٹے کا تھا جو حیرت انگیز طور پر اڑھائی گھنٹے میں ہی طے ہو گیا۔ پہاڑوں میں گھر اپنے متھ ٹاؤن تقریباً اڑھائی ہزار آبادی کا چھوٹا سا شہر ہے جو کچھ کچھ گھوڑا گلی یا انتہی گلی سے ملتا جلتا ہے۔ شہر کی فضا بہت پرسکون اور رومانٹک ہے لیکن یہاں رومان لڑانے کے مواقع تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں، ایک یہ کہ شہر میں کوئی قابل ذکر کلب نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ جو خواتین اس شہر میں دستیاب ہیں وہ یا تو ضرورت سے زیادہ صحت مند ہیں یا پھر عمر رسیدہ بلکہ قبر رسیدہ ہیں۔ پہاڑی علاقے میں کام کرنے کے باوجود ان خواتین بلکہ مردوں کا بھی موٹا ہونا سمجھ سے بالاتر تھا لیکن پھر جلد ہی ان لوگوں کی خوراک دیکھ کر میری حیرت دور ہو گئی۔ جس رغبت سے یہ لوگ کھاتے ہیں، ان پر کشمیری ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ان کے نام خواجہ رابرٹ، پیٹر بٹ اور ریٹامیر وغیرہ ہونے چاہئیں۔

کھانے کے علاوہ امریکی ڈالر سے بھی بہت محبت کرتے ہیں لیکن ڈالر سے ان کی محبت انسانیت سے سنگ دلی کی قیمت پر نہیں ہوتی ( واضح رہے کہ یہ بات امریکی عوام کے لئے ہے اور امریکی سرکار پر لاگو نہیں ہوتی)۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی، کتوں سے بھی بے حد محبت کرتے ہیں۔ یہاں ایک کتے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ ٹی وی چینلز نے اس خبر کو نمایاں کوریج دی اور کتے کے آپریشن کی لمحہ بہ لمحہ خبر دی۔ بہت سے لوگ ہسپتال کے باہر کتے کے آپریشن کے لئے چندہ دینے بھی پہنچ گئے۔ پتہ نہیں وہ کتنا صاحب صحت یاب ہوئے کہ نہیں لیکن اسی روز وطن عزیز کے دارالحکومت سے 21 لوگوں کے جاں بحق ہونے کی خبر آئی جس نے دل ہلا کر رکھ دیا۔

امریکیوں کا جنرل نالج بہت محدود ہے۔ وہ صرف اپنے کریڈٹ کارڈ کی قسط ادا کرنے کی تاریخ یا ڈرائیونگ لائسنس کی expiry date جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک لڑکا جو یہاں writing کے بارے میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے، مشہور امریکی کالم نگار آرٹ بکوالڈ سے نا آشنا تھا۔ اسی طرح میں نے ایک لڑکی سے امریکہ کا انٹرنیشنل ڈاننگ کوڈ پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور کہا کہ وہ امریکہ تو کیا اپنی سٹیٹ سے باہر نہیں گئی تو اسے کیسے امریکہ کا ڈاننگ کوڈ معلوم ہو سکتا ہے؟ بات میں وزن تھا بلکہ کہنا چاہئے کہ لڑکی خود ہی وزنی تھی اس

الڈس ہکسلے نے کہا تھا کہ ممکن ہے یہ دنیا کسی اور کائنات کی جہنم ہو۔ میں اس عظیم دانشور کے قول میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہوں گا اور وہ یوں کہ ”ممکن ہے یہ دنیا کسی اور کائنات کی جہنم بھی ہو اور جنت بھی ہو!“ اور میں اس وقت ایک ایسی ہی جنت میں بیٹھا یہ سطر لکھ رہا ہوں جس کا نام امریکہ ہے تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ اس جنت نے باقی دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے!!!

(16 جولائی 2007ء)

## “Man, this is America”

اس mini ٹرک کا ڈرائیور تقریباً ساڑھے سات فٹ لمبا اور اڑھائی فٹ چوڑا امریکی تھا جو اپنی اس جسامت کے بدولت ٹرک ڈرائیور کم اور باسکٹ بال پلیئر زیادہ لگتا تھا۔ لیکن جب اس نے اپنا مائیک آن کر کے ٹرک کی سواریوں سے گفتگو شروع کی تو پتہ چلا کہ اصل میں موصوف ”مراٹی“ ہیں کیونکہ جس قدر برجستہ اور مزاح سے بھرپور جملے اس نے سواریاں پر چست کئے، وہ اپنے یہاں کا کوئی مراٹی ہی کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت منجھا ہوا گائیڈ بھی تھا کیونکہ جس چھوٹے سے ٹرک میں ہم سوار تھے، اس میں جم (ڈرائیور) نے ہمیں بوٹن شہر کی سیر کروائی اور نہایت خوبصورت انداز میں ہر عمارت کی تاریخ بھی بتائی۔ اس ٹور کا نام ”بوٹن ڈک ٹور“ ہے اور اس کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ بوٹن کی سڑکوں پر سیر کرواتے ہوئے اچانک یہ چھوٹا سا ٹرک پہیوں سمیت ایک بہت بڑے دریا میں اتر جاتا ہے جو شہر کے پیچوں بچ رہا ہے۔ دریا کا نام River Charles ہے اور پھر یہ ٹرک اس دریا میں کسی بلخ کی طرح تقریباً آدھ گھنٹہ تک تیرتا ہے اور پھر کسی بلخ ہی کی طرح باسانی دریا سے سڑک پر چڑھ جاتا ہے۔

ٹور شروع کرنے سے پہلے جم نے ٹرک میں بیٹھی سواریوں سے پوچھا کہ ان کا تعلق کس ملک سے ہے؟ ہم سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا ”پاکستان“۔ اس پر اس نے پوچھا کہ ”کیا تمہارے یہاں باسکٹ بال اسی طرح مقبول ہے جیسے امریکہ میں ہے؟“ اس پر ہم میں سے کچھ نے بغیر سوچے سمجھے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جم نے ہمیں غور سے دیکھا اور بولا

ہے۔ ویسے یہاں ”مداری“ کہنا زیادتی ہوگی کیونکہ اپنے یہاں مداری عموماً بندر کا تماشا دکھاتے ہیں جبکہ یہاں میں نے جس قسم کے کرتب کرتے دیکھے وہ کوئی شریف آدمی نہیں کر سکتا!!! کہنے کی ضرورت تو نہیں لیکن پھر بھی کہتا چلوں کہ حیرت انگیز کمالات دکھانے کے دوران بھی یہ مداری لوگ اپنی جملے بازی سے حاضرین کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی جملہ اخلاق سے گرا ہوا نہیں ہوتا۔

بوسٹن میں بلند و بالا شاپنگ مالز کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں شاپنگ کے دوران میرے ایک کولیگ نے اپنا بل چیک کیا تو اسے پتہ چلا کہ کیش کاؤنٹر والی لڑکی نے غلطی سے کچھ چیزوں کی قیمت زیادہ لگا دی کیونکہ جس جگہ سے میرے کولیگ نے وہ چیزیں اٹھائی تھیں وہاں ”5 Dollar Each“ کا ٹیگ لگا تھا جبکہ اس لڑکی نے ان اشیاء کا بل 8 ڈالر کے حساب سے بنا دیا تھا۔ ہم نے یہ بات اپنے ساتھ کھڑے ہوئے ایک امریکی کو بتائی تو اس نے کہا کہ سٹور والے یہ بل ٹھیک کر دیں گے لیکن ہمیں اس کی بات پر کچھ یقین نہیں آیا کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ اس بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا کہ ہم نے یہ چیزیں ”5 Dollar Each“ والی جگہ سے اٹھائی ہیں۔ وہ امریکی (غیر متوقع طور پر) کچھ سمجھ دار تھا اس لیے ہماری الجھن کو بھانپ گیا اور بولا:

"Man! this is America, what ever you say, they will going to believe you!"

ظاہر ہے کہ اس امریکی نے یہ بات فخریہ لہجے میں کی تھی اور اسے اپنے ملک پر کم از کم اس حوالے سے بجا طور پر فخر تھا۔ ہم دونوں نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور کیش کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔ لڑکی نے اسی وقت میرے کولیگ کی بات سن کر اس کا بل درست کر دیا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سٹور سے باہر نکل آئے۔ شام ہو چکی تھی اور بوسٹن شہر جگمگا اٹھا تھا۔ میں نے اس شہر پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور اپنی بس پر سوار ہو گیا۔ دور کہیں سورج میں ڈوب رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ کاش جو سورج امریکہ میں ڈوبتا ہے، وہی سورج پاکستان میں طلوع ہو تو ہمارے شہر بھی ویسے ہی رنگین ہو جائیں جیسا رنگین بوسٹن شہر ہے لیکن اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارا سورج بھی باقی دنیا سے الگ ہے!!!

(23 جولائی 2007ء)

”جھوٹے کہیں کے!!!“ ایک قہقہہ بلند ہوا اور ساتھ ہی جم نے ٹرک سٹارٹ کر دیا۔ اس ٹرک میں دریائے چارلس کی سیر کرتے ہوئے جم نے ہماری توجہ ایک نہایت پر شکوہ عمارت کی طرف دلائی جو عین دریا کے کنارے واقع تھی۔ اس عمارت کے بارے میں بتاتے ہوئے جم نے کہا کہ ”یہ بوسٹن کے مہنگے ترین علاقے میں واقع ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اگر آپ میں سے کوئی رہنا چاہے تو آپ سے کوئی کرایہ نہیں لیا جائے گا“۔ ہم سب نے حیرت سے اس کی وجہ پوچھی تو موصوف نے نہایت اطمینان سے جواب دیا ”کیونکہ یہ کاؤنٹی جیل ہے!!!“

واپسی پر جم نے ایک ریسٹورنٹ کے قریب بریک لگائی جہاں چند لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ٹرک میں بیٹھے بیٹھے ہی موصوف نے ہانگ لگائی ”ہائے لیری! ٹام یہاں ہے؟ کیا کہا..... نہیں ہے؟ اوکے، کوئی بات نہیں، جب وہ ملے تو اس سے کہنا کہ وہ کافی بنانے کی ترکیب ولیم کو بتادے اور ولیم کو کہنا کہ وہ یہ ترکیب جیری کو بتادے اور پھر جیری ملے تو اسے کہنا کہ یہ ترکیب رابرٹ کو بتادے اور پھر رابرٹ یہ ترکیب مجھے بتادے گا، ہائی ہائی!!!“

”بوسٹن ڈک ٹور“ کے بعد ہماری منزل ہارورڈ سکول تھا۔ بات یہاں تک تو قابل قبول تھی لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ وہاں ہم نے چند لائبریریوں کی سیر بھی کرنی ہے تو مجھے سخت کوفت ہوئی۔ کسی لائبریری کی سیر میرے لیے کبھی بھی دلچسپی کا باعث نہیں رہی۔ میرے خیال میں امریکہ جیسے ملک میں آکر کسی لائبریری کی سیر کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص سینما میں مصالے دار فلم دیکھنے جائے اور ساتھ ہی الجبرا کی موٹی سی کتاب بھی لے جائے!!!

دوپہر کا کھانا ہم نے ”ہارورڈ سکوائر“ میں واقع ایک بھارتی ریسٹوران میں کھایا۔ ریسٹوران کے مالک کا نام جیت سنگ تھا اور اس کا تعلق چندی گڑھ سے تھا اور وہ پچھلے اٹھارہ سال سے بوسٹن میں مقیم تھا۔ کھانے میں دو خاص باتیں تھیں، پہلی یہ کہ بہت دنوں بعد ”ایٹشین فوڈ“ کھانے کو ملا تھا اور دوسری یہ کہ خاصا بد مزہ تھا۔

لنچ سے فراغت کے بعد ہم ”کونزنی مارکیٹ“ گئے۔ یہ بوسٹن کا مرکزی ٹورسٹ سپاٹ ہے۔ یہ مارکیٹ کم اور ”فودسٹریٹ“ زیادہ لگتی ہے کیونکہ یہاں جا بجا کھانے پینے کی دکانیں ہیں جہاں تقریباً ہر ملک کا کھانا ملتا ہے۔ کھانے پینے کی یہ دکانیں ایک ساتھ اور آمنے سامنے واقع ہیں اور اس طرح ایک گلی سی بن گئی ہے اور جب آپ اس گلی سے باہر آتے ہیں تو سامنے ایک کھلی جگہ ہے جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی مداری اپنا کرتب دکھا رہا ہوتا



اور واشنگٹن دیکھنے نکل کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے کسی نے مجھ سے احتیاطاً پوچھا کہ واشنگٹن میں کس جگہ جا رہے ہو؟ میں نے جواب دیا ”پورا واشنگٹن دیکھنے!!!“

واشنگٹن کی سب سے بہترین چیز اس کی زیر زمین چلنے والی ٹرین ہے جسے ”میٹرو“ کہتے ہیں۔ نیویارک کے برعکس واشنگٹن کے تمام میٹرو سٹیشن ایئر کنڈیشنڈ ہیں اور ٹرینیں اپنی خوبصورتی اور آرام کی وجہ سے لا جواب ہیں۔ نہایت سبک رفتار یہ ٹرین آپ کو آنا فانا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے۔ سٹیشن پر اور ٹرین کے اندر جگہ جگہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والے نقشے بنے ہوئے ہیں جن کی بدولت کوئی جاہل سے جاہل شخص بھی آسانی سے گم نہیں ہو سکتا۔ گم ہونے کے لیے اسے ”آؤٹ آف دی وے“ محنت کرنی پڑتی ہے!!! چونکہ امریکی محنت سے بالکل نہیں گھبراتے اس لیے وہ اس کام میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس بات کا ثبوت مجھے اس وقت ملا جب میں نے ہوٹل کی ”آل ان ون“ قسم کی ڈیوٹی منیجر سے پوچھا کہ ہوٹل سے ڈاؤن ٹاؤن جانے کے لیے مجھے کون سی میٹرو لینا ہوگی تو جواباً اس سیاہ رنگت والی عقیفہ نے وہی جملہ دہرایا جو نوے فیصد امریکی عوام کا محبوب فقرہ ہے یعنی ”am not sure“ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ شہر جانے کا سب سے بہتر ذریعہ غالباً ٹیکسی ہو سکتا ہے۔ میں نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک میٹرو سٹیشن تھا، وہاں پہنچ کر میں نے بمشکل دو منٹ انتظار کیا کہ ٹرین آگئی جس نے مجھے اگلے دس منٹ میں واشنگٹن شہر کے پیچوں بیچ اتار دیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یقیناً اس سیاہ فام حسینہ کی ہوٹل کے کام کر کر کے ”مت“ ماری گئی ہوگی ورنہ اسے ٹیکسی کے علاوہ بھی شہر پہنچنے کے اس ذریعہ کا علم ہوتا۔

اگلے روز ہماری امریکی دفتر خارجہ میں ملاقاتیں طے تھیں۔ ان میں سے ایک ملاقات امریکی نائب وزیر خارجہ برائے جنوبی ایشیائی رچرڈ باؤچر سے بھی ہونا تھا تاہم پھر اسے کسی نے بتا دیا کہ پاکستان کے وفد کی نمائندگی میں کر رہا ہوں اس لیے اس نے پروٹوکول کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے کسی سینئر افسر کو اس ملاقات کے لیے راضی کر لیا۔ میں نے بعد میں کچھ ”مفسدین“ کو یہ بھی کہتے سنا کہ ہم سے ملاقات کے لیے کوئی سینئر افسر نہیں بلکہ رچرڈ باؤچر کا کوئی ماتحت آیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!!!

واشنگٹن میں حاصل سفر وہ گپ شپ تھی جس کا موقع ہمیں اپنے میزبانوں کے ساتھ

## واشنگٹن ڈی۔سی

امریکہ میں میرا یہ تیسرا ہفتہ تھا اور اس ہفتے ہمارے کورس کے میزبانوں نے ہمیں واشنگٹن لے جاتا تھا۔ واشنگٹن لے جانے سے پہلے ان ”ظالموں“ نے ہمیں ایک نہایت ہی خوفناک قسم کی ”Pre-Departure Orientation“ دی جس میں ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ ہوائی جہاز ایک ایسی شے ہوتی ہے جو مسافروں کو ہوا میں اڑا کر نہایت تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے اس لیے ہوائی جہاز کے سفر میں ہمیں بے حد احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ اس بریفنگ کا لب لباب یہ تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی واشنگٹن میں کہیں بھی جانے سے پہلے ایک رجسٹر میں اندراج کرے جس میں اپنی روانگی اور آمد کا وقت اور جگہ کا نام لکھے تاکہ واشنگٹن جیسے بڑے شہر میں ”گم“ نہ ہو جائے۔ شاید ہمارے میزبانوں کا خیال تھا کہ ہم پاکستان سے کسی کشتی میں بیٹھ کر امریکہ پہنچے ہیں اس لیے ہمیں امریکہ کے بڑے شہروں کے درمیان ذرائع آمد و رفت اور قیام و طعام کے بارے میں مفصل بریفنگ دینا ان کا فرض ہے۔

واشنگٹن کے جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا وہ یوں تو اچھا خاصا تھا تاہم اس میں ایک خرابی تھی کہ رات کے وقت ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک پر جس کی بھی ڈیوٹی ہوتی وہ بیک وقت ٹیلی فون آپریٹر، ڈیوٹی مینیجر، گیٹ کیپر اور ضرورت پڑنے پر ویٹر کا کام بھی کرتا۔ تاہم قطع نظر اس بات کے، ہوٹل کے کمرے نہایت مناسب اور آرام دہ تھے۔

کمرے میں پہنچتے ہی میں نے حسب عادت نہایت بے دردی سے اپنا سامان پھینکا

اس کی آنکھوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔

نوٹ: یہ کالم نیویارک سے لندن آتے ہوئے جہاز میں لکھا گیا۔ فلائٹ کے دوران اس قدر جھٹکے لگے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نیویارک سے لندن بذریعہ ہوائی جہاز نہیں بلکہ ڈی جی خان سے راجن پور بذریعہ وگین سفر کر رہا ہوں۔ اس لیے اگر قارئین کو اس کالم میں بھی کچھ ”جھٹکے“ محسوس ہوئے ہوں تو میں ہرگز معذرت خواہ نہیں ہوں!!!

(6 اگست 2007ء)

کرنے کو ملا۔ اس دوران ہمیں ایک عام امریکی کی جنرل نالج کے بارے میں بھی خاصا اندازہ ہوا۔ اپنے ملک کے بارے میں ان کی معلومات کا اندازہ ان سوالوں سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کئے۔ مثال کے طور پر Capital Hill اور Pentagon ایک ہی جاتے ہوئے ان میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا Capital Hill اور Pentagon ایک ہی آفس ہیں؟ اسی طرح ایک اور موقع پر یہ سوال بھی کیا گیا کہ ہماری (امریکہ کی) اپنے ملک میں بھی کوئی امریکن ایمپلیسی ہے؟ یہ سوال کچھ ایسے ہی تھے جیسے کسی نے ہم سے ایک دعوت میں پوچھ لیا کہ کیا پاکستان میں پیپسی دستیاب ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا تھا کہ امریکی اپنے کتوں سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اتنی محبت اپنے بچوں سے نہیں کرتے جتنی کتے کے بچوں سے کرتے ہیں۔ ہماری ہم سفر ایک امریکی خاتون اپنے کتوں کے بارے میں بے حد فکر مند رہتی تھی بلکہ وہ روزانہ فون کر کے اپنے کتوں کی خیریت دریافت کرتی اور اسے اس خیریت کی اطلاع وہ ہوٹل والے دیتے جہاں وہ اپنے کتوں کا 100 ڈالر یومیہ کے حساب سے قیام و طعام کا بندوبست کر کے آئی تھی۔ (مجھے یقین ہے کہ واشنگٹن میں ہم اس سے زیادہ مہنگے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے!!!) اس کے برعکس ایک امریکی خاتون ایسی بھی تھی جو تین شادیاں اور دو بچے پیدا کرنے کے باوجود بھی اکیلی رہتی تھی۔ وہ اپنے تینوں خاندانوں کو چھوڑ چکی تھی جبکہ اس کا بیٹا اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا اور بیٹی کو خود ماں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ بیٹی نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور جاب کرنے کو بھی تیار نہیں تھی لہذا میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ اگر اسے گھر میں رہنا ہے تو پھر پڑھنا پڑے گا چونکہ وہ کچھ بھی کرنے کو تیار نہیں تھی لہذا میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ میں نے یہ سب سن کر افسوس کا اظہار کیا تو اس نے پوچھا ”کیا تمہارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا؟“ ”نہیں، ہمارے ملک میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بیٹیاں، ماں باپ کی ذمہ داری ہوتی ہیں۔ ان کی تعلیم، رہن، سہن، شادی وغیرہ سب والدین کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو والدین کی یہ ذمہ داری شادی کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ!!! اس معاملے میں تو تم لوگ بہت خوش قسمت ہو۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔“ میں نے جواب دینے کی بجائے منہ دوسری طرف پھیر لیا کیونکہ بہر حال وہ ایک دکھی ماں تھی اور میں

میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن کو Borougs کہتے ہیں۔ ان میں بروکلین، کوئیز، اسٹیشن، آئی لینڈ، بروکس اور مین ہٹن شامل ہیں۔

سوائے مین ہٹن کے باقی تمام علاقے کم دبیش رہائشی نوعیت کے ہیں جبکہ مین ہٹن کو بجا طور پر نیویارک کا دل کہا جاسکتا ہے۔ بلند و بالا عمارات اور روشنیوں سے چکا چوند مین ہٹن ایک جزیرہ ہے جسے گیارہ پلوں اور پانچ tunnels کے ذریعے باقی نیویارک سے ملایا گیا ہے۔ ڈیڑھ کڑور سے زائد آبادی کے نیویارک کے شہر کا بجٹ تقریباً 85 بلین ڈالر ہے جس میں زیر زمین چلنے والی ٹرین کا بجٹ شامل نہیں۔ مین ہٹن میں میری رہائش نیویارک کے پتے کے حساب سے 10 ایونیو پر واقع ایک ہوٹل میں تھی۔ پہلے دن میں نے ہوٹل سے نکل کر ٹائم سکوائر دیکھنے کا فیصلہ کیا جسے مین ہٹن کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ایک شریف آدمی کو روک کر ٹائم سکوائر کا راستہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ ”42 سٹریٹ پر چلے جاؤ“۔

”اور یہ 42 سٹریٹ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”7 ایونیو پر ہے۔“

”اور یہ 7 ایونیو کہاں ملے گا؟“ میں نے لاجبت سے پوچھا۔

”یہاں سے تین بلاک کے فاصلے پر۔“

”اور اگر آپ برا نہ منائیں تو یہ بھی بتا دیں کہ یہ تین بلاک کیا بلا ہے؟“ میرے اس سوال پر اس نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن پھر میرے چہرے پر چھائی بے بسی کا لحاظ کرتے ہوئے وہ بولا ”جس چوراہے پر ہم کھڑے ہیں، اس سے اگلے چوراہے تک کا فاصلہ ایک بلاک کہلاتا ہے۔ اس حساب سے تین چوراہے کر اس کرنے کا مطلب تین بلاک کا فاصلہ طے کرنا ہے اور ٹائم سکوائر یہاں سے تین بلاک کے فاصلے پر ہے، سمجھے!!!“

قریب تھا کہ میں اس مرد کی عاقل کی فہم و فراست سے متاثر ہو کر اس کے ہاتھ چوم لیتا لیکن اسی وقت پیدل چلنے والوں کا اشارہ سبز ہو گیا اور وہ ”خضر راہ“ انسانوں کے سمندر میں گم ہو گیا۔

یوں تو پورا نیویارک شہر 24 گھنٹے کھلا رہتا ہے لیکن مین ہٹن اور خاص طور پر ٹائم سکوائر کی رونقیں صبح معنوں میں ”راؤنڈ دی کلاک“ جاری رہتی ہیں۔ یہاں آپ کو دوکانوں، بار، ریستوران غرض جگہ جگہ 24/7 کا سائن نظر آئے گا جس کا مطلب ہے کہ یہ جگہیں ہفتے

## نیویارک تالاہور

کہتے ہیں کہ دنیا کی کوئی تقریر ”مگر“ سے شروع نہیں ہو سکتی لیکن ایک سردار جی نے یہ کام بھی دکھایا اور ایک سیمینار میں اپنی تقریر ”مگر“ سے شروع کی۔ آج میں بھی انہی سردار جی کی پیروی کرتے ہوئے اپنے کالم کا آغاز ”مگر“ سے کرنا چاہتا ہوں:

”..... مگر نیویارک کی بات ہی کچھ اور ہے!!“ اس حقیقت کا اندازہ مجھے نیویارک میں قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا۔ امریکہ میں میرے قیام کا یہ آخری ہفتہ تھا اور اس ہفتے کے پانچ دن مجھے نیویارک میں اور دو دن اٹلانٹک سٹی میں گزارنے تھے جو نیویارک سے اڑھائی گھنٹے کی ڈرائیو پر واقع ہے۔

نیویارک پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شہر کا نقشہ حاصل کر لیا تاکہ ان پانچ دنوں میں نیویارک کے تمام چیدہ و چیدہ مقامات دیکھ سکوں۔ یہ نقشہ کچھ مشکل تھا اس لئے اسے سمجھنے میں خاصی وقت پیش آئی لہذا میں نے ایک دوسرا نقشہ حاصل کیا جو نیویارک کے زیر زمین ریلوے اسٹیشن (Subway) سے متعلق تھا۔ یہ بھی خاصہ پیچیدہ تھا، تنگ آکر میں نے 6 in 1 قسم کا ایک نقشہ حاصل کیا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس نقشے میں چھ نقشے شامل ہیں جن میں نیویارک شہر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے تاکہ پست سے پست ذہن کے مالک اشخاص بھی اس فیض یاب ہو سکیں لیکن شاید ذہنی پستی کے کچھ درجات ایسے بھی تھے جن کا احاطہ یہ نقشہ بھی نہیں کر سکا۔ نیویارک میں قیام کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہ شہر اتنا بڑا ہے کہ محض نقشوں کی مدد سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ نیویارک کو پانچ حصوں

ہوں تاہم میری تمام تر تاکید کے باوجود موصوف چار بجے کے قریب ہوٹل پہنچے اور پھر ہم سوا چار بجے ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہوٹل سے نکلتے ہی ہم ایک ٹریفک جام میں پھنس گئے جسے دیکھ کر اپنے برانڈر تھ روڈ کی یاد تازہ ہو گئی۔ اللہ اللہ کر کے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ٹریفک کھلا تو اس وقت تک سوا پانچ بج چکے تھے اور تب ہم ایئر پورٹ جانے والی ہائی وے تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ ہائی وے کا ٹول ادا کرتے ہوئے میرے دوست نے کمال بے نیازی سے ٹول لینے والے شخص سے ایئر پورٹ کا راستہ پوچھا تو میری روح فنا ہو گئی کہ کہیں ہم نے غلط ہائی وے تو نہیں لے لیا۔ تاہم اس وقت میری جان میں جان آئی جب اس شخص نے ہمیں تسلی دی کہ ہم صحیح ہائی وے پر ہیں۔ ہائی وے پہنچنے کے بعد میری یہ خوشی بھی خاک میں مل گئی کیونکہ بے پناہ رش کی وجہ سے یہاں بھی ٹریفک چیونٹی کی رفتار سے چل رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو پونے چھ بج چکے تھے، میرے دوست نے میری پریشانی کو بھانپ لیا اور بولا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، اگر فلائٹ مس بھی ہو جائے تو وہ اگلی پرواز سے بھیج دیتے ہیں۔ ”بہت بہت شکریہ تمہارا تسلی دینے کا!!!“ میں نے جل کر کہا۔

"Mention not" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

پھر خدا کو شاید میری کوئی نیکی پسند آگئی اور ٹریفک مکمل کھل گئی اور گاڑی تیز رفتاری سے ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ آدھ گھنٹے کے بعد ہم ایئر پورٹ پہنچ گئے، سوا چھ بج چکے تھے۔ میں نے نیویارک پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور لاؤنچ میں داخل ہو گیا۔ مجھے نیویارک بے حد پسند آیا تھا مگر اب میرے دل میں صرف لاہور پہنچنے کی تمنا تھی کیونکہ میں نے کسی سے جلد واپس آنے کا وعدہ کیا تھا!!!“

(16 اگست 2007ء)

کے سات دن چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہیں۔ یہاں ہر کوئی اپنے اپنے ماحول میں مست نظر آتا ہے، زیادہ تر لوگوں نے کانوں میں "Ipod" لگائے ہوئے ہیں اور گانے سنتے ہوئے اپنے اپنے کاموں میں مگن نظر آتے ہیں۔ کوئی سخت گرمی اور دھوپ میں اونی چیسٹر پہن کر گھوم رہا ہے اور کوئی محض نیکر پہنے فٹ پاتھ کے کنارے دھوپ سینک رہا ہے، کوئی تبلیغ کر رہا ہے اور کوئی اپنی پراڈکٹ کی مارکیٹنگ کر رہا ہے، کوئی نشے میں گالیاں بک رہا ہے اور کوئی جھوم جھوم کر گانے گا رہا ہے۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں، ہر کسی کو اپنا من پسند کام کرنے کی آزادی ہے بشرطیکہ اس کی آزادی کسی دوسرے کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے اور کسی قانون کے خلاف ورزی نہ ہو۔ نیویارک میں قیام کے دوران جب میں نے وال سٹریٹ، نیویارک سٹاک ایکسچینج، مجسمہ آزادی، چائنا ٹاؤن، بروکلین برج، براڈ وے، فیشن ایونیو اور دنیا کا سب سے بڑا سٹور "Macy's" وغیرہ دیکھ لیا تو دل میں ایک کسک سی اٹھی کہ اگر ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ نہ دیکھی تو کچھ بھی نہ دیکھا۔ یہ بلڈنگ مین ہٹن مڈ ٹاؤن میں 34 سٹریٹ پر واقع ہے۔ چونکہ یہاں بلند و بالا عمارات کثیر تعداد میں موجود ہیں اس لئے اس بلڈنگ کو ڈھونڈنے میں کچھ دشواری پیش آئی۔ اس کے سامنے واقع ایک سٹور میں کام کرنے والی لڑکی سے میں نے پوچھا کہ کیا سامنے والی بلڈنگ ہی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ ہے؟ اس پر اس نے باہر نکل کر اس بلڈنگ پر ایک نظر ڈالی اور بولی:

"Well I am not sure!" ویسے تو لگ ہی رہی ہے کیونکہ اس سے زیادہ اونچی

اور کوئی بلڈنگ نظر نہیں آرہی!!!“

ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ لیکن پھر میں نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ اس بلڈنگ کے ساتھ ہی مجھے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کا نشان نظر آ گیا تھا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی ایک تصویر بنوائی تاکہ ”سندرہ“ اور بوقت ضرورت کام آئے“ اور واپس اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

جس روز میری نیویارک سے واپسی کی فلائٹ تھی اس روز میرے ایک دوست نے مجھے JFK ایئر پورٹ پر چھوڑنا تھا۔ فلائٹ کا وقت تقریباً شام آٹھ بجے تھا۔ اس حساب سے میں نے اسے تین بجے کے قریب ہوٹل آنے کو کہا تاکہ ایک گھنٹہ میں ایئر پورٹ پہنچنے کے بعد میرے پاس چیک ان کرنے، رجسٹریشن کروانے اور سکیورٹی کلیئرنس وغیرہ کے لیے تین گھنٹے

”اچانک“ ہمیں کسی سے محبت ہو جاتی ہے اور ایک دن ”اچانک“ ہم اس سے قطع تعلق بھی کر لیتے ہیں۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ میں بھی لفظ ”اچانک“ ہی چھپا ہوا ہے۔ راہ چلتے ہوئے ”اچانک“ سکرین پر ”تازہ ترین خبر“ لکھا ہوا ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کوئی سانحہ رونما ہو گیا ہے۔ نائن الیون کا واقعہ ہوتا ہے اور ”اچانک“ پوری دنیا کا منظر نامہ بدل جاتا ہے، ”اچانک“ کوئی ہستی آپ سے ٹھٹھرتی جاتی ہے، ایک کرکٹ میچ ہارنے کے بعد ”اچانک“ ہم اپنے قومی ہیروز سے نفرت کرنے لگتے ہیں، ”اچانک“ ایک روز آپ کے کمپیوٹر میں وائرس آ جاتا ہے اور آپ کا سارا ڈیٹا تباہ ہو جاتا ہے۔ ”اچانک“ گھر کی بیل بجتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ایک نہایت بور شخص آپ سے ملنے کا مثنیٰ ہے۔ ایک روز ”اچانک“ آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ موٹے ہو رہے (رہی) ہیں اور اس سے پہلے کہ آپ بالکل ہی بے ڈھنگے (بے ڈھنگی) ہو جائیں، آپ کو کچھ کر لینا چاہئے۔ صبح آفس کے لیے تیار ہوتے وقت آپ شیو کرنے کے لئے ریزر اٹھاتے ہیں تو ”اچانک“ پتہ چلتا ہے کہ بلیڈ ختم ہو گئے ہیں۔ کسی ضروری کام سے جاتے ہوئے ”اچانک“ گاڑی کا ٹائر پنچر ہو جاتا ہے، ”اچانک“ کسی کی لائبری نکل آتی ہے، ”اچانک“ کسی مکان کی چھت گر جاتی ہے۔ سخت گرمی اور جس کے بعد ”اچانک“ بارش شروع ہو جاتی ہے۔ کسی سے موبائل فون پر بات کرتے ہوئے ”اچانک“ بیلنس ختم ہو جاتا ہے (تاہم کچھ نوجوان اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ایسا نہ ہونے پائے کیونکہ اس سے ان کی سبکی کا اندیشہ ہوتا ہے)۔ ”اچانک“ ایک روز آپ کا بچہ اپنے پاؤں پر چلنا شروع کر دیتا ہے یا ”اچانک“ کوئی خاتون ”امید“ سے ہو جاتی ہے۔ ایک دن ”اچانک“ آپ کا وہ ملازم کام چھوڑ کر چلا جاتا ہے جسے آپ نے بڑی مشکل سے ”ٹرینڈ“ کیا ہوتا ہے۔ ”اچانک“ آپ کو کاروبار میں نقصان ہو جاتا ہے۔!!!

ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ ”اچانک“ بریانی آگئی جس نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ میں نے کچھ کر دیکھی تو ذائقہ اچھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پلیٹ ختم کی، پیسے ادا کیے اور گاڑی چلا دی۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ”اچانک“ ایک موٹر سائیکل والا سامنے آ گیا اور اگر میں جلدی سے بریک نہ لگاتا تو حادثہ یقینی تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر نیم دراز ہو کر ٹی وی لگا لیا۔ تھوڑی دیر بعد ”اچانک“ مجھے یاد آیا کہ میں نے آج اپنے ایک دوست کی دعوت پر جانا تھا جس کا وقت گزر گیا ہے۔ میں نے فوری طور پر اپنے

## اچانک.....!!!

گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے میری نظر ایک کھوکھے پر پڑی جس پر لکھا تھا ”اچانک بریانی اینڈ برگر ہاؤس !!!“ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید جلدی میں پڑھتے ہوئے مجھے کچھ دھوکا ہوا ہے لیکن جب میں نے اطمینان سے گاڑی روک کر غور سے پڑھا تو پتہ چلا کہ اس کھوکھے کا نام واقعی ”اچانک بریانی اینڈ برگر ہاؤس“ ہے۔ اپنی حیرت دور کرنے کے لئے میں نے ہارن دے کر کھوکھے والے کو بلایا اور اس سے اس قدر انوکھا نام رکھنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں کام کیا کرتا تھا کہ ”اچانک“ ایک روز مالک نے اسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیا۔ مصیبت کی اس گھڑی میں اس کے ایک دوست نے مدد کی اور چند ہی دنوں میں وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنا کام شروع کر سکے۔ یہ سب کچھ اس قدر ”اچانک“ ہوا کہ اس نے اپنے نئے کام یعنی کھوکھے کا نام ہی ”اچانک بریانی“ رکھ دیا۔ میں نے کافی دلچسپی سے اس کی یہ چھوٹی سے روداد سنی اور گاڑی گیر میں ڈال کر چلنے لگا کہ ”اچانک“ مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ یہاں سے بریانی ہی چکھ لی جائے لہذا میں نے اسے ایک پلیٹ بریانی کا آرڈر دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اسی انتظار کے دوران میں نے دوبارہ اس ”اچانک تھیوری“ پر غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ کھوکھے کا نام بالکل بھی عجیب نہیں بلکہ دیکھا جائے تو ہماری زندگی کا زیادہ تر حصہ ”اچانک“ ہی کی ذیل میں آتا ہے یعنی ہم اکثر کام ”اچانک“ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ”اچانک“ ہمیں یاد آتا ہے کہ آج بل جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے یا ”اچانک“ ہمیں کسی سے خدا واسطے کا بیر ہو جاتا ہے یا



جیسے ان کے پاس معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے جو وہ آپ کے ساتھ share کرنا چاہتے ہیں۔ ان دو قسموں کے علاوہ لوگوں کی ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے جو ”اچانک“ آپ کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد ”اچانک“ ہی غائب بھی ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جب ان کا مطلب ختم ہو جاتا ہے تو آپ سے ان کا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

لوگوں کی طرح قوموں کی زندگیوں میں بھی واقعات ”اچانک“ رونما ہوتے ہیں۔ ”اچانک“ کوئی مسیحائی کا دعویٰ کر کے خود کو مسلط کر دیتا ہے۔ محلوں میں رہنے والے ”اچانک“ پابند سلاسل ہو جاتے ہیں۔ ”اچانک“ تخت گرائے جاتے ہیں اور تاج اچھالے جاتے ہیں!!! لیکن نہیں..... یہ سب کچھ ”اچانک“ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے طویل جدوجہد درکار ہوتی ہے اور یہ جدوجہد قربانیاں بھی مانگتی ہے۔ جو قومیں اس جدوجہد اور قربانیوں میں اپنا حصہ نہیں ڈالتیں، ان کی زندگی میں ”اچانک“ آسمان سے کوئی نجات دہندہ نہیں اترتا!!!

(20 اگست 2007ء)

اس دوست کا نمبر ملایا اور اس سے معذرت کی کہ میں اس کی دعوت میں آنا بھول گیا تاہم اس کے لہجے سے مجھے یوں لگا کہ اسے یا تو میرے بھولنے کا یقین نہیں آیا اور یا پھر اسے میرا بھولنا اچھا نہیں لگا، ہر دو صورتوں میں وہ حق بجانب تھا۔

یہ ”اچانک“ تھیوری اب میرے سر پر سوار ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ کائنات بھی ”اچانک“ تخلیق ہوئی تھی اور ایک دن ”اچانک“ فنا ہو جائے گی۔ تاہم میری یہ فلسفیانہ سوچ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ ”اچانک“ مجھے کچھ ایسے لوگوں کا خیال آ گیا جو اس ”اچانک“ تھیوری“ کا بالکل الٹ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو اپنے والد صاحب کے فوت ہونے کے بعد یکدم دس لاکھ روپے کا مالک بن گیا تھا تاہم جب ایک سال بعد اس سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا ”یار سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر دس لاکھ روپے گئے کہاں؟ اس ایک سال کے دوران میں نے کچھ خاص کام بھی نہیں کیا۔ بس ہر مہینے گھر کے ضروری اخراجات پورے کرتا رہا، ایک سال بعد جب میں بینک میں اپنا بیلینس معلوم کرنے گیا تو ”اچانک“ مجھے پتہ چلا کہ دس لاکھ میں سے پانچ ہزار روپے باقی بچے ہیں!!!“

اسی طرح کے ایک کرم فرما اور بھی ہیں۔ میں جب ان کے سر کی وفات پر تعزیت کیلئے گیا تو فرمانے لگے: ”کیا بتاؤں جناب! بزرگوار کی ناگہانی موت نے بڑا گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔ بھلے چنگے تھے، ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ فقط ان کے گردے کام کرنا چھوڑ گئے ہیں اور دل کی دوشریاں بند ہیں۔ آخری دنوں میں جب انہیں ICU میں داخل کروایا تو سب سے باتیں بھی کیں۔ تاہم ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے مہمان ہوں گے لیکن پھر ”اچانک“ ہی ایک گھنٹے بعد بزرگوار کی وفات ہو گئی۔ خدا مغفرت کرے۔“

اس ”اچانک“ تھیوری“ کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ صنف نازک کے حوالے سے ہے۔ ”اچانک“ حیران کر دینے کی جو خداداد صلاحیت خواتین میں ہے وہ مردوں میں کہاں! خواتین ”اچانک“ ہی ناراض ہو جاتی ہیں لیکن ”اچانک“ مانتی نہیں ہیں!!!

کچھ لوگ بھی ہماری زندگیوں میں ”اچانک“ وارد ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے محبوب بن جاتے ہیں جبکہ کچھ ہماری زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ کوفت مجھے ان لوگوں سے ہوتی ہے جو بلا وجہ بور کرتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً فارغ ہوتے ہیں اور ان کے پاس کہنے کو اور کرنے کو کچھ نہیں ہوتا لیکن یہ لوگ یوں ظاہر کرتے ہیں

تمہارا رزلٹ کارڈ آگیا ہے۔“ اگر آپ کسی کے دوست ہیں تو شاید یہ فون آئے کہ ”یار اچانک پیسوں کی سخت ضرورت پڑ گئی ہے، تم فوراً 50 ہزار کا بندوبست کرو، میں لینے آ رہا ہوں۔“ اور اگر آپ ماتحت ہیں اور دفتر سے نکل کر گھر واپس جا رہے ہیں تو فون آئے گا ”جناب! واپس دفتر تشریف لے آئیں، صاحب یاد کر رہے ہیں۔“

موبائل فون ایک دن کے لئے بند کرنے کی ایک وجہ وہ پیغامات بھی تھے جو موبائل فون کمپنیاں اپنے صارفین کو ایس۔ ایم۔ ایس۔ کی شکل میں بھیجتی ہیں۔ ان کا روبرو پیغامات کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا، یہ رات کے دو بجے بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔ کسی پیغام میں آپ کو رنگ ٹون ڈاؤن لوڈ کرنے کی خوشخبری سنائی جاتی ہے اور کسی میں آپ کو قرعہ اندازی کے ذریعے گاڑی جیتنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ سب سے منحوس پیغام مجھے وہ لگتا ہے جس میں آپ کو اپنا بل ادا کرنے کی یاد دہانی کروائی جاتی ہے۔

دفتر جانے کے لئے تیار ہوتے وقت مجھے یہ تمام باتیں یاد آرہی تھیں اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا موبائل فون بند کرنے کا فیصلہ کس قدر درست تھا۔ ابھی تک اس فیصلے کے نتیجے میں صرف یہی خرابی پیدا ہوئی تھی کہ صبح میری آنکھ وقت پر نہیں کھل سکتی تھی لیکن یہ کوئی ایسا خاص مسئلہ نہیں تھا کیونکہ موبائل فون نہ ہونے کی صورت میں الارم کسی گھڑی میں بھی لگایا جاسکتا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے میں دفتر پہنچ گیا، گیارہ بج چکے تھے، میرے شاف نے بتایا کہ آج تمام افسران کی ایک میٹنگ 10 بجے طے تھی اور سب لوگ اس میٹنگ کیلئے جا چکے ہیں۔ مجھے فون کیا گیا تھا لیکن میرا موبائل بند تھا اس لئے رابطہ نہیں ہو سکا۔ میں نے نہایت تحمل سے یہ اطلاع سنی اور میٹنگ میں شرکت کے لئے چل پڑا۔ جن لوگوں کو اس قسم کی میٹنگز اٹینڈ کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے وہ یقیناً اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایسے موقعوں پر دیر سے پہنچنا نہ صرف خاصا باعث ندامت ہوتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو آپ کو ایسی نظروں سے بھی دیکھتے ہیں کہ ”اب کیا لینے آئے ہو؟“

شام کو میری اپنے ایک دوست سے ملاقات طے تھی۔ حسب عادت میں دیئے گئے وقت کے مطابق اس ریستوران میں پہنچ گیا جہاں ہم نے اکٹھے چائے پینی تھی۔ آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے باوجود جب میرا دوست نہ پہنچا تو میرا ہاتھ ٹھکا کہ کہیں موصوف نے بھی موبائل پر پیغام دے کر ملاقات منسوخ تو نہیں کر دی۔ میں نے اس ریستوران کے ریسپشن

## ایک دن موبائل کے بغیر

میری آنکھ کھلی تو گھڑی دس بجارہی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ رات کے دس بجے ہیں یا صبح کے؟ لیکن جب پردے سے چھن کر آتی دھوپ کا احساس ہوا تو اچھل کر بستر سے نکل آیا کیونکہ آفس جانے کے لئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ موبائل فون اٹھا کر دیکھا تو بند پڑا تھا جس کی وجہ سے اس کا الارم نہیں بج سکا تھا اور بر وقت میری آنکھ بھی نہ کھل سکی۔ شیو کرتے وقت یاد آیا کہ رات کو سونے سے پہلے میں نے خود ہی اپنا موبائل فون بند کر دیا تھا کیونکہ میں ایک دن اس موبائل کے بغیر گزارنا چاہتا تھا۔ اس فیصلے کی بہت سی وجوہات تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ موبائل فون کی وجہ سے میرا بہت سا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ موبائل فون سے کھیلنا میری عادت بن چکی تھی جس وجہ سے میں خود بھی تنگ آچکا تھا۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ موبائل فون پر آپ کو کوئی اچھی خبر کم ہی سننے کو ملتی ہے۔ مثلاً آپ کو اس قسم کا فون کبھی نہیں آتا کہ مبارک ہو آپ کا 5 کروڑ کا انعامی بانڈ نکل آیا ہے یا آپ کا قرعہ اندازی میں پلاٹ نکل آیا ہے۔ موبائل پر عموماً آپ کو ایسے فون آتے ہیں جن کے نتیجے میں یا تو آپ کو کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے یا آپ کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ شوہر ہیں تو بیوی کا فون آئے گا کہ ”گھر میں انڈے اور ڈبل روٹی ختم ہیں، واپسی پر لیتے آئیے۔“ اگر آپ والد ہیں تو آپ کے لڑکے کا فون آئے گا ”ابو! میں گوالمنڈی تھانے میں بند ہوں، پولیس والوں نے مجھے ون ویلنگ کرنے کے جرم میں پکڑ لیا ہے۔ پلیز! آکر چھڑا لیں۔“ اگر آپ کسی کے بیٹے ہیں تو والد صاحب کا فون آئے گا کہ ”نالائق ذرا گھر آؤ تو تمہاری خبر لوں،

## رمضان کا شیطان

کمپیئر: ناظرین! آج ہم نے اپنے پروگرام میں جس شخصیت کو مدعو کیا ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ جس کو بھی ملتے ہیں اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ ہر دل میں گھر بنا چکے ہیں آپ کے اور میرے ہر دل عزیز شیطان صاحب!!! السلام وعلیکم جناب!!!

شیطان: برخوردار! مجھے سوچ سمجھ کر سلام کرو ورنہ پچھتاؤ گے اور یہ تم نے کیا کہا ہے کہ تم نے مجھے اپنے پروگرام میں مدعو کیا ہے؟ تم خود چل کر میرے پاس آئے ہو انٹرویو کرنے۔

کمپیئر: جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے میں خود چل کر آپ کے پاس آیا ہوں کیونکہ رمضان کی وجہ سے آپ پر تو باہر نکلنے کی پابندی ہے۔

شیطان: ہاں ہاں! میں جانتا ہوں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں تم اپنا انٹرویو شروع کرو۔

کمپیئر: جی بہتر! یہ بتائیے شیطان صاحب کہ رمضان میں جب آپ کو قید کر دیا جاتا ہے تو آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

شیطان: کچھ خاص نہیں بلکہ اس مہینے میں ذرا ریلیکس کرتا ہوں کیونکہ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں کام کا بوجھ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی ”بریک“ لینا میرے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

سے اپنے دوست کو فون کیا تو اس نے وہی جواب دیا جس کا مجھے خدشہ تھا یعنی ”یار! اپنا موبائل دیکھو، میں نے تمہیں ایس ایم ایس کر دیا تھا کہ میں آج نہیں آسکوں گا۔“ میں نے دل ہی دل میں ”لا حول ولا قوۃ“ کہہ کر فون بند کر دیا۔

اس وقت تک مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میرا موبائل بند کرنے کا فیصلہ کچھ غلط تھا لہذا گھر پہنچتے ہی سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنا موبائل فون آن کر دیا۔ کچھ پیغامات ”inbox“ میں پڑے ہوئے تھے جو بالترتیب کچھ اس طرح تھے:

”سر! میٹنگ میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے، 10 بجے کانفرنس روم میں پہنچ جائیں۔“

”میں چائے پر نہیں آسکوں گا، آج کی ملاقات کینسل۔“

”واشنگ پاؤڈر، ادک، آم (چونسا only)، فینائل کی گولیاں۔ Send Driver“

”آپ کے فون کا بل آپ کی کریڈٹ لیٹ سے بڑھ چکا ہے، براہ کرم اپنا بل فوراً جمع کروا دیجئے۔ شکریہ۔“

”فون کیوں بند ہے؟ کہیں مرنے تو نہیں گئے؟؟؟“

آخری پیغام پڑھ کر میں واقعی سرور میں آ گیا، مجھے احساس ہوا کہ موبائل فون لوگوں کے لئے کس قدر اہم ہے یعنی اگر ان لوگوں کو فون بند ملے تو یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ شاید بندہ ہی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ جن صاحب نے یہ پیغام بھیجا تھا، میں نے انہیں رنگ بیک کیا اور بتایا کہ الحمد للہ میں ابھی زندہ ہوں اور اپنے موبائل سے فون کرنے کے قابل بھی ہوں۔

”لیکن تم نے اپنا فون کیوں بند کیا ہوا تھا۔“ میرے دوست نے پوچھا۔

”بس یار! یونہی، میں ایک دن موبائل کے بغیر گزار کر دیکھنا چاہتا تھا۔“

یہ سن کر میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور بولا ”محض موبائل فون بند کر کے تم دنیا سے پچھا نہیں چھڑا سکتے، اس کے لئے تمہیں کسی جنگل میں جا کر سادھو بننا پڑے گا لیکن میرا مشورہ ہے کہ اگر کبھی ایسا کرنے کا ارادہ ہو تو وہاں بھی اپنا موبائل فون لے جانا مت بھولنا ورنہ سخت بور ہو گے۔“

اپنے دوست کی بات سن کر میں نے فون بند کر دیا اور صبح وقت پر جاگنے کے لئے الارم لگانے لگا کیونکہ فی الحال میرا سادھو بننے کا کوئی پروگرام نہیں تھا!!!

یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے کام سے جان کیسے چھڑائی جاتی ہے اور اسے دوسرے کے گلے میں کیسے ڈالا جاتا ہے۔

کمپیئر: تو پھر آپ اپنے کام سے کیسے جان چھڑاتے ہیں؟

شیطان: یہ میرے لیے بہت آسان ہے۔ اصل میں ہر انسان کے اندر ایک شیطان موجود ہوتا ہے، صرف اسے باہر آنے کا موقع ملنا چاہیے اور میں اسے یہ موقع فراہم کرتا ہوں جس کے بعد انسان کے اندر کی برائی خود ہی باہر آ جاتی ہے اور پھر وہی انسان ایک self starter قسم کا شیطان بن جاتا ہے۔

کمپیئر: واہ..... یہ تو بہت زبردست طریقہ ہے۔

شیطان: تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ بہت سے انسانوں میں یہ اندر کا شیطان پہلے سے ہی فعال ہوتا ہے اس لیے ایسے انسانوں کو میری ضرورت نہیں ہوتی بلکہ الٹا مجھے کبھی کبھی ان کی ضرورت پڑ جاتی ہے کیونکہ ان کے پاس برائی پھیلانے کے ایسے ایسے اچھوتے آئیڈیاز ہوتے ہیں کہ میں بھی حیران رہ جاتا ہوں۔

کمپیئر: کمال ہے یہ تو آپ نے بہت عجیب سی بات بتائی۔ اچھا یہ فرمائیے کہ ایسے انسانوں کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہوں گے جن پر آپ کا بس نہیں چلتا؟

شیطان: یقیناً ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں اور انہی کی بدولت تم جیسے انسانوں کا بھلا ہو جاتا ہے لیکن ایسے لوگ اب اس دنیا میں بہت کم رہ گئے ہیں۔

کمپیئر: آپ شائد مذہبی جماعتوں کی بات کر رہے ہیں کیونکہ ان میں اکثر نیک لوگ پائے جاتے ہیں؟

شیطان: (قہقہہ لگاتے ہوئے) یار یا تو تم بالکل احمق ہو یا بے حد چالاک..... لیکن ہر دو صورتوں میں تم میرے ایک اچھے کلائنٹ بن سکتے ہو۔ بھی مذہبی جماعتوں سے تو میرے بے حد دیرینہ تعلقات ہیں بلکہ ان کے کئی ممبران تو میرے PRO ہیں۔

کمپیئر: اور لیبرل جماعتوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شیطان: ان کے بارے میں بھی میرا یہی خیال ہے بلکہ ان میں سے وہ لوگ جو غیر ملکی امداد سے چلنے والی این۔ جی۔ اوز چلاتے ہیں، میرے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل

کمپیئر: تو اس دوران آپ اپنا ٹائم کیسے گزارتے ہیں؟

شیطان: میں نے بتایا ناں کہ میں صرف ریلیکس کرتا ہوں، ہلکی پھلکی غذا کھاتا ہوں اور چونکہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتا اس لیے گھر میں ہی ایک جاگنگ مشین خرید کر رکھی ہوئی ہے، اسی پر جاگنگ کر لیتا ہوں، بلڈ پریشر اور شوگر کنٹرول میں رہتی ہے۔

کمپیئر: یہ جاگنگ مشین آپ نے کتنے میں خریدی ہے؟ کاروباری طبقے میں آپ کے اثر و رسوخ کی بدولت کافی سستی مل گئی ہوگی؟

شیطان: نہیں بر خوردار! اس دوکاندار نے بھی مجھے چونا لگا دیا۔ مارکیٹ میں یہ مشین پچیس ہزار کی ہے جو اُس نے دھوکے سے مجھے تیس ہزار کی بیچ دی۔

کمپیئر: اوہو..... حیرت ہے کہ آپ جیسا زریک انسان..... میرا مطلب ہے کہ شیطان بھی دھوکا کھا گیا۔ خیر، ہم اپنے موضوع کی طرف واپس آتے ہیں، یہ بتائیے کہ رمضان میں پابندی کی وجہ سے آپ کے ”کلائنٹس“ متاثر نہیں ہوتے؟ میرا مطلب ہے کہ جب انہیں آپ کی طرف سے مسلسل ”رہنمائی“ کی ضرورت رہتی ہے تو پھر اس مہینے ان کی ”رہنمائی“ کون کرتا ہے؟

شیطان: پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے کلائنٹس اس ایک مہینے کی بریک کی وجہ سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ میں نے ان کی ایسی برین واشنگ کر رکھی ہے کہ اگر میں انہیں کئی کئی مہینے بھی نہ ملوں تو بھی انہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ انہی میں سے میرے کچھ پرانے کلائنٹس ایسے ہیں جو مسلسل ایک دوسرے کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں اس لیے مجھے زیادہ فکر نہیں ہوتی۔

کمپیئر: کیا آپ کو نئے کلائنٹس بنانے میں کوئی دشواری پیش آتی ہے؟

شیطان: (قہقہہ لگاتے ہوئے) یہ تم نے احمقانہ سا سوال کیا ہے۔ باقی گیارہ مہینوں میں میرے پاس کلائنٹس کا اتنا زیادہ رش ہوتا ہے کہ جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ دشواری پیش آتی ہے۔

کمپیئر: تو پھر آپ اپنے کام کو manage کیسے کرتے ہیں؟

شیطان: ویل..... اس کے لیے میں نے کچھ ”کنسلٹنٹ“ ہائر کر رکھے ہیں، وہ آج کل مجھے Planning Platform کی تھوڑی سمجھا رہے ہیں یعنی سادہ لفظوں میں

حرام“ کی کمائی تم پر نہیں لٹا سکتا۔

کمپیئر: جی بہت بہت شکریہ آپ کا.....! تو ناظرین یہ تھا ہمارا آج کا پروگرام ”رمضان کا شیطان“۔ اگلے ہفتے کے لیے اجازت دیجئے۔ اللہ حافظ!!!

ہیں۔

کمپیئر: اچھا عورتوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شیطان: (آہ بھرتے ہوئے) مجھے عورتیں بے حد پسند ہیں!!!

کمپیئر: وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں آپ کے کام کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں؟

شیطان: میں بھی ”کام“ کے حوالے سے ہی کہہ رہا ہوں.....اوہ.....اوہ.....اچھا

اچھا.....اب میں سمجھا۔ ویل! مردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی ایک

شیطان ہوتا ہے اور وہ شیطان مردوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے اسی لیے اُسے

باہر نکالنا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن ایک دفعہ جب یہ باہر آ جاتا ہے تو پھر اُسے

سنجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

کمپیئر: تو یہ کام بھی آپ خود کرتے ہیں یا اس کے لیے آپ نے کوئی سیکرٹری وغیرہ رکھی

ہوئی ہے؟

شیطان: میں پاگل ہوں جو اس کام کے لیے سیکرٹری رکھوں گا۔ عورتوں کے دلوں میں

جھانکنے کا کام میں میں خود کرتا ہوں جبکہ سیکرٹری میں نے دوسرے کاموں کے لیے

رکھی ہوئی ہے۔

کمپیئر: اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟ اور بھابھی کیا کرتی ہیں؟

شیطان: دو.....ایک بیٹا، ایک بیٹی..... بیٹا سروس میں ہے اور بیٹی سیاست میں اور میری

بیوی ”کوٹڈی رائس“ کی ایڈوائزر ہے۔

کمپیئر: ماشاء اللہ.....اوہ سوری.....میرا مطلب ہے کہ بڑی خوشی ہوئی سن کر۔ اچھا اب

آخر میں اپنا کوئی پسندیدہ شعر سنا دیجئے!!!

شیطان: اک فرصت گناہ ملی، وہ بھی چار دن

دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

کمپیئر: کیا کہنے.....واہ واہ.....اچھا شیطان صاحب! افطاری کا وقت ہونے والا ہے

اور میرا روزہ ہے کیا میں آپ کے یہاں روزہ افطار کر سکتا ہوں؟

شیطان: ویسے مجھے تمہیں افطاری کروانے میں کوئی اعتراض تو نہیں کیونکہ تم میرے ایک

potential کلائنٹ ہو لیکن تم لوگ کھاتے بہت زیادہ ہو اس لیے میں اپنی ”حق



بھی، دوست بھی اور کوئی بھی، ہمسائے بھی شامل ہیں اور ٹی وی ٹاک شوز میں شرکت کرنے والے مہمان بھی!!! کون، کس وقت، کس وجہ سے آپ کی بیزاری کا سبب بن جائے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً آپ سارا دن کے تھکے ہارے شام کو گھر آتے ہیں اور آرام کرنے کے بعد ٹی وی آن کر کے اپنا پسندیدہ ٹاک شو لگاتے ہیں تو اس پر ایک مکروہ شکل کا آدمی اپنی زہریلی گفتگو کے ذریعے عوام کو قائل کرتا نظر آتا ہے۔ بس!!! ہو گیا موڈ خراب۔ اب چاہے آپ چینل پر چینل بدلتے جائیں مگر وہ مکروہ شکل آپ کے دماغ سے محو نہیں ہو سکتی۔ اسی دوران ملازم چائے لے کر آتا ہے تو آپ اس پر برس پڑتے ہیں یا پھر بچوں کو ڈانٹنے لگتے ہیں تاہم بیوی سے نہیں الجھتے کہ اس سے فساد پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ سارے دن کی مغز ماری کے بعد شام کو دفتر سے گھر آئیں تو پتا چلے کہ چیونٹ سے آپ کے ”وڈے ماما جی“ آئے ہوئے ہیں اور دوپہر کا کھانا تناول کر کے اور ایک طویل قسم کا قبولہ فرما کے بڑی بے چینی کے ساتھ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ موصوف کو سیاست پر گفتگو کرنے کا خطبہ ہے۔ اب آپ لاکھ ان سے بچنے کی کوشش کریں لیکن ظاہری بات ہے کہ اس میں کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ نہ صرف وہ ”وڈے“ ہیں بلکہ آپ کے بھی ”مامے“ بھی ہیں لہذا چھوٹے ہی کچھ اس قسم کی گفتگو شروع ہو جائے گی: ”ترکی کے نو منتخب اسلام پسند صدر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ یہ سیکولر قوتوں کی ایک شکست ہے؟“

”جی ماما جی!“

”حالانکہ سیکولر قوتوں نے وہاں الیکشن سے پہلے لاکھوں کے جلوس نکالے تھے لیکن بالآخر فتح اسلام پسندوں ہی کی ہوئی۔“

”جی جی!!!“ (جما ہی لیتے ہوئے)

”بش، ترکی کی اس نئی حکومت کو بالکل پسند نہیں کرے گا اور تم میری پیشین گوئی لکھ لو کہ ایران کے بعد بش کی نظریں ترکی پر لگ جائیں گی۔“

”اچھی بات ہے!!!“

”کیا کہا؟ تمہارا دماغ ٹھیک ہے، کیا تمہارے خیال میں یہ اچھی بات ہے؟“

”سبس..... سوری ماما جی..... میرا دھیان کہیں اور تھا۔“

## ”میرا موڈ آف ہے“

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ کا موڈ سخت آف ہو جاتا ہے، چہرے پر بیزاری چھا جاتی ہے، آپ ہر کسی کو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں بلکہ کچھ تو کاٹ بھی لیتے ہیں! دوسروں کی کہی ہوئی بے ضرر باتوں پر چڑ جاتے ہیں، اپنے ماتحتوں کو بلا وجہ ڈانٹتے ہیں یا پھر اپنے آپ کو کوستے ہیں اور یہ سب کچھ کسی خاص وجہ یا کسی خاص شخص کی وجہ سے ہو رہا ہوتا ہے جو آپ کے موڈ کی خرابی کا باعث بنتا ہے۔

ہمیں دن میں اپنا موڈ خراب کرنے کے بے شمار مواقع ملتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ ان موقعوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر سارا دن اپنا موڈ خراب کیے بیٹھے رہتے ہیں جبکہ اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں کسی بھی واقعے سے رتی برابر بھی فرق نہیں پڑتا اور وہ ”نارل“ رہتے ہیں۔ ان دونوں ”انتہا پسندوں“ کے درمیان ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جنہیں ”اعتدال پسند“ کہنا مناسب ہوگا۔ یہ لوگ خاص خاص باتوں پر ہی اپنا موڈ خراب کرتے ہیں اور پھر ان باتوں پر سارا دن کڑھتے رہتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں سے ہمدردی ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ موڈ خراب کرنے کے لیے ہمارے ہاں بے شمار مواد دستیاب ہے اور اس مواد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس مواد کے ساتھ ساتھ بے شمار irritating شخصیت کے حامل افراد بھی آپ کے ارد گرد موجود ہیں جو حسب توفیق آپ کی بیزاری کا باعث بنتے ہیں۔ ان لوگوں میں راہ چلتے افراد بھی شامل ہیں اور آپ کے رشتہ دار

بعد میرے کولیگ کا موڈ کئی ہفتوں تک آف رہا جس کا خمیازہ اس کے ماتحتوں کو بھی بھگتنا پڑا۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین اپنا موڈ بہت جلد آف کر لیتی ہیں بلکہ کچھ خواتین تو اس انتظار میں ہوتی ہیں کہ کب آپ ان سے کوئی ”ایسی ویسی“ بات کریں اور وہ ”بظاہر“ اپنا موڈ آف کر لیں۔ تاہم اس کے برعکس کچھ خواتین اس لیے بھی موڈ آف کر لیتی ہیں کہ آپ نے اُن سے کوئی ”ایسی ویسی“ بات کیوں نہیں کی۔ مثلاً کوئی اس بات پر موڈ آف کر لیتی ہے کہ آپ نے اُس کے حسن کی تعریف کیوں نہیں کی اور کوئی اس بات پر موڈ آف کر لیتی ہے کہ آپ نے اُسے حسین کیوں کہہ دیا۔ ان خواتین کا موڈ آن کیسے کیا جاسکتا ہے، اس بارے میں اساتذہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم خواتین کے موڈ کو سمجھنے کے معاملے میں اساتذہ کی نسبت ”بہلی“ کی رائے زیادہ معتبر ہے۔ اور یہی جاننے کے لیے جب میں نے اس کو فون ملایا تو اس کی فون بیل کی جگہ یہ گانا چل رہا تھا ”مینوں نوٹ وکھا..... میرا موڈ ہے۔“ میں نے استغفر اللہ پڑھ کر فون بند کر دیا۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی..... ہم دوسروں کی وجہ سے تو اپنا موڈ ضرور آف کر لیتے ہیں لیکن سچ کہوں تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارے ارد گرد ہر شخص ہمارے لیے بیزاری کا باعث بنا ہوا ہے۔ ہم ہر شخص سے خار کھاتے ہیں اور irritate ہوتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں عام لوگوں سے ملتے ہوئے مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے کی بجائے ایک دوسرے کی خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ہمارے چہروں پر بیزاری اور نخوست کے ایسے سائے چھا چکے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر ایک معصوم بچہ بھی اپنا موڈ آف کر سکتا ہے۔ شائد اسی لیے Beverly Nichols نے اپنی کتاب ”Verdict On India“ میں لکھا ہے کہ ”برصغیر پاک و ہند میں فی مربع میل ناخوشی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔“ جب سے مجھے اس بات کا پتا چلا ہے، میرا اپنا موڈ سخت آف ہے!!!

(25 ستمبر 2007ء)

”ہوں! تمہارا حال بھی بالکل صغیر بٹ جیسا ہو گیا ہے، وہ بھی ایسے ہی مضبوط الحواس ہے۔“  
”کون صغیر بٹ ماما جی؟“

”لاحول ولا قوہ..... بھئی وہی صغیر بٹ جو سرگودھا میں تمہاری خالہ کی بیٹی کے ساتھ بیٹا ہوا ہے اور آج کل ہیروئین کے کیس میں اندر ہے۔“

”ہو سکتا ہے ماما جی..... (بیزاری سے) مجھے نہیں پتا۔“

”پہلے مجھے بھی نہیں پتا تھا..... وہ تو اخبار میں خبر آئی تو مجھے پتا چلا..... یار وہ سرگودھا میں ایس۔ پی۔ تمہارا واقف نہیں؟ اُس سے کہلو کہ صغیر بٹ کو.....!!!“

”ماما جی! میرا کوئی ایس۔ پی واقف نہیں..... (مزید بیزاری کے ساتھ) میں اب ذرا آرام کر لوں؟؟؟“

”یار تم کس قسم کے افسر ہو کہ تمہاری کوئی واقفیت ہی نہیں..... اور یہ تم نے کیا کہا کہ آرام کر لوں؟..... میں سرگودھا سے تمہیں ملنے کے لیے آیا ہوں اور تمہیں آرام کی سوچ رہی ہے..... خیر کوئی بات نہیں تم آرام کر لو میں ابھی چار پانچ دن یہیں ہوں۔“

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی گفتگو کسی بھی شریف آدمی حتیٰ کہ بدمعاش آدمی کا بھی موڈ خراب کرنے کے لیے more than enough ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہوتے ہیں اور محض ایک فقرہ کہہ کر ہفتوں آپ کا موڈ آف کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی اکثریت ”باس“ کہلاتی ہے اور ان کا طریقہ واردات سب سے جدا ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی دن آپ ٹائی شائی لگا کے دفتر پہنچیں اور آگے سے چپڑاسی آپ کو طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بتائے کہ ”صاحب یاد کر رہے ہیں۔“ اور پھر آپ سے وہی سلوک ہو جو ایک دفعہ میرے کولیگ کے ساتھ ہوا تھا:

”مسٹر! میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کیونکہ آپ کے خلاف ایک شکایت آئی ہے لیکن میں آپ کو نہ اُس شکایت کے بارے میں کچھ بتاؤں گا اور نہ ہی آپ کو اپنی صفائی میں کچھ بولنے کی اجازت ہے۔“

”لیکن سر شکایت تو بتادیں تاکہ میں.....“

”میں نے کہا نا کہ آپ صرف سنیں..... آپ کو بولنے کی اجازت نہیں..... میں نے صرف یہی کہنا تھا کہ be careful..... اب آپ جاسکتے ہیں!!!“ اس مختصر لیکن جامع گفتگو کے

میں یہ عجیب و غریب تعارف سن کر چکرا کر رہ گیا اور قریب تھا کہ میں چکر کھا کر ہی گر پڑتا کہ اُس ”بے غیرت“ نے مجھے سہارا دیا اور قریب ہی کرسی پر بٹھا دیا۔ تاہم اب بھی اس کے چہرے کی سنجیدگی میں ذرا برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

”جناب آپ تو یوں حیران ہو رہے ہیں جیسے اس سے پہلے آپ نے کبھی کوئی بے غیرت نہیں دیکھا!!!“ اجنبی نے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں، میں ہر روز سڑکوں، ہوٹلوں اور ٹی وی پر درجنوں بے غیرت دیکھتا ہوں لیکن ان میں سے کوئی بھی آپ کی طرح اپنی بے غیرتی کا برملا اعتراف نہیں کرتا۔“ میں نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی حیرانی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

”میں بے غیرت ہوں، منافق نہیں!!!“ اجنبی نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”میں کافی دیر سے آپ کو آبرو کر رہا تھا اور مجھے لگا کہ آپ میری بات سن لیں گے، اسی لیے آپ سے چند منٹ مانگے تھے۔“

”اب آپ یہ تو نہیں کہیں گے کہ آپ عدالت میں ایک پیشی پر لاہور آئے تھے اور وہاں آپ کی جیب کٹ گئی۔ اس لیے اب آپ کے پاس واپس شکر گڑھ جانے کا کرایہ نہیں ہے لہذا.....!!!“ میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اجنبی نے فقرہ اچک لیا..... ”جی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، کیا میں حُٹے سے آپ کو کوئی منگتا لگتا ہوں؟ میں صرف بے غیرت ہوں اور آج کل میری طرح کے ہائی کلاس بے غیرتوں کے پاس روپوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔“

”ہاں یہ تو ہے.....“ میں نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔ ”لیکن یہ آپ نے کیا کہا کہ آپ مجھے آبرو کر رہے تھے اور آپ کو لگا کہ میں آپ کی بات سن لوں گا؟ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ مجھے بھی اپنے جیسا سمجھ کر..... میرا مطلب ہے کہ.....“

میری اس بات پر اجنبی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا ”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں خود بے غیرت ضرور ہوں تاہم میں بے غیرتوں سے گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔“

اب تک اس ”بے غیرت“ کی ایک بھی بات میرے پلے نہیں پڑی تھی لہذا میں نے اس سے کچھ سیدھے سوال پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ ”آپ کی مردم شناسی کا شکریہ! لیکن یہ آپ کو خود کو بار بار بے غیرت کیوں کہہ رہے ہیں اور مجھ سے گفتگو کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“

”آپ کے پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ آج کل ہر دوسرا شخص اپنی غیرت دفن کر چکا ہے

## ”جینوئن“ بے غیرت!!!

”معاف کیجئے گا، کیا میں آپ کے چند منٹ لے سکتا ہوں؟“ میں نے مڑ کر اُس اجنبی کی طرف دیکھا جس نے یہ بات کی تھی۔ پچاس پچپن سال کی عمر، گندمی رنگ، سفید بال اور سرو قد کا حامل یہ خوش پوش آدمی گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس خاصا معقول نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”شکریہ! لیکن شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟“ اُس شخص کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی تھی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں واقعی آپ کو نہیں پہچان پایا تاہم اگر آپ اپنا تعارف کروادیں تو شاید مجھے یاد آ جائے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو بھی برا بھلا کہا کیونکہ اکثر مجھے لوگوں کو پہچاننے یا ان کے نام یاد رکھنے میں دشواری پیش آتی ہے جس کی وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اب بھی کچھ ایسی ہی صورتحال درپیش تھی۔

”جی کوئی بات نہیں، میں اپنا تعارف کروائے دیتا ہوں، مجھے بے غیرت کہتے ہیں!!!“ اجنبی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ میں نے چونک کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا لیکن مجھے وہاں طنز کا شائبہ تک بھی نظر نہیں آیا بلکہ اس کے چہرے پر ہلکی سی سنجیدگی طاری تھی۔ ”میں سمجھا نہیں..... آپ کا کیا مطلب ہے؟؟؟“

”جناب میں نے کہا ہے کہ خاکسار کو بے غیرت کہتے ہیں اور میری آپ سے تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی ہے۔“

ہیں یا ٹرین کی ٹکٹوں کے؟“

میری بات سن کر اجنبی کے چہرے پر ایک بار پھر وہی زہریلی سی مسکراہٹ ابھری..... ”محترم! اعلیٰ درجے کے بے غیرت اعلیٰ جگہوں پر پائے جاتے ہیں اور نہایت اعلیٰ قسم کی بے غیرتی دکھاتے ہیں، مڈل کلاس بے غیرت عام لوگوں میں مل جاتے ہیں اور اپنی Cpacity کے مطابق بے غیرتی دکھاتے ہیں جبکہ لوئر کلاس بے غیرت تعداد میں بہت کم ہیں، لوئر کلاس ہی کی طرح مظلوم ہوتے ہیں اور اپنی بے غیرتی کے باوجود ”رُلتے“ رہتے ہیں۔“

جوں جوں میں اس ”بے غیرت“ کی باتیں سنتا جا رہا تھا توں توں میری الجھن میں اضافہ ہو رہا تھا تاہم میں نے اپنی بات جاری رکھی..... ”عام طور پر بے غیرت کہلوانا اچھی خاصی ذلت شمار ہوتا ہے لیکن آپ خاصی دیر سے اس ذلت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور آپ کی باتوں سے یوں لگتا ہے جیسے آج کل بے غیرت ہونا ہی فائدہ مند ہے؟ کیا واقعی ایسا ہے؟“

”جی بالکل ایسا ہی ہے..... اصل میں آج کل competition کا دور ہے اور بے غیرتوں کی مانگ میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک زمانے میں بے غیرت ایک گالی ہوا کرتی تھی لیکن اب یہ زمینی حقیقت ہے۔ مقابلے کی وجہ سے اب بے غیرتی میں بھی درائی پیش کرنی پڑتی ہے جو کہ خاصا مشکل کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں اب پروفیشنل قسم کا بے غیرت ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ پروفیشنل جتنے competent ہوں گے آپ کا پیج اُتتا ہی پُرکشش ہوگا یعنی سادہ لفظوں میں کامیاب بے غیرت وہ ہے جو شکل سے نہیں اپنے عمل سے بے غیرت نظر آئے۔“

”ویسے سچی بات یہ ہے کہ آپ کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہیں، مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آخر آپ اپنے آپ کو بے غیرت کہہ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“ میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

”میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنا ضمیر بیچ کر بے غیرتی پر اُتر آئے تو اُسے کم از کم میری طرح اپنی بے غیرتی کا برملا اعتراف ضرور کر لینا چاہیے، کیونکہ اگر کوئی بے غیرت اس اعتراف میں شرم محسوس کرتا ہے تو پھر وہ جینوئن بے غیرت نہیں!!! اب میں چلتا ہوں، امید ہے آئندہ ملاقات نہیں ہوگی۔“ اُس نے الوداعی انداز میں اُٹھتے ہوئے کہا۔

”یعنی آپ بے غیرتی چھوڑ رہے ہیں؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”جی نہیں..... میں یہ ملک ہی چھوڑ رہا ہوں، شاید اسی طرح یہاں سے ایک بے غیرت کم

اور اس میں ضمیر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی لہذا ایسے میں اگر میں نے اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے خود کو برملا بے غیرت کہنا شروع کر دیا ہے تو میرے خیال میں یہ میری حقیقت پسندی کی مثال ہے۔ اور جہاں تک آپ سے بات کرنے کا تعلق ہے تو آج کافی عرصے کے بعد میرا دل چاہا تھا کہ میں اپنا کچھ ”کھٹارس“ کر لوں اسی لیے آپ سے گفتگو شروع کی تھی اگر آپ کو برا لگا ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔“

”نہیں مجھے برا نہیں لگا..... Please carry on میں نے خوشدلی سے جواب دیا کیونکہ میں اب اُس شخص کی گفتگو میں کافی دلچسپی لینے لگا تھا۔

”جی شکریہ! غالب نے کیا خوب کہا ہے..... بے غیرتوں کی کمی نہیں غالب، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں“

”معاف کیجئے گا! غالب نے یہ کب کہا؟ اور اگر اس نے یہ کہا بھی ہوتا تو وہ یہ شعر وزن میں کہتا“ میں نے اُسے گھورا۔

”اوہو جناب غالب نے اس سے کچھ ملتا جلتا شعر ہی کہا ہوگا، میں نے اُسے Tailor made کر لیا ہے، آپ ناراض نہ ہوں اور میری بات سنیں۔ آج کل بے غیرت اتنی زیادہ تعداد میں ہو گئے ہیں کہ واقعی ایک ڈھونڈو، ہزار ملنے والی صورتحال ہے۔“

”اچھا یہ بتائیے کہ کسی بے غیرت کو پہچاننے کا کیا طریقہ ہے؟“

”بہت آسان طریقہ ہے، ایک اوسط درجے کے بے غیرت کی تین بڑی نشانیاں ہوتی ہیں، پہلی یہ کہ وہ ڈھیٹ ہو، دوسری یہ کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے صاف مکر جائے اور تیسری یہ کہ وہ اپنی بے عزتی پر شرمندہ ہونے کی بجائے زور زور سے ہنسنا شروع کر دے۔“ یہ کہہ کر اس نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

”یہ بتائیں کہ کیا بے غیرتی میں بھی درجات ہوتے ہیں؟“ میں نے اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے ایک اور سوال داغا۔

”بالکل ہوتے ہیں۔“ اس نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا..... ”کچھ بے غیرت اعلیٰ درجے، یعنی فرسٹ کلاس کے ہوتے ہیں، دوسرے اکانومی یا مڈل کلاس اور تیسرے لوئر کلاس بے غیرت ہوتے ہیں۔“

”کمال ہے۔“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا ”یہ آپ بے غیرتوں کے درجے بتا رہے

ہو جائے، اُس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور باہر نکل گیا۔ جتنی دیر میں مجھے اس کی بات سمجھ آتی وہ ”جینوزن“ بے غیرت نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

(2 اکتوبر 2007ء)

## علامہ ”پرفیکٹ“

علامہ ”پرفیکٹ“ سے میری ملاقات تقریباً ہر دوسرے یا تیسرے ہفتے ہو جایا کرتی تھی۔ علامہ صاحب کا اصل نام تو کچھ اور ہے لیکن میں انہیں علامہ پرفیکٹ ہی کہتا ہوں جس کی وجہ آگے چل کر آپ کو خود بخود سمجھ آ جائے گی۔ علامہ صاحب ایک اعلیٰ کردار کے حامل انسان ہیں اور اپنے ارد گرد پھیلی ریا کاری سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی مختلف سماجی برائیوں پر بھی بہت پریشان رہتے ہیں اور دل ہی دل میں ان پر کڑھتے ہیں۔ انہیں لوگوں کی بے حسی سے بھی بہت شکایت ہے اور ان کا خیال ہے کہ معاشرے میں ان کے علاوہ کوئی بھی دوسرا شخص اپنے دل میں اس ملک کا درد نہیں رکھتا۔ علامہ صاحب کو دنیا میں پھیلی ہوئی منافقت سے بھی سخت نفرت ہے اور وہ اکثر محفلوں میں اس بات پر ”گرمل“ کرتے رہتے ہیں کہ ”میرے ارد گرد سب منافق ہیں اور میں ہی وہ اکیلا شخص ہوں جس کا ظاہر و باطن ایک ہے۔“ چونکہ علامہ صاحب کی رنگت کچھ ”پکی“ قسم کی ہے اس لیے ان کے اس بیان کی تردید کرنا ممکن نہیں!!!

ہر وقت منافقین کی فوج میں گھرے رہنے کے باوجود علامہ صاحب کبھی بھی کسی کے منہ پر تنقید نہیں کرتے کیوں کہ ان کے نزدیک ”ان کا اخلاق اس front biting کی اجازت نہیں دیتا۔“ تاہم ایسے لوگوں کے جانے کے بعد راقم کے سامنے اپنے دل کا حال ضرور بیان کرتے ہیں جس سے منافقین کے بارے میں ان کے ”سنجیدہ افکار“ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ علامہ صاحب چوں کہ ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہیں اس لیے



کس قدر competent ہوں!!! علامہ پرفیکٹ کے چاہنے والے ان کے یہ ”وچار“ سن کر نہایت ادب سے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہیں جس کے بعد علامہ صاحب ہلکا سا تبسم فرماتے ہیں اور پھر اپنے چاہنے والوں کو کچھ tips بھی دیتے ہیں جو ان کے کیریئر میں بہت کام آتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں ذکر کیا کہ علامہ ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی شہرت ایک سخت گیرانہ کی ہے اور وہ اپنے چھوٹے درجے کے ماتحتوں میں کسی قسم کی کرپشن برداشت نہیں کرتے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے انہوں نے اپنے ایک نائب قاصد کو نوکری سے برخاست کر دیا کیوں کہ وہ ”کرپٹ“ انسان کسی سائل سے سو روپے رشوت لیتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ علامہ صاحب سرکاری وسائل کے بے جا اور ذاتی استعمال کے بھی بے حد خلاف ہیں اور اس ضمن میں قوانین کی خلاف ورزی بالکل برداشت نہیں کرتے۔ انہی اصولوں کی خاطر انہوں نے ایک دفعہ اپنے ایک کلرک کو بھی نوکری سے برخاست کر دیا تھا کیوں کہ وہ اپنے کمرے میں انٹرکولر لگا کر بیٹھا ہوا تھا جس کا وہ ”مجاز“ نہیں تھا۔ ایسا سخت فیصلہ کرنے کے موقع پر ہمیشہ علامہ صاحب کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں لیکن وہ کہا کرتے ہیں کہ ”میں کیا کروں، مجھ سے بے ضابطگی برداشت نہیں ہوتی۔“ تاہم جیسا کہ میں نے بتایا کہ علامہ نہایت competent بھی ہیں اس لیے اگر انہیں اپنے لیے یا اپنے افسران کے حکم پر قوانین کی ”چھوٹی موٹی“ خلاف ورزیاں کرنی بھی پڑ جائیں تو وہ ایک لمحہ بھی تامل سے کام نہیں لیتے بلکہ نہایت فنکارانہ انداز میں قوانین کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کا محبوب فقرہ ہوتا ہے ”Show me your face and I will show you the Rule“۔

میں علامہ صاحب کو ”پرفیکٹ“ اس لیے کہتا ہوں کیوں کہ وہ ہر کام میں پرفیکشن مانگتے ہیں تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ خود بھی ہر کام پرفیکٹ طریقے سے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ وہ معاشرے میں موجود تمام لوگوں کو پرفیکٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہر کوئی سچ بولے، ایمانداری اور لگن سے اپنا کام کرے، اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح نہ دے، اس کے ذہن میں ہر وقت ملک کی خدمت کا جذبہ سما یا ہو وغیرہ وغیرہ۔ وہ معاشرے کے ہر شہری کو ایک پرفیکٹ انسان دیکھنا چاہتے ہیں اور جب انہیں کسی

ان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری کسی شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مسئلہ ہو، علامہ صاحب اسے منٹوں میں حل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ اکثر اوقات تو وہ آخرت کے معاملات بھی ”ستے داموں settle“ کروانے کی پیشکش کرتے ہیں جس کی وجہ غالباً ان کا اپنے عہدے پر بھرپور اعتماد ہے۔ علامہ صاحب کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد وہ اس دنیا سے ترقی پا کر عالم بالا میں کسی مزید بہتر جگہ پر تعینات کر دیے جائیں گے!!!

علامہ صاحب جیسے کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ ”علامہ“ ہیں اس لیے ایک صاحب علم آدمی ہیں۔ موضوع چاہے کوئی بھی ہو، علامہ صاحب اس پر اپنی ایک حتمی رائے ضرور رکھتے ہیں۔ سائنس، مذہب، فلسفہ، اخلاقیات، فلکیات، سیاسیات، آرٹ، کلچر، ایگری کلچر غرض کہ ہر فیلڈ میں ان کے پاس معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے تاہم وہ اس خزانے میں سے کسی کو حصہ دینے کی بجائے صرف ایک ہی فقرہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ”مجھے سب پتہ ہے اور میں سب جانتا ہوں۔“ اب ظاہر ہے کہ ایسی شخصیت کے سامنے تو شاندار سطو بھی اعتماد کے ساتھ بات نہ کر سکے!!!

علامہ پرفیکٹ ایک نہایت ایماندار اور راست باز انسان ہیں لیکن نہ جانے کیوں لوگ انہیں بالکل اس کے برعکس سمجھتے ہیں۔ علامہ اس رویے کو لوگوں کی سنگدلی پر محمول کرتے ہیں اور اکثر درگزر سے کام لیتے ہیں تاہم کبھی کبھی مجھ سے اپنے دل کا حال ضرور شیئر کر لیتے ہیں لیکن یہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب علامہ صاحب ترنگ میں ہوں۔ اس وقت ان کے ایک ہاتھ میں آدھا بھرا ہوا گلاس اور دوسرے میں سگریٹ ہوتا ہے اور اسی مستی کی کیفیت میں علامہ صاحب اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کی زبان سے جاری ہونے والے بیانات کسی ”اقوال زریں“ سے کم کا درجہ نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک دفعہ انہوں نے فرمایا ”ہمارے ملک میں ہر دوسرا شخص کرپٹ ہے، ہمارے ارد گرد تمام لوگ یا تو چورا چکے ہیں یا پھر فراڈ، کوئی بھی انسان ایسا نہیں جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ ایسے حالات میں (اپنی طرف اشارہ کر کے) کسی کا ایماندار رہنا معجزے سے کم نہیں۔ میں نے آج تک ایک پیسے کی بھی کرپشن نہیں کی کیوں کہ کرپشن وہ ہوتی ہے جو کسی عدالت میں ثابت کی جاسکے جبکہ میرے خلاف کرپشن کے درجنوں کیس بننے کے باوجود، الحمد للہ، آج تک ایک بھی کیس ثابت نہیں ہو سکا۔ اس سے تم نہ صرف میری ایمانداری کا اندازہ لگا سکتے ہو بلکہ یہ بھی جان سکتے ہو کہ میں پرفیکٹ

## ٹائم ہی نہیں ملتا!!!

اپنی روزمرہ زندگی میں ہم یہ فقرہ روزانہ درجنوں مرتبہ دوسروں سے سنتے ہیں اور خود بھی بولتے ہیں کہ ”ٹائم ہی نہیں ملتا“۔ اگر ہم کسی سے فون پر بات کر رہے ہوں اور بات کرنے والا پوچھے کہ کئی دن سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تو ہمارا جواب کھٹ سے ہوتا ہے ”کیا کروں یا؟ ٹائم ہی نہیں ملتا“۔ اسی طرح اگر ہمارے گھر کا کوئی کام کافی عرصے سے زیر التوا ہو تو ہم خود کو دل میں تسلی دیتے رہتے ہیں کہ جب بھی ٹائم ملے گا، کر لیں گے۔ اور اگر دفتر کا کوئی کام Pending رہ جائے تو باس کے لیے بھی یہی جواب ہوتا ہے کہ ”سُرا! دوسرے کاموں سے فارغ ہی نہیں ہو سکا، اس لیے یہ کام نمٹانے کا ٹائم ہی نہیں ملا“۔ یونہی کسی دور پار کے رشتہ دار سے اچانک ملاقات ہو جائے اور وہ دعوت دے بیٹھے کہ کبھی وقت نکال کر آؤ تو ہم اسے بھی یہی گھڑا گھڑایا جواب دیتے ہیں کہ ”کیا کروں؟ ٹائم ہی نہیں ملتا“!!!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ سارے کا سارا ٹائم جاتا کدھر ہے جو کہ پھر ملتا ہی نہیں؟ اگر ہم اس بات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو کافی دلچسپ صورتحال سامنے آئے گی۔ ذرا ایک منٹ کے لیے اپنی مصروفیت کا حال ذہن میں لائیں، شاید کچھ اس قسم کا خاکہ بنے:

”صبح آٹھ بجے اٹھنا، نو بجے تیار ہونا، دس بجے تک آفس پہنچنا، گیارہ بجے تک چائے پینا، بارہ سے ایک بجے تک کوئی بے معنی قسم کی میٹنگ اٹینڈ کرنا، ایک بجے لُنج کرنا، دو

بھی شخص میں ان تمام خوبیوں میں سے کوئی ایک بھی خوبی نظر نہیں آتی تو رو کر ان کی (فرنج کٹ) داڑھی بھیگ جاتی ہے۔ ایسے میں ایک دفعہ پھر وہ گلاس اور سگریٹ کا سہارا لیتے ہیں اور محفل کو اپنے خیالات سے گرمادیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہوتا ہے کہ ”مجھے سمجھ نہیں آتی کہ لوگوں میں اس قدر طبع اور لالچ کیوں ہے؟ کیوں دولت سے ان کا جی نہیں بھرتا؟ کیوں وہ ایک منٹ کے لیے بھی اس ملک کا نہیں سوچتے جس ملک نے انہیں اتنا کچھ دیا؟ مجھے دیکھو..... میں ہر وقت اس غم میں گھلتا رہتا ہوں کہ اس ملک کا کیا بنے گا؟ صرف میں ہی نہیں بلکہ میرے بیوی بچے بھی اس ملک کا سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے رہتے ہیں..... وہ روزانہ امریکہ سے مجھے فون کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس آ جاؤں کیوں کہ خاکم بدہن اب یہ ملک رہنے کے قابل نہیں رہا۔ انہوں نے اپنے ساتھ ساتھ میری بھی امریکی شہریت لے لی ہے لیکن مجھے اس کا بھی کوئی لالچ نہیں۔ جب تک میری یہ چھوٹی سی نوکری مجھے چار پیسے دے رہی ہے، میں اپنے ملک کی خدمت کرتا رہوں گا ورنہ پھر مجبوراً بچوں کی بات ماننی پڑی گی کیوں کہ اللہ کا یہی حکم ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا دکھ ضرور رہے گا کہ مجھے اپنے ملک میں کوئی بھی اپنی طرح کا پرفیکٹ انسان نہ مل سکا!!!“

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا..... ایک دن اچانک خبر ملی کہ علامہ صاحب امریکہ سدھار گئے ہیں۔ چونکہ جاتے وقت جلدی میں گئے تھے اس لیے کسی سے بھی ملاقات نہ کر سکے لیکن پھر ایک دن وہاں سے ان کا ایک پیغام آیا جس میں انہوں نے معذرت اور وضاحت کی کہ انہیں جلدی میں اس لیے جانا پڑ گیا کیوں کہ ان کے ایک ”منافع“ ماتحت نے ان کے خلاف کرپشن کا کیس مع ثبوت عدالت میں جمع کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے۔ تاہم اب بھی انہیں پورا یقین ہے کہ عدالت انہیں کسی فرشتے کی طرح بے گناہ قرار دے گی اور وہ ایک مرتبہ پھر ”پرفیکٹ“ انسان کی طرح اپنی زندگی شروع کر سکیں گے!!!

(17 اکتوبر 2007ء)

بتائیں کہ ان صاحب سے زیادہ مصروف شخص کون ہو سکتا ہے؟؟؟ بقول ٹیکسپیئر "much a do for nothing"

مردوں کی طرح خواتین کے پاس بھی آج کل بالکل ٹائم نہیں ہوتا۔ خاص طور پر وہ بیگمات جو نہ بچے سنبھالتی ہیں اور نہ خاوند، نہ جانے کیوں سب سے زیادہ مصروف نظر آتی ہیں۔ تاہم حیرت انگیز طور پر یہ خواتین ایک دوسرے کو فون کرنے کے لیے دو تین گھنٹے بڑے آرام سے نکال لیتی ہیں۔ لیکن رونا اس بات کا ہے کہ تین گھنٹے کے فون میں بھی ”ٹائم ہی نہیں ملتا“ کی تکرار جاری رہتی ہے۔ ان خواتین کے دن کا آغاز بھی ”صبح صادق“ یعنی تقریباً بارہ بجے کے قریب ہو جاتا ہے۔ ڈیڑھ دو بجے تک یہ کچھ Miscellaneous قسم کے فون کرتی ہیں جن کا بظاہر مقصد دوسروں کو اپنی بیداری کی اطلاع دینا ہوتا ہے۔ تین بجے تک ”برنج“ کرتی ہیں اور پھر چار بجے تیار ہو کر اپنے ٹیلر کے پاس پہنچ جاتی ہیں جہاں سے انہوں نے اپنے نئے سلعے ہوئے سوٹ اٹھانے ہوتے ہیں۔ بدلے میں یہاں ایک میض چھوڑ جاتی ہیں جس کی ”فنگ“ ٹھیک نہیں ہوتی لہذا ٹیلر کو اس کی فنگ درست کرنے کے لیے ضروری ہدایات دے کر وہاں سے اگلی منزل کی جانب روانہ ہو جاتی ہیں یعنی..... بیوٹی پارلر!!! یہاں انہوں نے کچھ مختلف النوع قسم کے کام کروانے ہوتے ہیں جن کا دورانیہ عموماً دو گھنٹوں تک محیط ہوتا ہے۔ پارلر سے فارغ ہونے کے بعد چند بوتیکس پر جانا ہوتا ہے جہاں کچھ نئے ڈیزائنوں کے کپڑے پسند کرنا ہے حد ضروری ہے بصورت دیگر کائنات کی گردش رکنے کا اندیشہ ہے۔ ان سارے انتھک مراحل سے گزرتے گزرتے رات ہو جاتی ہے اور پتا ہی نہیں چلتا کہ کب 9 بج گئے!!! بھاگم بھاگ واپس ٹیلر کے پاس پہنچتی ہیں جہاں انہیں میض کی فنگ کے سلسلے میں کچھ مزید ہدایات دینی ہوتی ہیں مثلاً لیس لگانی، چاک بڑے کرنا وغیرہ وغیرہ..... دس بجے گھر پہنچتی ہیں تو سارا دن ختم ہو چکا ہوتا ہے، اب بتائیے کہ باقی کاموں کے لیے ٹائم کہاں سے نکلے.....؟؟؟ لیکن پھر بھی بادل خواستہ ایک آدھ فون ملا لیتی ہیں جو رات بارہ بجے تک چلتا ہے اور اگر اس دوران خاوند کا فون آجائے تو دوسری لائن پر ہولڈ کروا کے کچھ اس قسم کی گفتگو فرماتی ہیں:

”ہاں..... سنئے..... میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا..... ناشتہ تو کیا ہی نہیں..... ٹائم ہی نہیں تھا۔ بس رات کا بچا ہوا سب وے کا سینڈوچ کھا کر گھر سے نکل گئی تھی، ابھی تھوڑی دیر پہلے

بجے دوبارہ چائے پینا، تین بجے آفس کو لیگ کے ساتھ مل کر باس کی بدخونیاں کرنا، چار بجے باس کے کمرے میں جا کر خوشامدیوں کرنا اور پھر پانچ بجے تک چھ بجنے کا انتظار کرنا۔ سات بجے تک گھر واپس آنا، آٹھ بجے تک آرام اور ڈنر وغیرہ کرنا اور پھر رات آٹھ سے بارہ بجے تک ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں پکڑ کر ساٹھ چینل بار بار گھما کر دیکھتے رہنا اور بارہ بجے جمابھیاں لے کر سو جانا۔“

واضح رہے کہ اگر آپ کو فیملی کے ساتھ آؤٹنگ پر جانا ہو تو اس کام کے لیے ویک اینڈ مختص ہے اور رہ گئی اتوار کی چھٹی، تو بے تحاشا ایسے کام بھی ہوتے ہیں جو اس امید پر نہیں کیے جاتے کہ اتوار کو کر لیے جائیں گے اور اس طرح وہ کام اتوار کی چھٹی کا ٹائم بھی کھا جاتے ہیں۔ (نہ جانے کیوں وہ کام اگلی اتوار تک بھی ویسے کے ویسے ہی منہ کھولے کھڑے رہتے ہیں!!!) اب آپ ہی بتائیں کہ اس ”مصروفیت“ میں کوئی شخص کہاں سے ٹائم نکالے؟؟؟

ان لوگوں کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نوکری کرتے ہیں نہ کاروبار مگر ان کے پاس بھی بالکل ٹائم نہیں ہوتا۔ یہ لوگ سب سے زیادہ مصروف رہتے ہیں اور آپ جب بھی ان سے گفتگو کریں تو آپ کو کچھ اس قسم کا جواب ملتا ہے ”یارتہ سوچ نہیں سکتے کہ میں کتنا مصروف آدمی ہوں اور مجھے کتنے کام کرنے ہوتے ہیں۔ مثلاً میرا کل کا شیڈول ہی دیکھ لو..... صبح ایل ڈی اے کے ڈائریکٹر سے میٹنگ ہے، دوپہر کو سیکرٹریٹ میں ایک ڈپٹی سیکریٹری کے ساتھ لمچ کرنا ہے اور سہ پہر میں کلکٹر سیل ٹیکس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کام ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میں کہاں سے ٹائم نکالوں؟“

بظاہر آپ کو یہ شیڈول بھی کافی ”ٹائٹ“ لگے گا لیکن اصل میں ایسے لوگوں کا دن کچھ اس طرح گزرتا ہے..... ”صبح کاذب کے وقت یعنی تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اٹھنا، ساڑھے بارہ بجے تک ناشتہ کرنا، ایک بجے تک پان سگریٹ کی دوکان پر کھڑے ہو کر پگئیں ہانکنا اور پھر وہیں ایک پی سی او سے ایل ڈی اے کے ڈائریکٹر کے پی اے کو فون کرنا اور پوچھنا کہ صاحب کب تک بیٹھے ہیں؟ دو بجے سیکرٹریٹ کی کینٹین سے نان چنے کا لمچ کرنا، تین بجے سیلز ٹیکس کے دفتر جا کر ہیڈ کلرک سے اس کے بال بچوں کی خیریت دریافت کرنا، شام کو چھ بجے گھر واپس آنا۔ سات بجے پھر گھر سے نکل جانا، دوستوں کے ساتھ تاش کی بازی لگانا، فلاش ہو کر واپس آنا اور تھک ہار کر سو جانا..... یعنی پہلے تھکنا..... اور پھر ہار کر سو جانا۔ اب آپ ہی

## بریک کے بعد

میزبان: السلام علیکم ناظرین! جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہمارا پروگرام بے لاگ تجزیوں اور غیر جانبدار تبصروں کی وجہ سے بے حد مقبول ہے تاہم اب کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لیے اس پروگرام کی مقبولیت کو قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن ہم ایسے لوگوں کا خیال غلط ثابت کر دیں گے اور اپنے پروگرام کی مقبولیت کو برقرار رکھنے کے لیے بلا خوف و خطر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرتے رہیں گے۔ اسی سلسلے میں آج ہم نے اپنے پروگرام میں ایک اعلیٰ عہدے دار کو گفتگو کی دعوت دی ہے۔ یہ عہدے دار اس قدر اعلیٰ ہیں کہ ہم اپنی زبان سے ان کا نام بھی نہیں لے سکتے لہذا نام لیے بغیر ہی ان سے گفتگو کا آغاز کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

میزبان: سر اگر جان کی امان پاؤں تو پروگرام کا آغاز کریں؟

مہمان: (بے نیازی سے) اجازت ہے!!!

میزبان: جی بہت شکریہ!!! سر..... پہلے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ماشاء اللہ آج آپ بہت ہینڈسم اور سمارٹ لگ رہے ہیں لہذا میری طرف سے بلکہ ہمارے چینل کی طرف سے آپ کے لیے نیک تمناؤں کا پیغام..... شالا نظر نہ لگے!!!

مہمان: اوہ..... تھینک یو ویری مچ!!!

میزبان: Mention not sir..... گفتگو کا باقاعدہ آغاز کرتے ہیں، میرا پہلا سوال یہ

ہی واپس آئی ہوں، پلیز آپ آتے وقت چکن منچورین لیتے آئیں..... کیا کہا؟ ویانا میں دھماکے ہوئے ہیں؟ اوہ اچھا..... وانا کہہ رہے ہو، میں ویانا سمجھی تھی..... اپنا ججی بھی تو ویانا میں ہی ہوتا ہے نا..... ویسے یہ وانا کون سی جگہ ہے؟..... کیا کہا..... وزیرستان میں ہے..... کیا وہاں سارے وزیر رہتے ہیں؟ میرا تو خیال تھا کہ سارے وزیر اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ اچھا اچھا آپ یہ سب چھوڑیں اور واپس آتے وقت میرے لیے منچورین لیتے آئیں، مجھے بہت بھوک لگی ہے، پہلے ہی سارا دن ضائع ہو گیا، کوئی کام کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملا..... کیا کہا..... نہیں نہیں..... ہرگز نہیں..... بڑی چیز ہیں آپ..... اوکے..... بائے.....!!!

تاہم ان خواتین کے برعکس ”بلی“ ایک ایسی شخصیت ہے جس کے پاس شام بجے کے بعد وقت ہی وقت ہوتا ہے لیکن یہ سارا وقت ٹی وی چینلز کے پرائم ٹائم کی طرح paid بلکہ pre-paid ہوتا ہے جس کا کوئی عام آدمی محتمل نہیں ہو سکتا۔

قطع نظر ان تمام باتوں کے، حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سب ہی بے حد مصروف ہیں۔ کاروباری حضرات دولت کمانے میں، مولوی صاحبان سیاست میں، کرکٹرز اور گلوکار تیلنگ میں، جبکہ بیوروکریٹ نوکری بچانے میں مصروف ہیں۔ کسی کے پاس اپنے ملک کے لیے ذرا سا بھی فالتو ٹائم نہیں ہے۔ اسی لیے میرا خیال ہے کہ ہمیں ”ٹائم نہیں ملتا“ والا معذرت خواہانہ رویہ ترک کر کے اس قسم کے پیغامات اپنے فون میں ریکارڈ کروادینے چاہئیں کہ!!!

☆ میں نوٹ کمانے میں مصروف ہوں اس لیے میرے پاس ٹائم نہیں۔

☆ میں خوشامد میں مصروف ہوں اس لیے میرے پاس وقت نہیں۔

☆ میں اپنے باس کے ساتھ بیٹھا ہوں..... مگر ان کے پاس بھی وقت نہیں۔

☆ میں ”ویلا مصروف“ ہوں اس لیے میرے پاس وقت نہیں۔

اور اگر ان میں سے کوئی بھی پیغام آپ کو سوٹ نہیں کرتا تو پھر اپنی مصروفیت میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر یہ پیغام اپنے فون میں ریکارڈ کروادیں۔

”زندگی جا چھوڑ دے پیچھا میرا“

آخر میں ”مصروف“ ہوں ”فارغ“ تو نہیں“

(22 اکتوبر 2007ء)



ہے۔ درزی یہ سن کر بولا ”آپ کی مرضی ہے، لیکن اگر آپ نے سولہ سائز کا کالر پہنا تو آپ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جائے گا، دم گھٹنا محسوس ہوگا، کانوں میں سائیں سائیں ہوگی اور دن میں تارے نظر آجائیں گے۔

مہمان: میں سمجھا تھا شاید تم مجھے کوئی تازہ لطیفہ سناؤ گے مگر یہ لطیفہ تو میں بیسیوں دفعہ اخباری کالموں میں پڑھ چکا ہوں اور اب تو اس کی داڑھی بھی سفید ہوگئی ہے۔

میزبان: معافی چاہتا ہوں سر..... اور ساتھ ہی اگلا سوال کرنے کی جسارت بھی کروں گا کہ ایسے تمام اقدامات جو ماورائے..... (ایک مرتبہ پھر غور سے ارفون میں ہدایت سنتا ہے اور مایوسی سے اثبات میں سر ہلاتا ہے) جی میں بالکل سمجھ گیا..... جی میں خیال رکھوں گا..... (دوبارہ مہمان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے) سر میں دراصل یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ نے ایسے کون سے اقدامات کیے ہیں جن کی بدولت اس سال بھی آپ کی فصل کو کیڑا نہیں لگا اور آپ کی زمینوں پر ریکارڈ پیداوار ہوئی ہے؟

مہمان: یہ تم نے بہت اچھا سوال کیا، تم کافی سمجھدار اور متوازن اینکر پرسن ہو، میں تم سے بہت خوش ہوں۔ جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب میرے منشی کے پاس ہوگا، وہ تمہیں پروگرام کے بعد بتا دے گا۔

میزبان: جی بہتر سر..... اب اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پروگرام کے فارمیٹ کے مطابق آپ سے کچھ سخت سوال کرنا چاہوں گا۔

مہمان: ہاں ضرور کرو مگر ذہن میں رہے کہ میں.....!!!

میزبان: (جلدی سے) جی جی سر مجھے تمام ہدایت یاد ہیں، میں تو صرف یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آج کل تھانوں میں تعینات اکثر ایس ایچ او بہت کرپٹ اور منہ زور ہو گئے ہیں اور..... (ایک دفعہ پھر ارفون سے ہدایت سننے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلاتا ہے اور سرگوشی کرتے ہوئے)..... مگر میں تو صرف ایس ایچ او کی بات کر رہا ہوں..... جی.....؟؟؟ لیکن میں نے تو صرف سوال کیا ہے، میرا مقصد کسی کی تضحیک..... (مایوسی سے) جی..... بالکل سمجھ گیا..... بہت بہتر..... (دوبارہ مہمان کی طرف منہ کرتے ہوئے) سر ایک دفعہ

ہے سر کہ کیا آپ اپنے آپ کو قانون سے بالاتر..... (رک کر ارفون میں سننے کی کوشش کرتا ہے اور پھر تیزی سے اثبات میں سر ہلاتا ہے)..... جی..... بالکل سمجھ گیا..... (دوبارہ مہمان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے) معاف کیجئے گا سر! ہاں تو میں آپ سے یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ آپ نے نہایت خوبصورت ٹائی لگا رکھی ہے، یہ ٹائی کس برانڈ کی ہے اور یہ آپ نے کہاں سے خریدی؟

مہمان: یہ تم نے بہت اچھا سوال کیا، یہ ٹائی میں نے خریدی نہیں بلکہ مجھے ایک دوست نے امریکہ میں چند سال پہلے تحفہ میں دی تھی۔ مجھے یہ ٹائی اس قدر پسند آئی کہ میں اسے تب سے ہی گلے میں ڈال کر رکھتا ہوں!!!

میزبان: واہ سر!..... کیا بات ہے، دوستی ہو تو ایسی!!!

مہمان: ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر اب اس ٹائی کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ضروری نہیں اسے ہر موقع پر ہی پہنا جائے لہذا جب کبھی میرا دم گھٹنے لگتا ہے، میں اسے اتار دیتا ہوں۔

میزبان: سر آپ کی بات سن کر ایک لطیفہ یاد آ گیا، اگر اجازت دیں تو سناؤں؟

مہمان: ہاں ضرور سناؤ بھئی، مجھے ہنسائے یا لطیفہ سنانے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے۔

میزبان: (لجابت سے) بہت شکریہ سر! ایک دفعہ ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے، دم گھٹنا محسوس ہوتا ہے، کانوں میں سائیں سائیں ہوتی ہے اور دن میں تارے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے یہ عجیب و غریب علامات سن کر چھ ماہ تک اس مریض کا علاج کرنے کی کوشش کی لیکن آخر کار اسے یہ کہہ کر جواب دے دیا کہ اس مرض کا کوئی علاج نہیں اور اب وہ فقط ایک ماہ کا مہمان ہے۔ مریض یہ سن کر شروع میں تو پریشان ہوا لیکن پھر اس نے سوچا کہ یہ ایک ماہ عیش و عشرت میں بسر کرنا چاہیے لہذا سب سے پہلے وہ نئے کپڑے سلوانے کے لیے درزی کے پاس گیا۔ جب درزی اس کے گلے کا ناپ لینے لگا تو مریض نے بڑے یقین سے کہا ”میرے کالر کا سائز سولہ ہے۔“ تاہم درزی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ناپ لیا اور اپنے شاگرد کو کالر سائز سترہ لکھنے کے لیے کہا۔ مریض نے گھور کر کہا ”میں نے سولہ سائز رکھنے کے لیے کہا



میزبان: سر یہ تو اب کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا بلکہ ہم تو شکر کرتے ہیں کہ اس خطرناک کام سے ہماری جان چھوٹ گئی ورنہ آج کل کے حالات میں رپورٹنگ کرنا تو جان جوکھوں کا کام بن گیا تھا۔ اب ہم یوں کریں گے کہ روزانہ رات نو بجے اپنے چینل کو ایک دوسرے چینل کے ”خبرنامہ“ کے ساتھ اپ لنک کر دیں گے، اللہ اللہ خیر صلاً!!!

(7 نومبر 2007ء)

پھر معافی چاہتا ہوں، اصل میں اس طرح پروگرام کرنے کی عادت ہی نہیں رہی اسی لیے بار بار ہدایات لینی پڑ رہی ہیں۔

مہمان: کوئی بات نہیں، میں بھی ہدایات لینے کو برا نہیں سمجھتا.....!!!

میزبان: جی سر! تو میں یہ پوچھنے کی جسارت کر رہا تھا کہ اگر کسی عزت مآب ایس ایچ او صاحب کے خلاف کسی شخص کو کوئی شکایت ہو تو وہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے؟

مہمان: بھئی اگر ایس ایچ او کے خلاف شکایت ہے تو اس کے ازالے کے لیے اُس شخص کو ایس ایچ او کے پاس ہی جانا چاہیے، وہ اس کی شکایت دور کر دے گا۔

میزبان: جی سر بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے..... یہ سامنے کی بات تو میرے ذہن میں ہی نہیں آئی تھی۔

مہمان: اچھا تم نے کافی سوال پوچھ لیے ہیں، اب ذرا اپنی زبان روکنا کہ میں بھی ایک آدھ سوال پوچھ لوں۔

میزبان: بالکل پوچھیں سر..... آپ کا اپنا چینل ہے، جو چاہے پوچھیں۔

مہمان: ہوں..... تو یہ بتاؤ کہ آج کل تمہارے چینل کے دیگر پروگراموں کا کیا شیڈول ہے؟

میزبان: سر ہم نے گزشتہ روز ہی اپنے پروگراموں کا ایک نیا شیڈول جاری کیا ہے جس کے مطابق ہمارے پرائم ٹائم میں تین پروگرام ہوا کریں گے۔ ایک پروگرام کسان بھائیوں کے متعلق ہوگا جس میں انہیں اپنی فصلوں کو سنڈیوں سے بچانے کے طریقے بتائے جائیں گے، دوسرا پروگرام عوام کی شکایات اور ان کے مسائل کے حل کے متعلق ہوگا جس میں دکھایا جائے گا کہ گلیاں، محلے، نالیاں، کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے متعلق مسائل کس طرح حل کیے جاتے ہیں، جبکہ تیسرا پروگرام کھیل کود اور تفریح سے متعلق ہوگا جس میں لوگوں کو کھیل ہی کھیل میں دلچسپ معلومات فراہم کی جائیں گی اور بیش قیمت انعامات بھی دیے جائیں گے۔

مہمان: بہت خوب..... بھئی یہ شیڈول تو بہت اچھا ہے مگر اس میں ہم لوگوں کی کوریج شامل نہیں، لیکن خیر کوئی بات نہیں میں تم لوگوں کی آزادی میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم لوگ خبریں کس طرح نشر کرو گے؟

ہیں ”صاحبو! 1975 میں پورے ملک میں 163 سینما تھے جن میں سے 51 سینما صرف لاہور میں تھے۔ آج پورے ملک میں صرف 71 سینما بچے ہیں جبکہ باقی 92 سینما ہاؤسز میں سے 68 کی جگہ پلازے، 15 کی جگہ تھیٹر اور 9 کی جگہ پارکنگ لاٹ بن چکے ہیں۔ 80ء کی دہائی میں ریلیز ہونے والی فلم ”مولا جٹ“ پر صرف تین لاکھ روپے لاگت آئی تھی جبکہ اس فلم نے 50 لاکھ سے بھی زائد کاربنس کیا تھا۔ آج کل ایک فلم کی لاگت تقریباً 75 لاکھ سے ایک کروڑ روپے تک آتی ہے اور اس کے پیسہ پورا کرنے کے امکانات 50 فیصد سے بھی کم ہیں اور وجہ ہے سینما ہاؤسز کی تعداد میں کمی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت ملک میں گھر گھر کیبل لگی ہوئی ہے، پورے ملک میں ساٹھ ہزار پانچ سو چوراسی کیبل آپریٹرز ہیں جنہوں نے آگے دو کروڑ بیاسی لاکھ تین ہزار پانچ سو نو نوے کنکشن دیے ہوئے ہیں۔ یہ کیبل آپریٹرز ہفتے نئی ریلیز ہونے والی بھارتی فلمیں دکھاتے ہیں۔ اب جبکہ لوگوں کو گھر بیٹھے نئی فلمیں، ڈرامے اور لاتعداد چینل صرف دو سو روپے ماہانہ میں دیکھنے کو مل رہے ہیں تو کوئی ڈھائی سو روپے کی ٹکٹ خرچ کر کے ”مجاجن“ دیکھنے کیوں جائے گا؟؟؟“

اب بتائیے کہ کون مائی کا لعل ان صاحب کے اعداد و شمار کو چیلنج کرنے کی ہمت کرے گا، شائد پیرا بھی آپ کو یہ اعداد و شمار نہیں دے سکتا، لیکن آفرین ہے ان صاحب پر جو گفتگو کے آخر میں بلا کھٹکے کہہ دیں گے کہ انہوں نے یہ تمام ”فلرز“ پیرا سے حاصل کیے ہیں!!!

2۔ ڈرامے بازی :

ان لوگوں سے متاثر ہونے کی دوسری وجہ ان کا ڈرامائی انداز بیان ہے یعنی یہ سادہ سے سادہ بات بھی ایک فرضی سچویشن بنا کر سناتے ہیں جس کی وجہ سے سننے والا مبہوت رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ ان سے پوچھ بیٹھے ہیں کہ ان کے پاس ائزگن کیوں ہے تو وہ کچھ اس قسم کی داستان بیان کریں گے۔ ”یار یہ ائزگن نہیں بلکہ ایک کلاسیک قسم کی جرمن بندوق ہے اور اس کے پیچھے ایک بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ اصل میں جن دنوں میں افریقہ کے جنگلوں میں شکار کھیل رہا تھا انہی دنوں وہاں ایک عرب شہزادہ بھی شکار کھیلنے آیا ہوا تھا۔ اتفاق سے میں نے شیر کا شکار اسی کی موجودگی میں کیا اور ظاہر ہے کہ وہ یہ منظر دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے مجھ سے اپنی بندوق بدل لی اور یوں ہم ”بندوق بھائی“ بن گئے اور یہ اسی شہزادے کی دی ہوئی بندوق ہے۔“

## کیسے کیسے لوگ!!!

کسی دانا کا قول ہے کہ لوگ آپ کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ لوگوں کو آپ اپنے بارے میں بتاتے ہیں۔ کیا زبردست بات ہے لیکن بعض لوگ اس کیے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے بارے میں کچھ ایسی باتیں مشہور کر دیتے ہیں کہ دوسرے ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ چالاک لوگ اپنے بارے میں باتیں کچھ اس ہوشیاری سے پھیلاتے ہیں کہ دوسروں کو یہ بالکل سچ معلوم ہوتی ہیں تاہم واضح رہے کہ یہ عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایسا کرنے والے عموماً تھوڑے بہت مشہور ضرور ہوتے ہیں اور اسی لیے دوسرے لوگ ان کی باتوں پر جلدی یقین کر لیتے ہیں۔ میں نے ذرا سی محنت کے بعد ایسے لوگوں میں موجود چند مشترک نشانیاں تلاش کی ہیں جو مفاد عامہ کے لیے نیچے بیان کی جا رہی ہیں۔

1۔ اعداد و شمار کا استعمال :

ایسے لوگوں کی پہلی نشانی اعداد و شمار کا بے تکان استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کے پاس صحیح معلومات اور اعداد و شمار ہوتے ہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اعداد و شمار سے کھیلنا جانتے ہیں اور انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ عام آدمی اعداد و شمار سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک محفل جمی ہوئی ہے جہاں پاکستانی سینما کی زبوں حالی پر گرما گرم بحث زوروں پر ہے۔ ایسے میں ایک صاحب گلا کھکار کر حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور نہایت پرسکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں فرماتے

جانتے ہیں مثلاً یہ کسی نہ کسی طرح آپ کو بتانے کی کوشش کریں گے کہ ان کے پاس ”لیپ ٹاپ“ بلکہ ”لیپ ٹاپ کمپیوٹر“ ہے اور وہ اسے استعمال کرنا بھی جانتے ہیں۔ اسی طرح اگر کبھی آپ سے ان کی ملاقات ہو جائے تو چھوٹے ہی کافی کی فرمائش کریں گے چاہے دل ”ستو“ پیٹنے کو ہی کیوں نہ چاہ رہا ہو۔ اور اگر کبھی آپ نے غلطی سے کہہ دیا کہ کافی کڑوی ہوتی ہے تو قہقہہ لگا کر جواب دیں گے ”میاں اس کا taste develop کرنا پڑتا ہے، اب تمہیں چونکہ عادت نہیں اس لیے تم بے شک چار چچ چینی ڈال لینا مگر میری کافی without sugar ہونی چاہیے۔“

اسی طرح اگر ان کا تعلق کسی ایسے شعبے سے ہے جس کی بدولت انہیں کسی نہ کسی طرح چار لوگ جانتے ہیں تو پھر یہ آپ کو بتائیں گے کہ انہیں روزانہ سینکڑوں ای میلز موصول ہوتی ہیں (جن میں سے آدھی خواتین کی ہوتی ہیں اور باقی ان لوگوں کی جو موصوف کی اصول پسندی سے متاثر ہیں) یا جہاں کہیں بھی یہ جاتے ہیں، لوگ انہیں عموماً پہچان لیتے ہیں اور پھر آٹو گراف لیے بغیر جان نہیں چھوڑتے۔ ایک اور ضمنی سی بات جو ان لوگوں میں مشترک ہے کہ یہ غیر محسوس طریقے سے اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ انہیں اعلیٰ شخصیات کے اکثر فون آتے رہتے ہیں مگر یہ انہیں کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ تاہم یہ بات بتاتے وقت وہ خاص طور سے فون کرنے والے کا پورا نام، عہدہ، فون کرنے کا دن اور وقت تک بتاتے ہیں تاکہ سننے والا ان کی بات پر ایمان لائے بغیر نہ رہ سکے۔ ظاہر ہے کہ اس تفصیل کے بعد ان سے متاثر ہونے میں ہی عافیت ہے۔

میں بھی ان تمام ”عافیت زدہ“ عام انسانوں میں شامل ہوں جو ایسے لوگوں سے متاثر ہو جاتے ہیں لیکن اگر آپ ان عام انسانوں کے گروہ سے نکل کر اُس گروہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں جو لوگوں کو متاثر کرنے کا فن جانتا ہے تو فقط اوپر بیان کیے گئے طریقوں پر عمل پیرا ہو کر دیکھیں، لوگ آپ سے بھی متاثر ہونا شروع کر دیں گے۔ آخر یہ سولہ کروڑ آبادی کا ملک ہے، اپنے حصے کے چاہنے والے آپ کو بھی تو ملنے چاہئیں!!!

(4 دسمبر 2007ء)

ایسے لوگ میٹرک بھی ڈرامائی انداز میں کرتے ہیں اور ان کی شادی بھی ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے، حتیٰ کہ ان کے بچے بھی ڈرامائی انداز میں ہوتے ہیں!!!  
3۔ افسانوی کردار:

ان لوگوں کی تیسری خصوصیت اپنے آپ کو ایک افسانوی کردار کے طور پر پیش کرنا ہے۔ مثلاً باتوں باتوں میں یہ آپ کو چند ایسے قصے سنا دیں گے جن سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ بیک وقت دنیا کی مختلف قومیتوں کی تقریباً ایک درجن سے زائد حسین لڑکیاں ان پر مرتی ہیں مگر انہیں ان لڑکیوں کی کوئی خاص پرواہ نہیں۔ بقول ان کے، یہ لڑکیاں انہیں ”ورلڈ ٹور“ کے دوران مختلف ممالک میں ملیں اور پھر ان صاحب کی گرویدہ ہو گئیں۔ ایسے لوگوں کی اپنی شکل تو عموماً واجبی سی ہوتی ہے یعنی گنجاسر، گہرا ساناوا رنگ، عمر چالیس سے اوپر اور خوبصورت سی توند۔ مگر جب یہ ان لڑکیوں کے حسن کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ان میں سے کوئی بھی ”کیٹ ولسٹ“ سے کم نہیں ہوتی!!! حقیقت میں چاہے انہیں اپنے گاؤں کی بشیراں بھی لفٹ نہ کراتی ہو مگر آپ کے سامنے وہ ہمیشہ اپنی گرل فرینڈ کا ذکر اس کا ”نک نیم“ لے کر ہی کریں گے اور ظاہر ہے کہ آپ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

4۔ اپنی بڑائی بیان کرنے کا فن:

ان لوگوں کے اس فن کا تو میں بھی دلدادہ ہوں یعنی اپنی بڑائی بیان کرنا مگر اس انداز کے ساتھ کہ دوسرا شخص خواہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنے لگے۔ مثلاً دوران گفتگو ان لوگوں کے منہ سے آپ کو وقفے وقفے سے کچھ ایسے فقرے سننے کو ملیں گے:

”بس جناب میں نے تو کبھی غرور ہی نہیں کیا لیکن ایک بات فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ کبھی اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا..... آپ کو تو پتا ہے حضور کہ میں نے ایک دفعہ بھری محفل میں اُس وقت کے حاکم اعلیٰ کے منہ پر کہا تھا کہ وہ باطل ہے اور ہم حق پر ہیں..... بس جی کیا بتائیں سچی بات کہنا کوئی آسان کام نہیں، اسی لیے آج نہیں تو کل آپ مجھ سے جیل میں ہی ملیں گے مگر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں..... وغیرہ وغیرہ۔“ اب ذرا سوچئے کہ ایسے شخص سے متاثر ہوئے بغیر کیونکر رہا جائے جو اس قدر اعتماد کے ساتھ بلند بانگ دعوے کرتا ہے۔

5۔ چند ضمنی باتیں:

یہ وہ باتیں ہیں جو کم وبیش ایسے تمام لوگوں میں مشترک ہیں جو دوسروں کو متاثر کرنا خوب

محدود نہیں ہے بلکہ یہ لوگ ایک ہی ہفتے میں اے سی سے ہیٹر تک سوچ کر لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر چند روز پہلے تک ان کے گھر یا دفتر میں اے سی استعمال ہوتا تھا تو تھوڑے ہی دنوں کے وقفے کے بعد یہ لوگ ہیٹر جلانا شروع کر دیتے ہیں۔ شاید اقبال نے انہی لوگوں کے لیے کہا تھا..... ”یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے۔“

ایسی ہی سخت سردیوں کی راتوں میں میرا ایک دوست مجھ سے ملنے آیا تو اس نے باریک سی قمیض کے اوپر چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی جیسے بعض ماڈرن خواتین تنگ قمیض کے اوپر دوپٹہ لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ موصوف میں ان خواتین جیسی تو کوئی ”خوبی“ نہیں تھی لہذا اس حلقے میں وہ صرف مشکوک ہی نظر آئے کیونکہ چادر اوڑھنے کا یہ انداز یقیناً سردی سے بچاؤ کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے دوست سے کوئی گفتگو شروع کرتا، اس نے مجھ سے فریج کا ٹھنڈا پانی پینے کے لیے مانگا۔ پانی پلانے کے بعد میں نے احتیاطاً پنکھے کے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے مجھے اشارے سے منع کر دیا جس کے بعد میں نے اسے ایک مخلصانہ مشورہ دیا کہ سردی سے بچنے کے لیے وہ چادر سے اپنے آپ کو صحیح طرح ڈھانپ لے، میری بات سن کر وہ مرد آہن مسکرایا اور بولا ”جب صحیح طرح سردی لگے گی تب چادر بھی صحیح طرح لے لوں گا۔“ واضح رہے کہ اس رات لاہور میں درجہ حرارت تقریباً 3 ڈگری سینٹی گریڈ ریکارڈ کیا گیا تھا۔

حلقے یہ تو لاہور کی بات تھی جہاں پچھلے سال درجہ حرارت ایک ڈگری تک بھی پہنچ گیا تھا اور تمام تر ماحولیاتی آلودگی کے باوجود اب بھی لاہور میں ٹھیک ٹھاک سردی پڑتی ہے تاہم یہ اور بات ہے کہ اس سردی کا دورانیہ کچھ کم ہو گیا ہے۔ سردیوں کے حوالے سے تھائی لینڈ کے لوگ کافی مظلوم ہیں کیونکہ وہاں سردی تقریباً نہ ہونے کے برابر پڑتی ہے جبکہ تھائی لوگوں کو سردیاں منانے کا بہت شوق ہے۔ ان کے شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نومبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی بنکاک کے ڈپارٹمنٹل سٹور سردیوں کے کپڑوں سے بھر جاتے ہیں اور جابجا Winter collection کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ لوگ ادنیٰ کپڑے خریدتے ہیں بلکہ انہیں پہن کر ایسے باہر نکلتے ہیں جیسے کسی بھی وقت برف باری شروع ہو سکتی ہے جبکہ حقیقت میں ان کے گھر اور دفتر میں اے سی چل رہے ہوتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ ”موسمی انتہا پسندی“ صرف ہمارا ہی نہیں تھائی لینڈ کا بھی مسئلہ ہے۔

## موسمی انتہا پسند

ہم لوگ موسم کی تبدیلی کو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ سردیوں کو ہی لے لیجئے، جب سے سردیاں شروع ہوئی ہیں ہمیشہ کی طرح اس سال بھی لوگوں نے گرم کپڑوں کا استعمال دیر سے شروع کیا ہے۔ سردیوں کے شروع کے دنوں میں تو ہم لوگ اسی ٹمخے میں رہتے ہیں کہ سوئٹر پہنا جائے یا نہیں؟ بلکہ کچھ لوگ تو جب تک دوسروں کو سوئٹر پہننے نہ دیکھ لیں تب تک خود سوئٹر نہیں پہنتے چاہے سردی سے ان کی قلفی ہی کیوں نہ جم جائے! اور کچھ حضرات ایسے ”سوئٹر زدہ“ لوگوں کو تضحیک آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ ”میاں! ابھی سے سوئٹر پہن لیا، ابھی سردی شروع کہاں ہوئی ہے۔“ ایسے حضرات عموماً اس طرح کے تبصرے آدھی بازوؤں والی ٹی شرٹ پہن کر کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہیں سردی نہیں لگتی کیونکہ سردی تو ہر ذی شعور اور نارمل صحت مند انسان کو سردیوں کے موسم میں لگتی ہی ہے۔ تبصرہ کرنے والے یہ لوگ غالباً یہ جتنا چاہتے ہیں کہ ان میں بڑی مردانگی ہے، اب ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی مردانگی کو جانچنے کے لیے کسی ”حقیقی ٹیسٹ“ کا انتظام تو نہیں کیا جاسکتا تاہم اگر ہم انہی کے اپنائے ہوئے معیار کو ہی پیمانہ سمجھ لیں تو بھی ایسے لوگ ”مردانگی“ پر پورے نہیں اترتے کیونکہ سردیوں کے ایک دن اگر انہوں نے ٹی شرٹ پہنی ہوتی ہے تو کوئی بعید نہیں کہ اگلے روز یہی لوگ آپ کو ادنیٰ جیسٹر میں ملبوس نظر آئیں۔ میں ایسے لوگوں کو ”موسمی انتہا پسند“ کہتا ہوں۔

ایسے لوگوں کی ”انتہا پسندی“ صرف ٹی شرٹ سے جیسٹر تک جب لگانے تک ہی

گے.....واللہ عالم بالصواب!!!

جہاں تک خواتین کا تعلق ہے تو میرے خیال میں سردیاں انہیں سوٹ ہی نہیں کرتیں کیونکہ سردیوں میں وہ اُس آزادی کے ساتھ سوٹ نہیں پہن سکتیں جس آزادی کے ساتھ گرمی میں پہنا جاسکتا ہے، تاہم یہاں بھی کچھ ایسی بے خوف خواتین کا ذکر کرنا ضروری ہے جو سردی کی کسی بھی شدت کی پرواہ کیے بغیر ”Sleeve less“ پہن لیتی ہیں۔ خدا ان خواتین کے حوصلے بلند ہی رکھے اور ہمیں صبر کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ بے شک صابر کے لیے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔

سردیوں کا ایک اور منظر جو میں نے پچھلے دنوں ہی دیکھا، کافی سبق آموز تھا۔ ایک شخص جس کے بدن پر سردی سے بچنے کے لیے ناکافی کپڑے تھے، کسی پارٹی کا بینراؤڑھے ہوئے فذانی سٹیڈیم کے آگے چلا جا رہا تھا۔ آج کل کے حالات میں شائد بینروں کا اس سے زیادہ موزوں استعمال نہیں ہو سکتا!!!

(15 دسمبر 2007ء)

ہمارے ہاں سردیوں کے دیگر فوائد کے علاوہ دو ایسے فائدے بھی ہیں جن کے تذکرے کے بغیر بات مکمل نہیں ہو سکتی۔ اول ڈرائی فروٹ اور دوئم شادیاں۔ میرے خیال میں ڈرائی فروٹ پسند کرنے کے بارے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں، تاہم ڈرائی فروٹ کو دو قسموں میں ضرور تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک قسم کے ”ڈرائی فروٹ“ میں ملوک، ریوڑیاں اور مونگ پھلیاں وغیرہ آتی ہیں جبکہ دوسری قسم کے ڈرائی فروٹ میں جسے میں ”جینون ڈرائی فروٹ“ کہتا ہوں، کاجو، چھلے ہوئے اخروٹ، میٹھی کشش، امریکن بادام اور پستہ وغیرہ شامل ہیں۔ اول الذکر ڈرائی فروٹ ہمارا سفید پوش طبقہ کھا کر خوش ہو جاتا ہے جبکہ موخر الذکر صرف خوشحال لوگ ہی انورڈ کر سکتے ہیں۔

جہاں تک شادیوں کا تعلق ہے تو ممکن ہے شادی شدہ لوگ اسے سردیوں کا کسی بھی قسم کا فائدہ سمجھنے سے ہی انکار کر دیں تاہم یہاں شادیوں کے ذکر سے ایسے لوگوں کی دل آزاری ہرگز مقصود نہیں بلکہ شادیوں سے یہاں مراد ہنی مون ہے اور ظاہر ہے کہ بیزار سے بیزار شخص بھی کم از کم اپنے ہنی مون کو ضرور انجوائے کرتا ہے لیکن نہیں..... ٹھہریے.....!!! میرا خیال ہے کہ کچھ کیسوں میں یہ بھی ممکن نہیں اور ایسے کیس یقیناً بہت مظلوم ہوتے ہیں، گذشتہ سال میرا ایک عزیز ہنی مون منانے کی غرض سے مری گیا، واپسی پر میں نے اُس سے رسماً پوچھا کہ اس کا ہنی مون کیسا رہا، تو اس نے جل کر جواب دیا ”کیا خاک ہنی مون تھا..... میرے ساتھ میرے ابا، اماں، بڑی بہن اور اس کا خاوند اور ان کے دس اور بارہ سال کے دولڑکے تھے۔ اب بتاؤ اس ”لشکر“ کے ساتھ میں کیا خاک ہنی مون مناتا!!!“ جیسا کہ میں نے کہا ایسے لوگ واقعی بہت مظلوم ہوتے ہیں۔

سردیوں کے صرف فائدے ہی نہیں بلکہ کچھ نقصانات بھی ہیں اور ”متوازن تجزئے“ کی خاطر میں صرف ایسے دو نقصانات کا یہاں ذکر کروں گا۔ ایک نقصان موٹر سائیکل سواروں کا ہوتا ہے اور دوسرا خواتین کا۔ سردیوں میں موٹر سائیکل سوار اپنے آپ کو جتنا مرضی ڈھانپ لیں، کہیں نہ کہیں سے ٹھنڈی ہوا ان کے جسم کے کسی حصے کو ضرور لگتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ حصہ ان کے باقی وجود کو کاٹ ہی ڈالے گا۔ مجھے ایسے موٹر سائیکل سواروں سے دلی ہمدردی ہے تاہم میں نے کچھ ایسے اشخاص بھی دیکھے ہیں جو محض ایک واجبی سوسوٹر پہنے موٹر سائیکل پر اڑے جا رہے ہوتے ہیں، یقیناً وہ ”جینون ڈرائی فروٹ“ کھاتے ہوں



کے بکروں کا پروپیگنڈہ ہے کہ ہمیں ”من حیث البکر“ کسی غیر ملکی بیوپاری کے ہاتھوں بیچا جا چکا ہے۔ میں ان بکرا دشمن عناصر کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ عام بکروں میں اس قسم کی گمراہ کن خبریں نہ پھیلائیں ورنہ ان سے اپنی ٹانگوں سے پٹنا جائے گا!

یہاں میں ایک وارننگ قصائیوں کو بھی دینا چاہتا ہوں کہ قربانی کرتے ہوئے بعض اوقات قصائی حضرات نہایت بے دردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کچھ قصائیوں کی چھریاں تیز نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے بکروں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے تمام قصائیوں کو چاہیے کہ قربانی سے پہلے اپنی چھریاں تیز کروالیں تاکہ بکروں کی کھال اتارتے وقت انہیں (بکروں کو) کوئی تکلیف نہ ہو۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ کھال جیسے بھی اترے، تکلیف تو ہوتی ہے!!!

میرے عزیز ہم بکرو! ہم نے غربت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اب آپ کو کوئی غریب بکرا نظر نہیں آتا۔ چونکہ غریب بکرے سستے داموں مل جاتے تھے اس لیے ہم نے ایسے تمام سستے بکرے ختم کر دیئے ہیں جس سے ایک طرف تو غربت کا خاتمہ ہو گیا ہے اور دوسری طرف بکروں کی مارکیٹ ویلیو میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سے ہماری بکرا انڈسٹری میں بھی تیزی آئی ہے اور معیشت بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئی ہے۔ بکرا انڈسٹری کے ساتھ ساتھ یہاں فلم انڈسٹری کا ذکر کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ہماری فلم انڈسٹری ایک مرتبہ پھر پڑی پر چڑھ چکی ہے۔ میں یہاں ان تمام لبرل اور پروگریسو بکروں اور بکریوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے اس کام میں میری مدد کی اور ساتھ ہی ان انتہا پسند بکروں کو تنبیہ بھی کروں گا جو ہمارے اس مشن میں روٹے اٹکانا چاہتے ہیں۔ میں انہیں بتادینا چاہتا ہوں کہ وہ ناکام ہوں گے اور ہم کامیاب!!!

میرے عزیز ہم بکرو! قربانی کے دنوں میں اخبارات اور ٹی وی چینلز میں ہمیں بے حد تشویش کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اخبارات میں طرح طرح کے کارٹون چھاپے جاتے ہیں اور ٹی وی پر چلنے والے پروگراموں، خصوصاً ڈراموں اور خاکوں میں ہمارا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کارٹونوں، ڈراموں اور خاکوں میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی بلکہ ہر سال وہی گھسی پٹی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ جیسے قصائی کا بوری میں نوٹ بھر کر لے جانا، افسروں کے گھر بکروں کی رانیں بھجوانا، چھوٹے بکروں کو تشویش کا نشانہ بنانا، قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے کا مقابلہ دکھانا وغیرہ وغیرہ۔ میڈیا کو ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے تمام

## ”میرے عزیز ہم بکرو.....!!!“

میرے عزیز ہم بکرو! ہر مرتبہ کی طرح اس مرتبہ بھی میں نے مناسب سمجھا کہ قربانی کے موقع پر آپ سے خطاب کروں اور اہم معاملات پر آپ کو اعتماد میں لوں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہم نے بکروں کی فلاح و بہبود کے جتنے کام کئے ہیں، وہ اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کئے۔ بکریوں کو ہی لے لیجئے، ہم نے بکریوں کے حقوق تحفظ کے لیے قانون بنایا تاکہ انہیں بد قماش بکروں سے بچایا جاسکے۔ اس قانون کے تحت اب بکریاں جہاں جانا چاہیں جاسکتی ہیں، بغیر کسی روک ٹوک کے آزادانہ گھوم پھر سکتی ہیں اور اپنی مرضی کے کسی بھی بکرے کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اگر وہ چاہیں تو کچھ عرصے کے بعد بکرا بدل بھی سکتی ہیں! آپ جانتے ہیں کہ یہ سہولت اس سے پہلے صرف بکروں کو ہی حاصل تھی۔ اسی طرح اگر کوئی بکرا کسی بکری کو بری نظروں سے دیکھتا ہے تو اسی قانون کے تحت اس بے ہودہ بکرے کو سزا دی جاسکتی ہے تاہم اگر متعلقہ بکری کو کسی بکرے کی نظریں بری نہ لگیں تو اس قانون کا اطلاق نہیں ہوگا!!!

میرے عزیز ہم بکرو! سابقہ ادوار میں ہمارے بیوپاری ہمیں نہایت ارزاں قیمتوں پر ہمیں بیچتے رہے ہیں لیکن اب ”بکرا پہلے“ کی پالیسی کے تحت ہم نے اس فیچ روایت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب کوئی بھی بیوپاری کسی بھی بکرے کو اس کی مرضی سے کم قیمت پر نہیں بیچ سکتا۔ اس پالیسی کے تحت ہم نے بکروں کی ایک کم سے کم قیمت فروخت کا تعین بھی کر دیا ہے تاکہ عام بکروں کا استحصال نہ ہو سکے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کچھ ناخلف قسم

## یہ ”تنقید“ نہیں آساں.....!!!

مجھے تنقید کرنا بالکل پسند نہیں لیکن بعض اوقات اگر کسی مسئلے پر میں اپنی رائے دوں تو یار لوگ اسے تنقید سمجھ لیتے ہیں۔ ویسے تو تنقید کو دنیا کا آسان ترین کام سمجھا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں آج کل constructive criticism کی جو اصطلاح ایجاد کی گئی ہے وہ اس آسان کام کو مشکل بنانے کے لیے ہے۔ (یوں بھی جب تک آپ کسی آسان کام کو مشکل نہیں بنا دیتے، آپ کی صلاحیتوں پر شک ہی کیا جاتا ہے!) گوکہ میری تنقید سے لوگ خوش نہیں ہوتے مگر میں کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر اپنی دو ٹوک رائے کا اظہار ضرور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑے سے بڑے آدمی میں بھی خامیاں ہوتی ہیں اور اگر میں ان خامیوں کی نشاندہی کر دی جائے تو کوئی غلط بات نہیں۔ نصرت فتح علی خان صاحب کو ہی لے لیجئے۔ مرحوم 1992ء کے ورلڈ کپ سے پہلے بھی ویسے ہی گاتے تھے جیسے انہوں نے اس کے بعد گایا لیکن بعد میں قوم نے بھیڑ چال کے انداز میں انہیں اپنے سر پر بٹھا لیا۔ میرے خیال میں ان کی آواز میں جادو تو دور کی بات ہے کوئی ”زنانہ پہلوان“ گاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب آپ جس سے بھی پوچھیں کہ آپ کا پسندیدہ گلوکار کون ہے تو جواب آئے گا ”نصرت فتح علی خان“۔ ویسے مجھ سے اگر کوئی پوچھے تو میں ان کا نام لینے کی بجائے کسی اور بہتر گلوکار کا نام لینا پسند کروں گا۔ ویسے میں خود بھی خاصا اچھا گانا گا لیتا ہوں اور عنقریب میری اپنی کیسٹ بھی مارکیٹ میں آنے والی ہے! اب شاعری کی بات کرتے ہیں۔ جسے دیکھو منہ اٹھا کر غالب کو بہترین شاعر قرار دے دیتا ہے۔ خدا کے بندو، پہلے غالب کی شاعری تو پڑھ لو پھر اس پر بات

پروگراموں کے لیے ایک ضابطہ اخلاق بنا کر اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر میڈیا نے اس ذمہ داری کا مظاہر کیا تو ٹھیک ہے ورنہ ہم کسی قسم کے نتائج کے ذمہ دار نہیں!!!

میرے عزیز ہم بکرو! میں نے ہمیشہ آپ کا مفاد عزیز رکھا ہے۔ آپ کا مفاد ہی اصل میں میرا مفاد ہے تاہم کچھ شریپند بکرے اکثر اس بات کو غلط رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور قربانی کا بکرا بننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ میں ایسے تمام شریپند بکروں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایسے عناصر کو خلفشار پھیلانے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ ان بکرا دشمن عناصر کا یہ پروپیگنڈہ کہ عام بکروں سے قربانی مانگنے کی بجائے مجھے خود قربانی کے لیے آگے آنا چاہیے۔ بالکل بکواس ہے اور کسی کو اس پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے عناصر کو اس بات کی سمجھ نہیں ہے کہ اگر میں قربان ہو گیا تو بکروں کا کیا بنے گا؟ ان کے حقوق کی حفاظت کون کرے گا؟ انہیں تحفظ کون دے گا؟ لہذا عام بکروں کو تحفظ دینے کے لیے ضروری ہے کہ مجھے تحفظ دیا جائے، اسی میں سب کی بقا ہے ہماری زندگیوں میں قربانی کے یہ تین دن ہی مشکل ہیں، گوکہ انسانوں کے لیے یہ دن عید کا درجہ رکھتے ہیں تاہم ہم بکرے ان دنوں ایمر جنسی کی حالت میں رہتے ہیں لیکن شکر ہے کہ یہ حالت تین دنوں کے بعد ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہر طرف ہریالی ہوگی، چارہ ہوگا، صحت مند اور خوشحال بکرے اور بکریاں ہوں گی لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہوگا اگر ہم ”بکرا پہلے“ کی پالیسی کو اپنائیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ سب ایسا ہی کریں گے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

(20 دسمبر 2007ء)

لا کر اپنے کام میں بہتری پیدا کرتے رہتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان لیڈران اور ان کے رفقاء کو کچھ خاص لفٹ نہیں کرواتا کیونکہ میں ان خرافات کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتا۔ عالمی حالات کے ساتھ ساتھ میری نظر کھیلوں پر بھی رہتی ہے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، بیڈمنٹن غرضیکہ تمام کھیلوں اور ان کے کھلاڑیوں کے بارے میں اپنی ایک ناقدانہ رائے رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں برائن لارا ایک عام سا بلے باز ہے کیونکہ بہترین بلے باز وہ ہوتا ہے جو آپ کو میچ جتوا سکے جبکہ لارا میں یہ خوبی نہیں اور اوپر سے اس کا رنگ بھی خاصا کالا ہے! اسی طرح فرانس کے فٹ بالرز لیڈان نے ورلڈکپ میں اپنے مخالف کھلاڑی کو پیٹ میں ٹکر مار کر ایک چھچھوری حرکت کی اور شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی ورنہ اس سے پہلے لیڈان کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاکی میں لوگ خواخواہ حسن سردار کو ایک لیجنڈ قرار دیتے ہیں جبکہ میں سکول کے زمانے میں اپنی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا اور حسن سردار سے کہیں زیادہ اچھی ہاکی کھیلتا تھا!!! میں جب اپنے ارد گرد ایسے لوگوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو میرے کڑے معیار پر پورا اتر سکے لیکن الحمد للہ جب میں اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہوں تو میری یہ کوفت خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے کیونکہ اپنی تمام تر کسر نفسی کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ مجھ میں کوئی خرابی یا خامی موجود نہیں۔ اہل نظر اور مردم شناس لوگ جو مجھے جانتے ہیں وہ مجھے ایک ”قیمتی متاع“ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہزاروں سال نرگس نے اپنی بے نوری پہ رونے کے بعد چمن میں جو دیدہ در پیدا کیا ہے، وہ میں ہوں۔ میں ان لوگوں پر اپنی رائے ٹھونسنا نہیں چاہتا بلکہ ان کی رائے کا احترام کرتا ہوں اور میرے بارے میں ان دانا لوگوں کی رائے یہ ہے کہ آج کل کے حالات میں ملک و قوم کے اس قیمتی سرمایے کی حفاظت بے حد ضروری ہے۔ ہمارا ملک اب مزید کسی ایسے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ خدا نہیں خوش رکھے، میں اب ایسے لوگوں پر کیا تنقید کروں؟؟؟

(8 جنوری 2008ء)

بھی کر لینا اور جو لوگ غالب کا ڈھائی چھٹانک کا دیوان پڑھ لیتے ہیں وہ تو بالکل ہی حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور غالب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ پھر میرے جیسے شخص سے رہا نہیں جاتا اور میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ شاعری کس چڑیا کا نام ہے، اچھا شاعر کون ہوتا ہے اور غالب کا شاعری میں کیا مقام ہے؟ میں انہیں بتاتا ہوں کہ غالب زیادہ سے زیادہ ایک اچھا مزاحیہ شاعر تھا کیونکہ اس کے اکثر مشہور شعر طنز و مزاح سے بھر پور ہیں مثلاً

میں نے کہا کہ ”بزم ناز چاہیے غیر سے، تہی“

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ ”یوں؟“

اس شعر میں بھی غالب نے محض اپنی ”بڑتی“ کی روداد سنائی ہے لیکن مزاح کی داد تو بہر حال دینی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ غالب پر اس قسم کی بے لاگ رائے سننے کے بعد لوگ مجھ سے میرے پسندیدہ شاعر کے بارے میں پوچھتے ہیں لیکن میں جواباً چپ ہو جاتا ہوں اور اگر کوئی زیادہ اصرار کرے تو اسے کچھ عرصہ انتظار کرنے کے لیے کہتا ہوں کیونکہ مجھے خود بھی شاعری سے شغف ہے اور میری شاعری کی کتاب بھی جلد بازار میں آنے والی ہے!

ہمارے ہاں کچھ جذباتی قسم کے لوگوں کو اس ملک سے بھی بے تکاسم کا پیار ہے، انہیں اس وطن کی مٹی سے خوشبو آتی ہے (اس بات کی مجھے تو آج تک سمجھ نہیں آ سکی) انہیں لگتا ہے کہ شمالی علاقہ جات جیسی خوبصورتی دنیا میں کہیں اور نہیں (شاید انہوں نے سوئٹزر لینڈ نہیں دیکھا) انہیں کراچی جیسا میٹروپولیٹن شہر بھی کوئی نہیں لگتا حالانکہ صرف جنوبی ایشیا میں اس سے بڑے کئی شہر موجود ہیں اور اس مثل کا تو جواب ہی نہیں کہ ”جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا“ اب ان جہلاء کو کون سمجھائے کہ دنیا میں ایسے کروڑوں بلکہ اربوں انسان ہیں جو لاہور دیکھے بغیر نہ صرف پیدا ہوئے بلکہ آگے بھی دھڑا دھڑ بچے پیدا کر رہے ہیں!!! میری ان باتوں کو اگر لوگ تنقید سمجھتے ہیں تو بے شک سمجھیں، میں سچی بات کہنے سے باز نہیں آؤں گا۔ ملکی حالات کے ساتھ ساتھ میری نظر عالمی لیڈران اور ان کی پالیسیوں پر بھی رہتی ہے۔ صدر بش سے عراق میں کہاں چوک ہوئی، کوئٹہ راکس نے کون سا مشورہ غلط دیا، گورڈن براؤن کو برطانیہ کا وزیر اعظم بننے کے بعد پہلے کام کیا کرنا چاہیے تھا، ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کو سفارت کاری کے کس شعبے میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ میں اپنے تنقیدی مضامین میں ان لیڈران کو مشورے دیتا رہتا ہوں جنہیں وہ گاہے بگاہے بروئے کار

ایک مرد عاقل نے میری یہ مشکل آسان کر دی اور مجھے سمجھایا کہ ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول میں ”فیورٹ“ کا ایک بٹن ہوتا ہے جس کے ذریعے آپ اپنے پسندیدہ چینل ایسے سٹور کر لیتے ہیں کہ بار بار اس چینل کا نمبر یاد رکھ کر دبانا نہیں پڑتا۔ جب سے اس مسئلے کا حل پتا چلا ہے، میں اپنے آپ ایک مرتبہ پھر ”نارل“ محسوس کر رہا ہوں ورنہ اس سے پہلے مجھے لگتا تھا کہ ٹینشن کی وجہ سے میں بلڈ پریشر کا مریض بن جاؤں گا۔

آج کل شدید سردی کا موسم ہے اور اس موسم میں ڈرائیونگ بہت مشکل ہوتی ہے، خصوصاً رات کے وقت جب آپ کو ونڈسکرین کے باہر کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت میں مجھے بار بار کیڑے سے سکرین صاف کرنی پڑتی تھی لیکن اس خطرناک مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ اس مسئلے نے بھی کافی عرصہ تک میری زندگی کو پریشان کئے رکھا لیکن پھر ایک دن ایک سمجھدار خاتون نے مجھے اس پریشانی سے باہر نکالا اور سمجھایا کہ گاڑی میں لگے بیڑ کی ناب کو ایسے ایڈجسٹ کیا جاتا ہے کہ ونڈسکرین چند سیکنڈز میں خود بخود صاف ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ تجربہ کر کے دیکھا جو بے حد کامیاب رہا اور میری زندگی پرسکون ہو گئی، مجھے اس ذہنی اذیت سے نجات مل گئی جو اس مسئلے کی وجہ سے میرے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔

میری زندگی کا ایک اور بڑا مسئلہ چائے ہے۔ میں صرف اچھی اور کرک چائے پی سکتا ہوں اور اگر چائے اچھی نہ بنی ہو تو مجھے ٹینشن شروع ہو جاتی ہے۔ دفتر میں اپنے چپڑاسی کو میں نے کئی مرتبہ سمجھایا ہے کہ چائے بنانے کے لئے صرف خاص پاؤڈر کا دودھ اور ٹی بیگ استعمال کئے جائیں لیکن اس کے باوجود چائے میں وہ ذائقہ نہیں آتا۔ قریب تھا کہ یہ مسئلہ بھی مجھے ایک ذہنی مریض بنا دیتا، میرے ایک کولیگ نے مجھے مشورہ دیا کہ اچھی چائے کے لیے ضروری ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے قہوے کو ”دم“ پر رکھا جائے جس کا طریقہ یہ ہے کہ کپ میں گرم پانی اور ٹی بیگ ڈال کر تھوڑی دیر کے لیے کپ کو پرچ سے ڈھک دیں اور پھر اس میں دودھ ملا کر چائے بنیں، ذائقہ، رنگ اور خوشبو، تینوں زبردست ہوں گے! میں نے یہ حرکت کر کے دیکھی ہے اور واقعی اس سے چائے اچھی بنتی ہے۔ شکر ہے کہ میرا یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا!

جیسا کہ میں نے شروع میں ذکر کیا کہ میری زندگی بڑے بڑے مسائل میں گھری رہتی ہے لیکن الحمد للہ میں ان مسائل کا پامردی سے مقابلہ کرتا ہوں ان کا حل نکالتا ہوں

## ریفریشر کورس

میری زندگی آج کل بڑے بڑے مسائل میں گھری ہوئی ہے اور بعض اوقات مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں ان مسائل کا کیا حل کروں؟ ان مسائل کی وجہ سے میں کبھی کبھی شدید تناؤ کا شکار ہو جاتا ہوں اور تب تک نارل نہیں جب تک کوئی اللہ کا بندہ مجھے مسئلہ کا حل نہیں بتا دیتا۔ مثلاً اکثر اوقات جب میں اپنے موبائل فون سے ایس۔ایم۔ایس بھیجتا ہوں تو مجھے پتہ نہیں چلتا کہ وہ ایس۔ایم۔ایس مطلوبہ فون تک پہنچی ہے کہ نہیں اور میں تب تک ٹینس رہتا ہوں جب تک مجھے میرے ایس۔ایم۔ایس کا جواب نہیں مل جاتا اور اگر یہ جواب کئی گھنٹوں تک نہ ملے تو میں گھنٹوں ٹینشن میں رہتا ہوں۔ وہ تو بھلا ہو میرے ایک دوست کا جس نے مجھے بتایا کہ موبائل فون میں ایس۔ایم۔ایس کی ”ڈیلیوری رپورٹ“ کا بھی ایک آپشن ہوتا ہے اور اگر ہم اس آپشن کو ”اوکے“ کر دیں تو ہر پیغام بھیجنے کے بعد ہمیں اس پیغام کی رپورٹ خود بخود موصول ہو جائے گی۔ جب بھی مجھے اس طرح اپنے مسئلے کے حل کا پتہ چلتا ہے میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں لیکن میری یہ کیفیت زیادہ دن تک جاری نہیں رہتی کیونکہ میں جلد ہی کسی اور بڑے مسئلے کا شکار ہو جاتا ہوں۔ ایک اور مسئلہ جس نے پچھلے دنوں میری زندگی اجیرن کئے رکھی تھی یہ تھا کہ ٹی وی پر اپنے پسندیدہ چینل کیسے سٹور کئے جاتے ہیں؟ اکثر ایسا ہوتا کہ ٹی وی پر بیک وقت دو تین چینلز پر آپ کے پسندیدہ پروگرام چل رہے ہوتے ہیں اور آپ کا دل کرتا ہے کہ انہی چینلز کو بار بار بدل کر دیکھا جائے۔ لیکن ہر مرتبہ چینل تبدیل کرنے کے لئے ان کا نمبر یاد رکھنا پڑتا تھا جو میرے لئے سخت ذہنی کوفت کا باعث بنتا تھا۔ یہاں بھی

## مردوں کی عمریں

عورتوں کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی عمر چھپاتی ہیں یا عمر سے کم لگنے کی کوشش کرتی ہیں تاہم میرے خیال میں یہ بات بہت سے مردوں پر بھی صادق آتی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مرد اگر اپنی عمر گھٹا کر بیان نہیں کر سکتا تو پھر اپنے سے کم عمر لوگوں کو اپنی ”ایچ گروپ“ کا ثابت کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ بخش اکرم کو ہی لے لیجئے، میرے ملنے والے ہیں اور جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ کم از کم 50 سال کے ضرور ہوں گے۔ پچھلے دنوں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے یونہی کہہ دیا کہ اکرم صاحب، ماشاء اللہ آج کل آپ کی صحت بہت اچھی ہوئی ہے (دوسرے لفظوں میں یہ کہ جناب کی توند پہلے سے زیادہ نکلی ہوئی ہے)۔ موصوف یہ سن کر زرب لب مسکرائے اور فرمانے لگے ”یار! آج کل آپ کی بھابھی نے مجھے ناشتے میں مکھن اور دیسی گھی کا پراٹھا دینا شروع کیا ہوا ہے لہذا صحت تو اپنے آپ اچھی ہوگی!!!“ واضح رہے کہ جس عورت کو یہ ”آپ کی بھابھی“ کہہ رہے ہیں ان کی خاتون کی عمر لگ بھگ 48 سال ہے اور ایک محتاط کیلکولیشن کے مطابق وہ ”آئی“ یا زیادہ سے زیادہ ”آپا“ تو ہو سکتی ہے لیکن ”آپ کی بھابھی“ نہیں ہو سکتی! بہر حال اللہ بخش اکرم جیسے لوگ آپ سے اس قسم کا رشتہ جوڑ کر اپنے آپ کو اپنے سے کئی سال کم عمر لوگوں کے ساتھ بریکٹ کر کے اپنی دل کی تسلی کا سامان تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن آپ دل ہی دل میں تمللاتے رہتے ہیں۔

اسی قسم کے لوگوں کی ایک دوسری قسم بھی ہے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ آپ کو بے حد

اور انہیں اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیتا۔ یقیناً یہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ میرے مسائل (جن کا ذکر میں نے اوپر کی سطور میں کیا ہے) اس نوعیت کے ہیں جو زندگی کو تناؤ کا شکار کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جب میں ایسے لوگوں کو دیکھتا ہوں جو نہایت معمولی معاملات کو ہوا بنا دیتے ہیں اور اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔ اصل میں ایسے لوگ اندر سے بے حد کمزور دل کے مالک ہوتے ہیں اور ان کا دل چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی بم دھماکے میں پچاس لوگ مر جائیں تو ان کمزور دل لوگوں کی شکلیں دیکھنے والی ہوتی ہیں۔ یہ اس طرح رنجیدہ ہو جاتے ہیں جیسے مرنے والے ان کے عزیز تھے۔ اسی طرح اگر کوئی ان کے سامنے ملک ٹوٹنے کی پیش گوئی کرے تو یہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جیسے کوئی ملک نہیں بلکہ ان کے گھر کو توڑنے کی بات کر رہا ہو۔ یہ لوگ ہر وقت ایسے ہی چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھے رہتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ میں ایسے لوگوں کی حرکتیں دیکھ کر دل میں ہنستا ہوں اور سوچتا ہوں کہ خدا نے انہیں کس قدر کم حوصلہ عطا کیا ہے۔ ایک میں ہوں جو دنیا جہان کے مسائل سے نبرہ آزما ہو رہا ہوں اور ایک یہ لوگ ہیں جو کسی مسئلے سے باہر ہی نہیں نکل پاتے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایسے لوگوں کے لئے ایک ”ریفریشر کورس“ کا اہتمام کروں جس میں ان لوگوں کو اس بات کی تربیت دوں کہ ہر مسئلے کو سر پر سوار نہیں کرنا چاہیے بلکہ مسئلے کو سر سے جھٹک کر آگے چلنا چاہیے۔ اس ”ریفریشر کورس“ کے بعد یہ کمزور دل لوگ بھی میری طرح ”رف اینڈ ٹف“ ہو جائیں گے اور پھر ہر خبر کے بعد کچھ یوں react کریں گے:

خبر: کراچی میں دھماکہ، 150 افراد ہلاک، 700 زخمی۔

رنیکشن: دم والی (چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے) اوہو! ویری سیڈ!

خبر: لاہور، جی پی او چوک میں دھماکہ، 27 افراد ہلاک، 50 زخمی۔

رنیکشن: ارے ایک اور دھماکہ!!! کتنے مرے؟؟؟

خبر: سانحہ راولپنڈی کے بعد ملک توڑنے کی سازش جاری ہے۔

رنیکشن: (قبضہ لگاتے ہوئے) ہمیں کیا، ہماری تو کینیڈا کی امیگریشن ہو گئی ہے!!!

خبر: امریکہ نے عراق اور افغانستان میں چار لاکھ بے گناہ افراد قتل کئے۔

رنیکشن: ذرا چینل تبدیل کرنا، آسٹریلیا اور انڈیا کا ٹیسٹ میچ لگا ہوگا!!!



اس ضمن میں آخری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو بظاہر نہایت بھولپن مگر ڈھٹائی کے ساتھ اپنے آپ کو کم عمر ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ”شاہ جی! آپ کی عمر کتنی ہے؟“ تو جواب ملے گا ”پتا نہیں یار، ہوگی یہی کوئی 35/40 سال“۔ واضح رہے کہ شاہ جی کی ایک بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اور دوسرا بیٹا ایم۔ بی۔ اے۔ کرنے کے بعد بنک میں ملازم ہے۔

ان تمام لوگوں کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی عمر بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ خواہ مخواہ ان کی عزت کریں۔ مثلاً وہ ”بابے“ جو 70 کے پیٹے میں ہیں، اپنے آپ کو نہایت اطمینان کے ساتھ 90 سال کا بتاتے ہیں تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ ایک لمبی اور صحت مند زندگی گزار رہے ہیں اور اب بھی ”جوان“ ہیں۔ نہ جانے کیوں ایسے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے۔ راہ راہ چلتے ہوئے ایک عورت کی نظر ایک بوڑھے شخص پر پڑی جو نہایت سکون کے ساتھ اپنے لان میں بیٹھا راکنگ چئیر پر جھول رہا تھا۔ اس عورت سے رہا نہ گیا اور وہ پوچھ بیٹھی کہ ”آپ کی اس لمبی اور خوشحال زندگی کا کیا راز ہے؟“ اس شخص نے جواب دیا ”میں دن میں تین پیکٹ سگریٹ پیتا ہوں، ایک بوتل وہسکی کی ختم کرتا ہوں، مرغن غذائیں کھاتا ہوں اور ورزش بالکل نہیں کرتا۔“ عورت یہ سن کر سخت حیران ہوئی اور بولی ”کمال ہے!!! آپ کی عمر کتنی ہے؟“ اس شخص نے اطمینان سے جواب دیا ”26 سال!!!“

ایک نوجوان سے باتوں باتوں میں فلموں کا ذکر چھڑ گیا۔ بحث کا نقطہ یہ تھا کہ کیا آج کل کی فلمیں پرانی فلموں سے بہتر ہیں؟ جب گفتگو کچھ طول پکڑنے لگی تو اچانک وہ نوجوان بولا ”سر! ایسے یہ تو بتائیں کہ آپ آج کل کی فلمیں کن کو کہہ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ ”آج کل کی فلمیں وہی ہیں جو ہمارے تمہارے دور کی ہیں جیسے ”قیامت سے قیامت تک“ وغیرہ وغیرہ“۔ میری بات سن کر وہ کھڑا ہو گیا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا ”سر! یہ آپ کے دور کی فلمیں تو ہو سکتی ہیں لیکن ہمارے دور کی نہیں، خدا حافظ۔“

(5 فروری 2008ء)

پرانے واقعات کے حوالے کچھ اس طرح دیتے ہیں جیسے ان کے ساتھ ساتھ آپ بھی اس دور میں جوان تھے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب سے کسی شادی پر ملاقات ہوئی اور پھر جیسا ہوتا ہے کہ گفتگو پانچ منٹ کے اندر اندر سیاست کے متعلق شروع ہو گئی۔ فرمانے لگے ”بھئی مشرقی پاکستان کا سانحہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا اور یقیناً آپ اس وقت اپنے ہوش میں ہوں گے اور آپ کو یاد ہوگا کہ کیسے بی بی سی نے اپنی خبروں میں .....!!!“ میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ”معاف فرمائیے گا سر! میں اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے مجھے اتنی تفصیلات کا علم نہیں البتہ اس موضوع پر کچھ کتابیں ضرور پڑھی ہیں۔“ میری بات سن کر موصوف ایک دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے ”آپ کو تو یاد ہوگا یا پھر اس وقت پورے مغربی پاکستان میں میں ہی واحد زندہ پیدا شدہ انسان تھا!!!“

ان صاحب کی چڑچڑاہٹ سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان کو بعض اوقات اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا کس قدر دکھ ہوتا ہے۔ انہی سے ملتے جلتے لوگوں کی ایک مثال اور بھی ہے۔ یہ لوگ آپ کو اپنے دور کی پرانی فلموں کا حوالہ یوں دیتے ہیں جیسے آپ بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ ایک دفعہ ایسے ہی کسی عزیز سے گفتگو ہوئی تو میں نے کہا ”جناب ہم کہتے ہیں کہ پرانی فلمیں اچھی تھیں لیکن میں نے وحید مراد، رانی وغیرہ کی چند پرانی فلمیں دیکھیں ہیں، مجھے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔“ میری بات سن کر انہوں نے خستگیوں نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر گویا ہوئے ”یار، یہ فلمیں کب سے پرانی ہو گئیں، یہ تو ”ہمارے دور“ کی فلمیں ہیں۔ پرانی فلمیں تو سنوٹش، صبیحہ وغیرہ کی ہیں۔“

کچھ چالاک لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو آپ کو اپنی عمر کے ساتھ بریکٹ کرنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن پھر بھی نہایت غیر محسوس طریقے سے اپنی عمر کو دس، پندرہ سال گھٹا کر بیان کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ دوران گفتگو اچانک آپ کو مربیانہ انداز میں ٹوکیں گے اور کہیں گے ”یار! آخر تم سے چار پانچ سال بڑا ہوں، کچھ تو لحاظ کرو۔“ اب اس انداز گفتگو کے بعد آپ سوچ میں پڑ جائیں گے کہ آیا واقعی ان کا لحاظ کیا جائے یا پھر محض ”چار پانچ سال“ کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر ان کے سر پر ایک عدد چیت رسید کر کے کہا جائے ”کیوں اوئے، تو مجھ سے چار پانچ سال کب سے بڑا ہو گیا؟ یا نہیں، ہم نے کالج میں ایک ساتھ ایف۔ ایس۔ سی۔ میں داخلہ لیا تھا!!!“۔

بات کی وجہ سے کہ انہیں کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں، ان ڈاکٹروں کو پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا۔“

”کمال ہے! ویسے یہ بات میرے علم میں نہیں۔“ میرے دوست نے کہا۔  
 ”ظاہر ہے..... آخر تم بھی تو پاگلوں کے ڈاکٹر ہونا، پاگلوں کا کچھ اثر تو لو گے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنی بات جاری رکھی ”خیر تو پھر ان لوگوں نے پاگل خانے میں اپنی ریسرچ کا باقاعدہ آغاز کیا اور ایک مریض کی طرح رہنے لگے۔ تاہم یہ لوگ پاگل خانے میں جو کچھ بھی دیکھتے اسے ہاتھ روم میں جا کر اپنی ڈائری پر نوٹ کر لیتے۔ پاگل خانے میں قیام کے دوران ان ڈاکٹروں پر چند حیرت انگیز حقائق کا انکشاف ہوا۔“

”اچھا..... وہ کیا؟؟؟“ میرے دوست نے چونک کر پوچھا۔  
 ”بتاتا ہوں بچے..... صبر کرو!!!“ میں نے رک کر پانی کا گلاس پیا۔ ”سب سے پہلی بات جو ان ماہرین نفسیات نے نوٹ کی کہ نرسیں مریضوں کے پاس کم اور ڈاکٹروں کے پاس زیادہ وقت گزارتی تھیں۔“

”ویسے یہ تو کوئی بری بات نہیں۔“ میرے ڈاکٹر دوست نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔  
 ”جی بالکل بری بات نہیں۔“ میں نے جل کر جواب دیا ”مگر ایک اور بات جو انہوں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ جب بھی پاگل خانے کا نچلا عملہ مریضوں کو ”پھینٹی“ لگاتا اور مریض اس بات کی شکایت ڈاکٹروں سے کرتے تو عملے کے لوگ ڈاکٹروں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے کہ یہ تو پاگل ہیں، ان کی بات کا کیسے یقین کیا جاسکتا ہے اور ڈاکٹر ز یہ تاویل سن کر بالکل مطمئن ہو جاتے۔“

”ہوں.....“ میرے دوست نے ہنکارہ بھرا ”آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟“  
 ”بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”جب ان ریسرچ کرنے والے نفسیات دانوں نے دیکھا کہ ان کی باتوں پر کوئی کان نہیں دھرتا اور ان کی کسی حرکت کا نوٹس نہیں لیا جاتا تو انہوں نے چھپ کر نوٹس لینے کی بجائے سب کے سامنے بیٹھ کر نوٹس لینے شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ بھی بہت حیرت انگیز نکلا اور وہ یہ کہ پاگل خانے کی فائلوں میں ان ”پاگلوں“ کے بارے میں یہ ریمارکس لکھ دیے گئے کہ Patients are indulged in writing behaviour (مریض لکھنے کے پاگل پن کا شکار ہے) یعنی دوسرے لفظوں میں ان کے لکھنے کو بھی پاگل پن کی ایک علامت ہی سمجھا گیا۔“

## ایک نمبر پاگل

میں پچھلے ایک گھنٹے سے پاگل خانے میں بیٹھا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پاگل خانے کا ڈاکٹر میرا دوست تھا۔ اس کا دفتر پاگل خانے کا واحد کمرہ تھا جس کے دروازے پر کچھ نارل لگے رہے تھے۔ ہم دونوں پاگلوں کے علاج پر زور و شور سے بحث کر رہے تھے اور میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ آج کل پاگلوں کا باقاعدہ علاج نہیں کیا جاتا بلکہ انہیں محض سکون آور ادویات دے کر ٹر خا دیا جاتا ہے جبکہ میرا ڈاکٹر دوست اس بات پر مصر تھا کہ یہ ادویات پاگلوں کے علاج کے لیے بہت ضروری ہوتی ہیں اور ان کے استعمال کے بغیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی علاج کا تصور نہیں۔  
 ”تم ترقی یافتہ ممالک کی تو بات ہی چھوڑ دو“ میں نے کہا ”ضروری نہیں کہ اگر ان ممالک میں کوئی بات غلط ہو رہی ہو تو وہ محض اس لیے مان لی جائے کہ ان پر ترقی یافتہ ممالک کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔“

”لیکن ان ادویات کے بغیر.....“ میرے دوست نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا کیونکہ بحث جیتنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ مد مقابل کو نہ بولنے دیں چاہے وہ آپ کا دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ ”شائد تمہارے علم میں ہو کہ 1970 کے اوائل میں امریکہ میں ڈاکٹروں کے ایک گروپ نے بہت دلچسپ قسم کی ریسرچ کی۔ یہ ڈاکٹر، جو کہ خود ماہر نفسیات تھے، ایک پاگل خانے میں گئے اور وہاں جا کر فقط اتنا سا مسئلہ بیان کیا کہ انہیں کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان ڈاکٹروں نے تمام باتیں بالکل نارل انداز میں کیں۔ تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ محض اس ایک

تعارف کروایا اور مجھ سے کہا ”یہ ہیں ذیشان صاحب، کافی عرصے سے ہمارے پاس رہ رہے ہیں اور شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی ہیں۔“

”اچھا.....“ میں نے مرعوب ہو کر ذیشان کی طرف دیکھا۔ تاہم ذیشان نے حقارت سے سر کو جنبش دی۔ کچھ دیر تک میں پوری توجہ سے اس امید پر ذیشان سے گفتگو کرتا رہا کہ شاید کہیں سے اس کے پاگل پن کی کوئی علامت نظر آجائے لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگنے لگا کہ وہ بھی اسی امید پر مجھ سے گفتگو کر رہا ہے، یہ خیال آتے ہی میں نے گفتگو فوراً ختم کر دی۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر نے بھی ذیشان کو چڑاسی کے ساتھ نہایت عزت سے واپس روانہ کر دیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے شدید حیرت سے پوچھا۔ ”یار یہ شخص تو بالکل نارمل لگ رہا تھا۔“

ڈاکٹر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا۔ ”یہی تو بات ہے، میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ تم کتابی باتیں کر رہے ہو جبکہ حقیقت میں پاگل ایسا ہوتا ہے۔“

”آخر اس میں پاگلوں والی کون سی بات ہے؟“ میری حیرت میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ”غور سے سنو۔“ میرے دوست نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص شطرنج کا نہایت شاطر کھلاڑی ہے، کھیل شروع کرتے وقت یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمام قواعد و ضوابط کے مطابق کھیل کھیلے گا، لیکن اگر قواعد اس کی جیت کی راہ میں حائل ہو رہے ہوں یا بازی اس کے خلاف جاری ہو تو پھر یہ سب قاعدے قانون بالائے طاق رکھ کر اپنی مرضی کی چالیں چلنا شروع کر دیتا ہے، ایسے میں اگر اس کا مخالف اعتراض کرے تو سخت غصے میں آ کر نہ صرف پوری بساط اٹھا کر دوسرے کے منہ پر دے مارتا ہے بلکہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لمحے اس کا پاگل پن عروج پر پہنچ جاتا ہے اور اس پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ہمارے پاگل خانے کا بھی بہت نقصان کرتا ہے۔ اب بتاؤ کیا ایسے شخص کو پاگل نہ کہا جائے؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ایسے شخص کو صرف پاگل نہیں بلکہ ”ایک نمبر پاگل“ کہنا چاہیے!!!“

(22 فروری 2008ء)

”میرا سوال اب بھی وہی ہے، آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے اکتا کر پوچھا۔ ”جناب من! میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ حقیقت میں کوئی بھی شخص پاگل نہیں ہوتا بلکہ اسے پاگل بنایا جاتا ہے۔ پہلے اسے اس کے گھر والے پاگل کہتے ہیں، پھر ڈاکٹر اسے پاگل قرار دیتے ہیں اور آخر پورا معاشرہ انہیں پاگل تسلیم کر لیتا ہے۔ تم لوگ ذہنی مرض کے شکار کسی بھی شخص کو محض سکون آور ادویات دے کر روانہ کر دیتے ہو جو وقتی طور پر تو اس کے ذہنی تناؤ میں کمی کر دیتی ہیں لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔ یعنی تم اس کی ٹینشن کی بنیادی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور.....“

”یہ غلط ہے!!!“ میرے دوست نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ”ہم نہ صرف اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس کا باقاعدہ علاج بھی کرتے ہیں۔“

”جی جناب! میں جانتا ہوں جتنا آپ علاج کرتے ہیں، آپ مریض کو یہ کہہ کر رخصت کر دیتے ہیں کہ خوش رہا کرو، ٹینشن نہ لیا کرو..... وغیرہ وغیرہ۔ بھلا بتاؤ کوئی جان بوجھ کر بھی ٹینشن لیتا ہے۔ تم لوگ صرف اسے مہنگی سے مہنگی ادویات استعمال کراتے ہو تا کہ تمہارے ساتھ ساتھ ملٹی نیشنل کمپنیوں کا بھی کاروبار چلتا رہے۔“

”تم صرف اپنی قابلیت جھانڈنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ بالآخر میرے ڈاکٹر دوست نے زنج ہوتے ہوئے کہا، حالانکہ کسی کو یونہی پاگل قرار نہیں دیا جاسکتا۔“

”اچھا یہ بات ہے تو چلو یہ بتاؤ کہ کیا تم پاگل ہو؟“

”بالکل نہیں۔“ میرے دوست نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن ہر پاگل تو یہی کہتا ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے، اس لیے ثابت ہوا کہ تم پاگل ہو..... اور اگر تم یہ کہو کہ ہاں میں پاگل ہوں تو پھر تمہارے پاگل پن میں شبے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔“ ”یہ تو سوفسطائیوں والی دلیل ہوئی جس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔“ میرے دوست نے تمل کر کہا۔ ”یہ سب کتابی باتیں ہیں، میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے نے بیل دی اور اپنے چڑاسی کو کہا کہ فلاں پاگل کو لے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک خوش شکل شخص چڑاسی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور مجھ سے مصافحہ کر کے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا جو مجھے کہیں سے بھی ”پاگل“ نہیں لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے میری اندرونی کیفیت بھانپتے ہوئے اس ”پاگل“ سے میرا

حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کی ٹیم کے جس رکن سے بھی ہماری بات ہوئی ہے اس کا یہی کہنا ہے کہ وہ کوچ کے منہ پر کہتا تھا کہ اس کی پالیسیاں غلط ہیں تاہم یہ تمام باتیں غالباً آپ لوگوں نے اپنے خوابوں میں کی تھیں کیونکہ اُن دنوں تو آپ میں سے ہر کوئی کوچ کی خوشامد کرنے میں بازی لے جانے کا خواہشمند تھا۔“

”باقی لوگوں کا تو پتا نہیں لیکن اپنے بارے میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بباگ دہل ان پالیسیوں کی مخالفت کی تھی۔“

”ممکن ہے آپ ٹھیک ہوں لیکن ہمارے پاس اس وقت کی بہت سی ایسی وڈیوز موجود ہیں جن میں آپ اپنے کوچ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے نظر آ رہے ہیں کہ ایسا شخص کرکٹ کی پوری تاریخ میں نہیں آیا اور.....“

”چھوڑیں جی! ان وڈیوز میں کیا رکھا ہے، آپ آج کی بات کریں، آپ نے مجھ سے ہارنے کی وجہ پوچھی تھی۔ وہ میں نے کھل کر بیان کر دی ہے۔“

”اچھا یہ بتائیے وہ کون سی پالیسیاں تھیں جن کی وجہ سے آپ میچ ہارے؟“

”ساری پالیسیاں تو آپ کے سامنے ہے..... اب آپ میرا منہ کیوں کھلوانا چاہتے ہیں۔“

”اس لیے جناب کہ آپ کا منہ کھلے گا تو بات بنے گی۔ ویسے اُن دنوں تو جب بھی آپ کا منہ

کھلتا تھا، کوچ کے لیے تحسین و آفریں کے ڈوگرے برسانے کے لیے ہی کھلتا تھا۔“

”نہیں جی نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں ہماری پالیسیاں ہمارے پرستاروں کی خواہشات کے برخلاف تھیں۔“

”کمال ہے..... تو پھر وہ کس کے حق میں تھیں۔“

”اصل میں وہ پالیسیاں کچھ غیر ملکی بکیوں کے حق میں تھیں جنہوں نے ہماری ٹیم پر کروڑوں روپے کا جواء لگایا ہوا تھا۔“

”اور آپ کے کوچ ان بکیوں کے حق میں تھے، اور آپ اپنے کوچ کے حق میں..... یہی کہنا چاہ رہے ہیں ناں آپ؟“

”دیکھیں جی! اپنے الفاظ میرے منہ میں نہ ڈالیں، میں تو اُس وقت بھی کوچ کو سمجھاتا رہا کہ ایسا نہ کرو ہم میچ ہار جائیں گے مگر آپ کو تو پتا ہے کہ وہ کوچ کسی کی بات نہیں سنتا۔“

”لیکن محترم یہ تو فرمائیے کہ یہ باتیں آپ کوچ کو کہاں سمجھاتے رہے ہیں کیونکہ ہم نے تو جب

## ہارا ہوا کھلاڑی

”ناظرین! آج ہم نے جس مہمان کو اپنے پروگرام میں دعوت دی ہے وہ آپ کی جانی پہچانی شخصیت ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں، ہمارے مہمان ایک کرکٹ ٹیم کے نہایت ہی اہم رکن رہے ہیں لیکن حالیہ دنوں میں اس ٹیم کو پے در پے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے، آئیے ان سے بات کرتے ہیں۔ السلام علیکم جناب!!!“

”وعلیکم السلام!“

”محترم سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ کی ٹیم کی حالیہ ناکامی کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ہماری ٹیم کے کوچ اور کپتان ہماری شکست کے ذمہ دار ہیں۔“

”جناب کپتان کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر کوچ کیسے ذمہ دار ہو گیا، وہ تو آپ کے

ساتھ گراؤنڈ میں آ کر نہیں کھیلتا۔“

”ہاں ٹھیک ہے! لیکن ہمارا کوچ گراؤنڈ میں موجود نہ ہونے کے باوجود بھی ایک ایک حرکت ہمیں dictate کرواتا تھا۔ ہم نے وہی کیا جو اس نے کہا..... اور اسی لیے ہمارے گئے۔“

”لیکن اُس وقت تو آپ اس کوچ کے بڑے گن گاتے تھے، آج آپ کہہ رہے ہیں کہ وہی آپ کی شکست کا ذمہ دار ہے۔“

”دیکھیں جی! میں تو اُس وقت بھی کھل کر کہتا تھا کہ ہم جو کر رہے ہیں غلط کر رہے ہیں مگر کسی نے کان ہی نہیں دھرا۔“

”اچھا!!! حیرت کی بات ہے کیونکہ آپ تو ٹیم کے بہت اہم رکن تھے اور اس سے بھی زیادہ

لیگ کے لیے نہیں کھیل سکتے۔“

”لیکن جناب موجودہ ٹیم میں آنے سے پہلے آپ بھی تو کسی اور کرکٹ لیگ کے لیے کھیلتے تھے اور اب اگر کوئی دوبارہ اُس کرکٹ لیگ میں جانا چاہ رہا ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟“

”اعتراض یہ ہے کہ کرکٹ لیگ والوں نے باقی کھلاڑیوں کی تو ٹھیک ٹھاک بولی لگائی ہے لیکن میرا کوئی مل ہی نہیں لگایا۔“

”کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ اب آپ ایک ہارے ہوئے کھلاڑی ہیں؟“

”میں ہارا ضرور ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کرکٹ چھوڑ دوں گا، میں ٹیم میں واپس آنے کی پوری کوشش کروں گا خواہ اس کے لیے مجھے نئے کوچ کی مٹیں ہی کیوں نہ کرنی پڑیں۔“

”کیا مطلب؟ کیا آپ کی ٹیم کا موجودہ کوچ تبدیل ہو رہا ہے؟“

”بس اب میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا، میرے تھوڑے کبے کو بہت جانیں، میری پیشین گوئیوں میں معافی تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔“

”معاف کیجئے گا محترم! لیکن آپ اپنی ٹیم میں تو جگہ بنا نہیں سکے، دوسروں کے بارے میں پیشین گوئیاں کیسے کر سکتے ہیں؟“

”اصل میں میری پیشین گوئیاں دوسروں کے بارے میں ہمیشہ ٹھیک ثابت ہوتی ہیں اسی لیے میں آج کل یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ کرکٹ چھوڑ کر باقاعدہ نجومی کیوں نہ بن جاؤں!“

”تو فرمائیے کہ بطور نجومی آپ آئندہ ٹیم کے حالات کے بارے میں کیا پیش گوئی کریں گے؟“

”میری پیشین گوئی یہ ہے کہ موجودہ ٹیم کا کوچ اور کپتان دونوں تبدیل ہو جائیں گے اور ٹیم میں پرانے کھلاڑیوں کی جگہ نئے کھلاڑی آ جائیں گے بلکہ نئے کھلاڑیوں کی سلیکشن کر لی گئی ہے، تاہم مجھے یہ ٹیم بھی مستقبل قریب میں خاطر خواہ میچ جیتی ہوئی نظر نہیں آتی۔“

”اور محترم آپ کا اپنا مستقبل کیا ہوگا؟“

”ہارے ہوئے کھلاڑی کا مستقبل نہیں ماضی ہوتا ہے.....!“

”آپ کا بہت بہت شکریہ!!“

(26 فروری 2008ء)

بھی آپ کو اخبار یا ٹی وی میں دیکھا، آپ اپنے کوچ کی حمایت ہی کرتے ہوئے نظر آئے۔ کیا آپ اپنے کوچ سے یہ ساری باتیں باقی کھلاڑیوں کے سامنے ڈرینگ روم میں کرتے تھے؟“

”نہیں جی نہیں..... ایسی باتیں سب کے سامنے نہیں ہو سکتی تھیں..... میں یہ ساری باتیں غیر ملکی دوروں کے دوران اُس وقت کوچ کے ساتھ کرتا تھا جب وہ ”پب“ میں اکیلا بیٹھا ہوتا تھا۔“

”کیا کہا آپ نے.....“ ”پب“ میں..... یعنی جب کوچ ٹب میں اکیلا نہا رہا ہوتا تھا تو آپ.....“

”اونہیں نہیں جناب..... میں نے ”پب“ کہا ہے، ٹب نہیں.....!!!“

”اوہ..... یعنی دوسرے لفظوں میں آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے جابر سلطان کے سامنے کلمہء حق ”پب“ میں بلند کیا؟“

”اب آپ جو بھی سمجھ لیں، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کلمہء حق کہیں بھی بلند کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے جگہ کی کوئی قید نہیں۔ میں نے اکثر تنہائی میں بھی کلمہء حق بلند کیا ہے، بے شک مجھ سے قسم اٹھوا لیں۔“

”لیکن محترم تنہائی میں تو کلمہء حق بلند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں..... اور ابھی تو آپ نے کہا کہ آپ بباگ دہل کوچ کی پالیسیوں کی مخالفت کرتے تھے۔“

”ہاں تو میں اب بھی یہی کہتا ہوں..... میں پوری ٹیم کے سامنے بباگ دہل اپنے دل ہی دل میں سچ بات کرتا تھا۔“

”دل ہی دل میں کیوں؟ کیا آپ کوچ سے ڈرتے تھے؟“

”نہیں جی نہیں..... ڈرتا ورتا میں کسی سے نہیں ہوں بس ذرا سچ بات کرنے سے پہلے کوچ کے ڈنڈے کا خیال آ جاتا تھا۔“

”کیا مطلب؟ کیا کوچ ٹیم کے کھلاڑیوں کو ڈنڈے سے مارتا تھا؟“

”مارا تو کبھی نہیں تھا، لیکن کوئی پتا بھی نہیں تھا..... ویسے بھی عقلمند کے لیے ڈنڈا ہی کافی ہے۔“

”اچھا آگے آپ کا کیا پلان ہے؟ کیا آپ کی ٹیم اسی کوچ کے انڈر کھیلے گی؟“

”اس کا فیصلہ کچھ دنوں میں ہو جائے گا، ہماری ٹیم کی میٹنگ جاری ہے۔“

”سنا ہے آپ کی ٹیم کے کچھ کھلاڑی دوسری کرکٹ لیگ کے لیے کھیلنے کو بھی تیار ہیں؟ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ کچھ ہی دنوں میں آپ کی ٹیم.....“

”معافی کیجئے، آپ کے منہ میں خاک، ہم باضمیر ہیں، صرف پیسوں کی خاطر دوسری کرکٹ



نہیں بلکہ اس کے پستول کے آگے ہتھیار ڈالے تھے جو ان دنوں اُس نے نیا نیا حاصل کیا تھا۔ و  
اللہ اعلم بالصواب!!!

کالج میں داخل ہوا تو وہاں خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا اور شخصیت میں مزید ”نکھار“ پیدا  
ہو گیا۔ طبیعت میں ڈھٹائی تو پہلے ہی موجود تھی، اب اس میں کچھ کچھ بے غیرتی بھی شامل ہو  
گئی۔ اپنی کلاس فیلو لڑکیوں کو چھیڑنا اور آوازیں کسنا اس کا محبوب مشغلہ بن گیا اور جواباً لڑکیاں  
جب اسے گالیوں سے نوازتیں تو خوشی سے اس کا چہرہ تمنا اٹھتا۔ اس وقت اس کے چہرے پر  
موجود سرشاری سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوتا کہ وہ واقعی دنیا کا ڈھیٹ ترین انسان ہے۔  
اسی معتبر راوی کا کہنا ہے کہ چھیڑنے پر لڑکیوں نے ہمیشہ اسے گالیاں ہی دیں کبھی جوتی یا  
سینڈل سے تواضع نہیں کی جس کا اسے بہت رنج تھا کیونکہ ڈھٹائی کے جس اعلیٰ رتبے پر وہ  
فائز تھا وہاں اس کا خیال تھا کہ

”گالیوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں“

یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد ہمارے ہیرو کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔  
یہاں بھی اس نے اپنی ڈھٹائی کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ  
لڑکیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کلاس کے لڑکے بھی اس کی حرکتوں پر لعن طعن کرتے مگر اس  
کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اپنے دوستوں سے ادھار لے کر  
گل چھڑے اڑاتا اور جب پیسے واپس کرنے کا وقت آتا تو ہاتھ پھیلا کر مزید ادھار مانگ  
لیتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک پروفیسر سے، جو کسی زمانے میں پانچویں جماعت میں اس کے  
ساتھ پڑھتا تھا، کچھ روپے یہ کہہ کر ادھار لیے کہ مہینے کی پہلی تاریخ کو واپس کر دے گا۔ جب  
پہلی تاریخ آئی اور اس پروفیسر نے روپوں کا مطالبہ کیا تو ہمارے ہیرو نے یہ کہہ کر نہایت  
ڈھٹائی سے مزید ادھار مانگ لیا کہ ”پہلی تاریخ کو تمہیں تنخواہ ملتی ہے، مجھے نہیں لہذا تم مجھے  
مزید پانچ سو روپے عنایت کرو۔“ راوی بتاتا ہے کہ وہ اس پروفیسر سے اب بھی باقاعدگی سے  
ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو پانچ سو روپے وصول کرنے جاتا ہے۔ بے شک پروفیسر کی بیوی سے  
اسے ہر طرح کی گالیاں سننی پڑتی ہیں، لیکن اس کی ڈھٹائی میں رتی برابر بھی فرق نہیں آتا اور  
جب تک پروفیسر اسے پانچ سو روپے نہ دے وہ اس کی چوکھٹ نہیں چھوڑتا۔ و اللہ اعلم  
بالصواب!!!

## ایک ڈھیٹ انسان

یہ کہانی دنیا کے ڈھیٹ ترین انسان کی ہے۔ ٹھہریے..... میں اُس شخص کی بات نہیں کر  
رہا جو آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ میں اُس کی بات کر رہا ہوں جس کے بارے میں آپ ابھی تک  
لا علم ہیں۔ یہ شخص جب پیدا ہوا تو فقط اڑھائی پونڈ کا تھا اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ شاید یہ  
زندہ نہ بچ سکے گا لیکن شروع سے ہی یہ بڑا ڈھیٹ تھا اس لئے بچ نکلا۔ تھوڑا بڑا ہوا تو محلے کے  
بچوں کے ساتھ کھیلنا شروع کیا لیکن جلد ہی بچوں نے اسے اپنے کھیل سے نکال دیا کیونکہ وہ  
کھیل میں ”روندی“ مارتا تھا تاہم یہاں بھی اس کی ڈھٹائی کام آتی اور وہ منت سماجت کر  
کے دوبارہ کھیل میں شریک ہو جاتا۔

سکول میں داخل ہوا تو اس کی ذہنی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں یعنی خاصا نالائق  
ثابت ہوا۔ جب یہ تیسری مرتبہ پانچویں جماعت میں فیل ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے سکول  
سے نکال دیا کیونکہ نالائق ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سکول میں چوریاں بھی کرتا تھا۔ خیر، کسی  
طرح سے اس کے ماں باپ نے اسے ایک دوسرے سکول میں داخل کروا دیا اور وہاں تقریباً  
آٹھ سال لگا کر اس نے ان کی پانچ جماعتیں پاس کیں اور میٹرک میں پہنچ گیا۔ چونکہ اُسے  
اپنی ”ذہانت“ کا بخوبی اندازہ تھا اس لئے امتحان سے کچھ روز قبل وہ امتحانی بورڈ کے اعلیٰ افسر  
کے گھر دھرنادے کر بیٹھ گیا اور نہایت ڈھٹائی سے اُسے میٹرک کے پرچے میں آنے والے  
سوالات بتانے کے لئے کہا۔ پہلے تو وہ افسر نہیں مانا لیکن جب اُس نے ہمارے ہیرو کی  
ڈھٹائی دیکھی تو ہتھیار ڈال دیے۔ ایک معتبر راوی کا کہنا ہے کہ اس افسر نے اس کی ڈھٹائی

لایا۔ تاہم اینٹی کرپشن والے بھی بہت ڈھیٹ ثابت ہوئے، نہ مانے۔ بادل خواستہ ہمارے ہیرو نے معافی طلب کی اور چھٹکارے کی صورت پوچھی۔ جواباً اینٹی کرپشن والے افسر نے جیب سے اسے اپنی ”ریٹ لسٹ“ نکال کر تھادی!

پچیس سال کی نوکری کے دوران ہمارے ہیرو نے دولت بھی خوب کمائی اور ذلت بھی خوب سمیٹی۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا کہ موصوف کی شخصیت میں ڈھٹائی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لئے انہوں نے بھی زمانے کی، اپنے خیر خواہوں کی، کولیگز کی، رشتہ داروں یا دوستوں کی پرواہ نہیں کی۔ دوشادیاں کیں لیکن حسب توقع دونوں بیویوں سے نہیں بنی کیونکہ وہ ان کے حقوق پورے نہیں کر سکے۔ پہلی بیوی کا ان کے بارے میں خیال تھا کہ وہ معمولی آدمی ہیں جبکہ دوسری بیوی کا خیال اس کے الٹ تھا، وہ کہتی تھیں کہ وہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہیں۔ پہلی بیوی کا ان کے بارے میں یہ خیال بھی تھا کہ وہ کچھ جرس واقع ہوئے ہیں جبکہ دوسری بیوی کے خیال میں ان میں جز تھا نہ رس!!! موصوف نے ساری عمر کوئی بچہ پیدا نہیں کیا، فرماتے تھے کہ اگر بچہ مجھ سے زیادہ ڈھیٹ نکلا تو پیدا ہی نہ ہو سکے گا اور اگر مجھ سے کم ڈھیٹ نکلا تو میں خود اسے مار دوں گا تاہم اُسی معتبر راوی کے نزدیک بچہ نہ ہونے کی وجہ کچھ اور تھی۔ واللہ اعلم بالصواب!!!

اب موصوف کی نوکری مکمل ہونے کو ہے۔ پچیس سال کی ملازمت کے بعد بھی ہمارے ہیرو کا ملازمت چھوڑنے کا کوئی موڈ نہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ موصوف نے کسی کے مشورے پر نوکری میں تاحیات extension کی درخواست داخل کر دی ہے تاہم ہیڈ آفس والوں نے اسے ”واحیات ایکسٹینشن“ قرار دے کر داخل دفتر کر دیا ہے۔ اُن کی ڈھٹائی کے پیش نظر کسی نے انہیں امریکہ شفٹ ہونے کا مشورہ دیا ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں صرف ایک قباحت ہے کہ امریکہ میں صدر لبش کے مقابلے میں ان کی ڈھٹائی متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔

(4 مارچ 2008ء)

یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد اس نے کہیں نوکری کر لی اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا یعنی فوراً نکالا گیا۔ ایک اور نوکری کی تاہم وہاں سے فوراً نہیں نکالا گیا بلکہ دو دن بعد فارغ کیا گیا۔ چونکہ پیدائشی ڈھیٹ تھا اس لئے اس نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں بلکہ نوکریاں چھوڑتا گیا تا وقتیکہ اس کا CV خاصا بارعب ہو گیا کیونکہ اب اس میں جوتیاں گانٹھنے سے لے کر اخبار کی اپرنٹس شپ تک ہر قسم کے کام کا تجربہ شامل تھا۔ آخر ایک روز اسے ایک ایسی نوکری مل گئی جو صرف ڈھیٹ قسم کے لوگوں کو ہی سوٹ کرتی ہے یعنی سرکاری نوکری.....!!! اور پھر یہ نوکری ہمارے ہیرو کو بھی سوٹ کر گئی۔ نوکری میں آکر اس نے اپنی تمام حسرتیں پوری کیں۔ موصوف ڈھیٹ اور بے غیرت تو پہلے سے ہی تھے، اب کرپٹ بھی ہو گئے۔ شائد وہ اس سے کہیں پہلے کرپٹ ہو جاتے مگر پہلے انہیں ایسا موقع نہیں ملا تھا۔ (کرپٹ لوگ عموماً بڑے لوگ ہوتے ہیں اس لئے میں اب بصدا احترام ان کے لئے صیغہ واحد کی بجائے صیغہ جمع استعمال کروں گا)۔ ہمارا راوی بتاتا ہے کہ اُس نے..... سوری..... انہوں نے اپنے دفتر میں ایک ریٹ لسٹ آویزاں کر رکھی تھی جس میں ہر کام کے نرخ جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ جو سائل بھی ان کے پاس آتا وہ محض انگلی کے اشارے سے اسے ”ریٹ لسٹ“ کی طرف متوجہ کرتے، اگر سائل سمجھدار ہوتا تو فوراً سمجھ جاتا اور بے وقوف ہوتا تو موصوف سے بھاؤ تاؤ کرنے لگتا۔ چونکہ ہمارے ہیرو ازل سے ڈھیٹ تھے اس لئے ان کے ریٹ بھی فکس تھے اور وہ ان میں کسی قسم کی بھی کمی بیشی نہ کرتے۔ روایت ہے کہ یہ ریٹ لسٹ کچھ اس قسم کی تھی:

نرخ نامہ برائے سائلان (نافذ از یکم جولائی تا 30 جون)

- 1- فائل نکلائی۔ 1575 روپے
- 2- تصدیق دستاویز۔ ہزار روپے مع 100 روپے کا ایزی لوڈ۔
- 3- دستخط بمعہ مہر۔ پانچ سو روپے بمعہ ایک ڈبی گولڈ لیف۔
- 4- سادہ دستخط۔ 3 درجن مسمیاں/ تین کلو چونس آم (بمطابق موسم)
- 5- دفتری اوقات میں رخصت۔ حسب توفیق۔

ایک دفعہ کسی بدخواہ نے مخبری کر دی کہ ان کے دفتر میں ریٹ لسٹ لگی ہوئی ہے، اینٹی کرپشن والوں نے ریڈ کیا تو موصوف نے نہایت ڈھٹائی سے کہا کہ انہوں نے تو اپنے کلرک کو پوسٹنگ ٹرانسفر والا بورڈ لکھوانے کیلئے بھیجا تھا، وہ غلطی سے کسی پولٹری فارم پر لگا بورڈ اٹھا

سوری میں آپ کو لفٹ نہیں دے سکتا۔“ یہ سن کر اس شخص کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور وہ پرے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری چائے آگئی اور میں جلدی جلدی اس کے گھونٹ بھرنے لگا۔ جونہی میں نے چائے ختم کی، وہ شخص ایک دفعہ پھر نمودار ہوا اور بولا ”جناب میں جانتا ہوں کہ آج کل کسی کو لفٹ دینا خطرے سے خالی نہیں اور وہ بھی رات کے وقت ہائی وے پر..... لیکن آپ یقین کریں کہ میں ایک عام انسان ہوں اور اس وقت آپ کے ساتھ لاہور جانا بہت ضروری ہے کیونکہ.....“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور کہا ”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں کسی کو لفٹ نہیں دیتا اس لیے آپ میرا مزید وقت ضائع نہ کریں۔“

”ٹھیک ہے جناب! جیسے آپ کی مرضی، لیکن میں آپ کو دو نہایت اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں، ایک تو یہ کہ آپ کا رات کو اکیلے سفر کرنا بہت خطرناک ہے اور شاید اسی لیے آپ یہاں رک کر چائے پی رہے ہیں تاکہ آپ کو راستے میں نیند نہ آئے اور دوسری بات یہ کہ آپ کی گاڑی کے اگلے ٹائر کے نٹ اس قدر ڈھیلے ہیں کہ اگر آپ تھوڑی دور بھی گئے تو یہ ٹائر نکل جائے گا اور پھر.....“

یہ سن کر میں فوراً گاڑی سے باہر آیا اور ٹائر چیک کیا، اس کے دونٹ واقعی ڈھیلے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں، اجنبی نے بھی یہ محسوس کر لیا اس لیے فوراً بولا ”پریشان نہ ہوں سر! میں ابھی یہ نٹ ٹائٹ کیے دیتا ہوں، آپ مجھے اپنی ٹول کٹ دیں۔“ میں نے اسے ٹول کٹ نکال کر دی جس کی مدد سے اس نے چند لمحوں میں تمام ٹائرؤں کے نٹ کس دیے۔ ٹول کٹ واپس کر کے وہ اجنبی پھر میرے سامنے سراپا سوال بن کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے لگا کہ اس شخص کو لفٹ دینی ہی پڑے گی، اس لیے میں نے کچھ کہے بغیر اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی پھر جی ٹی روڈ پر رواں دواں تھی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ میں نے خاموشی توڑتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”چھوڑیے، نام میں کیا رکھا ہے۔ جیسا آپ کا نام، ویسا ہی میرا نام.....“

مجھے اس کے جواب پر غصہ تو آیا لیکن میں کچھ نہیں بولا۔ کار میں ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی، پھر اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”سریہ بتائیں کہ آپ کے خیال میں اگلے امریکی انتخابات میں بارک اوباما یا ہیلری کلنٹن میں سے کسے صدارتی امیدوار ہونا چاہیے؟“ یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ گفتگو کے بہانے یہ شخص اپنے کام کی تفصیلات سنانے بیٹھ جائے گا

## ہم سفر

میں اسلام آباد کلب سے لاہور واپس جانے کے لیے نکلا تو رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر میں ہمت کر کے نان سٹاپ گاڑی چلاؤں تو تین بجے تک لاہور پہنچ سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور تھوڑی دیر بعد میں جی ٹی روڈ پر تھا۔ گوجر خاں تک سفر سکون سے گزر گیا لیکن پھر اس کے بعد اچانک مجھ پر نیند نے غلبہ پانا شروع کر دیا اور مجھے ہلکی ہلکی اونگھ آنا شروع ہو گئی۔ ہائی وے پر ٹریفک چونکہ بہت زیادہ تھا اس لیے میں نے سوچا کہ مزید رسک لینے کی بجائے کہیں رک کر ”ٹرکوں والی چائے“ پی جائے تاکہ طبیعت ہشاش بشاش ہو جائے چنانچہ میں نے ایک کھوکھا دیکھ کر بریک لگائی اور کڑک چائے کا آرڈر دے کر گاڑی میں اونگھنے لگا۔ چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک شیشے پر دستک ہوئی، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے کسی نے پیر کے انگوٹھے پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ مڑ کر دیکھا تو ایک درمیانی سی عمر کا ایک خوش لباس شخص کھڑا مسکرا رہا تھا، مجھے اس کی یہ مسکراہٹ زہر لگی، میں نے شیشہ نیچے کیا تو اس کی آواز سنائی دی۔

”معاف کیجئے گا جناب! میں آپ کے آرام میں مغل ہوا۔“

اُس شخص کے ”سستعلقی“ لہجے کے باوجود میں نے بیزاری سے جواب دیا ”مغل تو آپ ضرور ہوئے ہیں لیکن پھر بھی بتائیے کیا بات ہے؟“

”آپ یقیناً لاہور جا رہے ہیں؟“ اُس نے سوالیہ انداز میں پوچھا اور میں سمجھ گیا کہ یہ شخص لفٹ لینا چاہتا ہے لہذا میں نے اُسی بیزار لہجے میں جواب دیا ”ہاں میں لاہور جا رہا ہوں لیکن

ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ ”یار یہ تو تم نے بڑی لمبی بحث چھیڑ دی ہے، اس تھیوری کو سمجھانے کے لیے تو کافی ٹائم چاہیے۔“ میں نے اسے ایک مرتبہ پھر گول مول سا جواب دے دیا اور مجھے لگا کہ وہ اس دفعہ بھی میرے جواب سے مطمئن ہو گیا ہے۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک چپ نہیں بیٹھ سکا اور ایک اور سوال داغ دیا۔ ”آپ ماشاء اللہ صاحب ذوق لگتے ہیں، آپ کے خیال میں اگر ”میں خیال ہوں کسی اور کا“ والی غزل راگ مالکوس میں کمپوز کی جاتی تو کیسا تجربہ رہتا؟ یہ سوال سن کر میں واقعی شٹٹا گیا اور قریب تھا کہ میں اس کا کوئی چھتا ہوا جواب دیتا، اُس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا..... ”سامنے دیکھئے صاحب! اُس ٹرک پر سریے لدے ہوئے ہیں۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر گاڑی کو سائڈ سے نکال کر ٹرک کو اوور ٹیک کیا۔ اگر وہ مجھے بروقت نہ بتاتا تو حادثہ یقینی تھا۔ پھر مجھے اس کا پوچھا ہوا سوال یاد آ گیا۔ ”یہ تم نے راگوں کی کیا بات کی تھی..... مجھے راگوں اور موسیقی کا کوئی زیادہ علم نہیں۔“

”آپ کس نفسی سے کام لے رہے ہیں، خیر آپ نہیں بتانا چاہتے تو دوسری بات ہے۔“ میں نے کوئی جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ لاہور فقط چند کلومیٹر دور رہ گیا تھا، صبح کے تین بجنے والے تھے اور اب میرا مزید گفتگو کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ گاڑی نے راوی کا پل کراس کیا تو مجھے اپنے ہم سفر کا خیال آیا، میں نے ساتھ والی نشست پر نظر ڈالی اور میرے پیروں تلے زمین نکل گئی، سیٹ خالی تھی!!! میں نے جلدی سے گاڑی کو سائڈ پر روکا اور تیزی سے پوری گاڑی پر نظر دوڑائی، مگر اس میں کوئی نہیں تھا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میری نظر سامنے ڈیش بورڈ پر پڑی جہاں Special Theory of Relativity کی کتاب پڑی تھی جو میں نے اسلام آباد کے ایک بک سنٹر سے خریدی تھی۔ بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں لپکا اور میں نے گاڑی کی ٹیپ آن کی، فوراً ہی گانا شروع ہو گیا ”میں خیال ہوں کسی اور کا، مجھے سوچتا کوئی اور ہے۔“ مجھے یاد آ گیا..... گوجر خاں کے جس ہوٹل پر میں چائے کے لیے رکا تھا وہاں میں نے ڈیش بورڈ سے یہ کیسٹ سننے کے لیے نکالی تھی۔ میں نے تیزی سے گاڑی کے بیک مرر کو اپنی طرف کیا، آئینے میں میرا ”ہم سفر“ میرے سامنے تھا۔

لیکن اس کا سوال سن کر میں بوکھلا گیا، تاہم میں نے اپنی بوکھلاہٹ ظاہر نہیں ہونے دی۔ ”یار یہ کہنا تو قبل از وقت ہے کیونکہ یہ دونوں امیدوار اس وقت صرف بڑھکیں مار رہے ہیں اور جو امیدوار جتنی اونچی بڑھک لگاتا ہے اس کے جیتنے کے امکانات اتنے ہی بڑھ جاتے ہیں۔“ میں نے اسے گول مول سا جواب دینے کی کوشش کی۔ تاہم اس نے ساتھ ہی ایک اور سوال کر دیا۔ ”آپ مجھے پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں، یہ بتائیں کہ غالب اور اقبال میں سے بڑا شاعر کون ہے.....؟؟؟“ اور ذرا سنبھل کے جناب، سامنے سے ٹرک آرہا ہے اور اس کی لائٹ نہیں ہے۔“ میں نے تیزی سے گاڑی کو سائڈ پر کیا اور ٹرک سے بچا کر اسے دوبارہ سڑک پر لے آیا۔ ”میرا خیال ہے آپ ہی بتادیں کہ غالب اور اقبال میں سے بڑا شاعر کون ہے؟“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اُس نے اطمینان سے کہا ”میں یہ سمجھتا ہوں کہ غالب کی بڑائی سے انکار نہیں تاہم جو گہرائی اور فکر اقبال کے کلام میں ہے، شاید اس قدر غالب کے ہاں نہیں، ممکن ہے نقاد میری اس بات سے اتفاق نہ کریں تاہم غالب کے ایسے شعروں کی تعداد اقبال کے شعروں سے کہیں کم ہے جن میں ہمیں فکری گہرائی ملتی ہے۔“ میں نے طویل سانس لی اور گردن گھما کر پہلی دفعہ اس شخص کو غور سے دیکھا، مجھے اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ میں کچھ الجھن کا شکار ہو گیا اور اسی دوران اس نے ایک اور سوال داغ دیا۔ ”محترم! آئن سٹائن کی تھیوری آف Relativity تو آپ نے پڑھی ہوگی..... ذرا دیکھ کے جناب آگے Diversion کا بورڈ لگا ہوا ہے۔“

اُس کی بات ٹھیک تھی، اگر میں گاڑی سیدھی لے جاتا تو اس کا کھائی میں گرنا یقینی تھا۔ جب میں گاڑی کو دوبارہ سڑک پر لے آیا تو اس نے دوبارہ آئن سٹائن والا سوال اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ Special Theory of Relativity کے مطابق Time and Space دونوں Relative ہیں، یعنی اس کائنات میں کوئی بھی واقعہ کسی بھی خاص وقت یا مقام پر نہیں ہوتا۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن سریہ کیسے ممکن ہے کہ خلاء میں روشنی کی رفتار کے قریب سفر کرتے ہوئے کسی چیز کا حجم ہی تبدیل ہو جائے۔ کیا یہ حقیقت میں ایسا ہوتا ہے یا اس مقام پر صرف دیکھنے والے کو ایسا لگتا ہے؟؟؟“ مجھے اس شخص کی ٹائپ تو ابھی تک سمجھ میں نہیں آ سکی تھی لیکن اب مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی

”او کے..... پھر؟“

”پھر میں اپنے دشمن کی جاسوسی کروں گا اور نوٹ کروں گا کہ وہ کہاں کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے، کس جگہ کتنی دیر رکتا ہے، اکیلا کہاں گھومتا ہے اور بیوی بچوں کے ساتھ کہاں ہوتا ہے، دفتر سے کب لوٹتا ہے، گھر جاؤ تو دروازہ کیسے کھولتا ہے وغیرہ وغیرہ۔“

”ٹھیک ہے لیکن یہ سب معلومات اکٹھی کرنا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لیے تمہیں لگا تار کئی دن تک اپنی دشمن کی جاسوسی کرنی پڑے گی۔“

”ہاں میرے ذہن میں یہ بات ہے..... اور اسی لیے میں نے ایک عدد موٹر سائیکل چرانے کا بھی پروگرام بنایا ہے تاکہ میں آسانی کے ساتھ اس کی نگرانی کر سکوں کیونکہ گاڑی پہ پیچھا کرنا کچھ مشکل کام ہے۔“

”ہاں مگر تم موٹر سائیکل کیسے چراؤ گے..... تم کوئی پیشہ ور چور تو ہو نہیں۔“

”یقیناً یہ ایک مشکل کام ہوگا لیکن اپنے پلان کو فول پروف بنانے کے لیے مجھے کسی نہ کسی طرح موٹر سائیکل تو چرانی ہی ہوگی کیونکہ اپنی گاڑی پر اس قسم کا رسک مول نہیں لیا جاسکتا۔“

”چلو مان لیا کہ تم کسی طریقے سے ایک موٹر سائیکل چرانے میں کامیاب ہو جاؤ گے، اس کے بعد تم کیا کرو گے؟“

”اس کے بعد میں ایک جعلی نمبر پلیٹ بنوا کر اس موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دوں گا اور پھر کسی دن موقع پا کر اپنے دشمن کے سینے میں پستول کی گولیاں اتار دوں گا۔“

”ہوں..... بظاہر تو تم نے بڑا فول پروف قسم کا پلان بنایا ہے مگر پھر بھی اس میں کچھ خامیاں ہیں اور تمہارے پکڑے جانے کے امکانات کافی روشن ہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو..... میرے اس پلان میں کہاں خرابی ہے؟“

”سب سے پہلے تو تم جیسے شخص کا ناجائز اسلحہ خریدنا ہی بعید از قیاس ہے۔ لیکن اگر بالفرض محال اگر تم کسی طرح ناجائز پستول حاصل کر بھی لیتے ہو تو تم لاہور جیسے گنجان آباد شہر میں کہاں چا ند ماری کرو گے؟“

”میں شہر میں پریکٹس نہیں کروں گا بلکہ رات کو شہر سے باہر کسی دور دراز سنسان علاقے میں یہ کام کروں گا۔“

”ماشاء اللہ..... پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کام ہی خطرے سے خالی نہیں اور دوسری بات یہ کہ ایسے

## ایک جائز قتل

”میں ایک قتل کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟..... کیا کہا تم نے؟؟ کس کا قتل کرنا چاہتے ہو اور کیوں؟؟؟“

”بس ہے کوئی میرا دشمن جسے میں جان سے مارنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض؟“

”نہیں! اعتراض تو نہیں، تاہم یہ تو بتاؤ کہ تم یہ کام کرو گے کیسے؟ کیونکہ اس کے لیے تو کافی پلاننگ کی ضرورت ہے۔“

”میں نے سب پلاننگ کر لی ہے۔“

”اچھا..... مثلاً کیا پلاننگ کی ہے؟“

”سب سے پہلے میں ایک عدد پستول خریدوں گا اور.....“

”ہا ہا ہا ہا..... اور جو نبی تم اس پستول سے قتل کر لو گے پولیس فوراً اس کے لائسنس ہو لڈر یعنی تمہیں دھر لے گی۔“

”جی نہیں، میں اس قدر بے وقوف نہیں کہ جس پستول سے قتل کرنا ہو اس کا لائسنس بھی بنواتا پھروں۔ میں یہ پستول علاقہ غیر کے کسی ایسے دوکاندار سے خریدوں گا جو مجھے پستول کی ”پہنچ“

لاہور تک دے گا۔“

”چلو مان لیا..... لیکن اس کے بعد تم کیا کرو گے؟“

”اس کے بعد میں چند دن کسی سنسان مقام پر جا کر پستول چلانے اور نشانہ پکا کرنے کی مشق کروں گا۔“



”ہوں..... اسی لیے میرا خیال ہے کہ مجھے خودکش بمبار بن جانا چاہیے!!!“

”کیا..... تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟؟؟“

”نہیں میرے دوست میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں، اگر میں خودکش بمبار بن گیا تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے عزیزم کہ سب سے پہلے میں کوئی اچھا سامکان کرائے پر لوں گا، اس کے بعد میں علاقہ غیر سے تقریباً ڈیڑھ دمن دھا کہ خیز مواد منگواؤں گا۔ پھر میں ایک دو ماہر لوگوں کو اس کام پر مامور کروں گا کہ وہ اس دھا کہ خیز مواد کو پراسس کریں اور اسے ایک خودکار بم کی شکل دے دیں۔ یہ سارا کام آسانی کے ساتھ اُسی کرائے کے مکان میں ہو جائے گا۔ چند دنوں میں جب یہ کام مکمل ہو جائے گا تو میں کہیں سے ایک چھوٹا سا ٹرک چوری کر کے لے آؤں گا اور اس دھا کہ خیز مواد کو اُنہی آدمیوں کی مدد سے اُس ٹرک میں لوڈ کروادوں گا کیونکہ ظاہر ہے ڈیڑھ دو من وزن میں اکیلے تو نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے بعد کسی بھی دن میں وہ ٹرک لے کر اس گنجان آباد شہر کی سڑکوں پر نکلے گا اور کوئی مناسب موقع اور جگہ دیکھ کر بم بھاڑ دوں گا، تم دیکھنا کوئی بھی میرا سراغ نہیں پاسکے گا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ منوں کے حساب سے دھا کہ خیز مواد پہلے ہی طرح لایا جاتا رہے گا، اسی طرح لوگ اسے پراسس کر کے بم بھی بناتے رہیں گے اور پھر بغیر کسی مشکل اور روک ٹوک کے اسے جہاں دل کرے گا بھاڑ بھی دیں گے، انہیں کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔“

”میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں..... لیکن اب میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ تم جسے قتل کرنا چاہتے تھے اسے بے فکر ہو کر قتل کر دو کیونکہ اگر تم پکڑے بھی گئے تو تمہارے قتل کا الزام میں اپنے سر لے لوں گا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ خودکش بمباروں کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے۔ تاہم ایک آخری بات بتا دو کہ تم آخر قتل کس کو کرنا چاہتے ہو؟“

”اُس کو..... جو معصوم شہریوں کی جانیں لینے کے لیے خودکش بمبار تیار کرتا ہے.....!!!“

(20 مارچ 2008ء)

علاقوں میں کسی ناکے پر پکڑے گئے تو ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں سیدھے اندر کر دیے جاؤ گے اور ضمانت بھی نہیں ہو سکے گی۔“

”خیر تم اس بات کو چھوڑو اور بتاؤ کہ مزید میرے پلان میں کیا خرابی ہے؟“

”مزید یہ کہ تمہارا دشمن یقیناً تمہیں پہچانتا ہوگا اس لیے اس کی جاسوسی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کہ شک پڑنے پر وہ پہلے ہی پولیس کو اطلاع کر دے اور تم دھر لیے جاؤ۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ میں اپنا حلیہ تبدیل کر کے اس کی نگرانی کروں گا۔“

”یہ ایک اور مشکوک حرکت ہوگی۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ تم بھیس بدل کر ایک چوری کی ہوئی موٹر سائیکل پر پورے شہر میں گھومو گے اور اگر کہیں کسی پولیس والے نے روکا تو موٹر سائیکل کے کاغذ نہ پا کر تمہیں مشکوک سمجھے گا اور پھر جب اسے تمہارے حلیے کا علم ہوگا تو پھر تمہاری خیر نہیں۔“

”ہوں..... بس یا اور بھی کوئی خرابی ہے میرے پلان میں؟“

”ویسے تو اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں لیکن تمہاری آسانی کے لیے ایک آخری موٹی سی بات بتاتا چلوں کہ جب تم اپنے دشمن کو قتل کرنے لگو گے تو یقیناً ایک دفعہ تو تمہارا ہاتھ کانپے گا کیونکہ اس سے پہلے تم نے کوئی قتل نہیں کیا۔ اس لیے کوئی بعید نہیں کہ تمہارا نشانہ چوک جائے اور اگر ایسا ہو گیا اور تمہارا دشمن بچ نکلا تو پھر تمہاری گرفتاری پکی ہے۔ وہ یقیناً پولیس میں تمہارے خلاف رپورٹ لکھوائے گا اور چونکہ مشکوک افراد کی فہرست میں تمہارا نام سب سے اوپر ہوگا اس لیے پولیس تمہیں گرفتار کرنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں کرے گی۔“

”اور فرض کرو کہ اگر میرا نشانہ ٹھیک لگا تو پھر؟“

”پھر بھی تمہاری خلاصی ممکن نہیں کیونکہ تمہاری اور اس کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اس لیے تم مشکوک افراد کی لسٹ میں شامل رہو گے اور تھوڑی سی چھان بین کے بعد ہی پولیس تمہیں دھر لے گی کیونکہ تمہاری پچھلے چند ہفتوں کی کرتوتیں مثلاً ناجائز پستول، چوری کی موٹر سائیکل وغیرہ وغیرہ تم تک پہنچنے کا آسان راستہ ثابت ہوں گی۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے اپنے پلان میں اچھی خاصی تبدیلی کرنی پڑے گی.....“

”بالکل..... لیکن تم اپنے پلان میں جو بھی تبدیلی کرو گے، بالآخر پکڑے جاؤ گے۔“

بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور وہ بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آپ اب بھی پہلے ہی کی طرح پریشان ہیں۔“ میں نے چونک کر نجومی صاحب کی طرف دیکھا اور کہا ”جناب میں نے یہ کب عرض کیا ہے کہ میں پریشان ہوں، میں نے تو صرف یہ گزارش کی ہے کہ میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، یعنی میں پہلے بھی خوش تھا اور اب بھی خدا کا شکر ہے۔“ اس دفعہ موصوف کے چہرے پر کچھ مایوسی کے آثار ابھرے لیکن ساتھ ہی انہوں نے اپنے ترکش سے ایک اور تیر پھینکا اور سوال نما اطلاع دی ”آپ کے پاؤں پر کوئی زخم کا نشان بھی ہے!!!“ میں نے گھبرا کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا لیکن پھر فوراً ہی مجھے اپنے اس اضطراری فعل کے احمقانہ پن پر خود ہی ہنسی آ گئی ”یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں یا مجھے بتا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا ”جناب یہ میں آپ کو اپنے علم کے زور پر بتا رہا ہوں۔“ یہ سن کر میں نے دل میں لاجول پڑھی اور کہا ”لیکن محترم میرے پاؤں پر تو کوئی زخم کا نشان نہیں البتہ میری آنکھ سے ذرا اوپر ہلکا سا نشان ضرور موجود ہے۔“ میری بات سن کر وہ چڑ گیا اور بولا ”جناب میں پاؤں کی بات کر رہا ہوں اور آپ آنکھ پر پہنچ گئے ہیں۔“ یہ سن کر میں بھی کچھ چڑ گیا ”تو پھر میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میرے دونوں پاؤں میں کسی قسم کے زخم کا نشان نہیں ہے۔“

یہ سن کر موصوف نے اپنا پین احتیاط سے میز پر بیچ دیا اور ملازم کو صرف اپنے لیے چائے لانے کا آرڈر دیا۔ میں نے اس کی یہ حرکت دلچسپی سے نوٹ کی لیکن چپ رہا۔ اسی اثناء میں موصوف نے ایک محدب عدسہ نکالا اور میری طرف جھک کر بولے ”میرا علم کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا، اپنے پیر دکھائیں، میں خود چیک کروں گا۔“ یہ سن کر میں نے اپنے دونوں پاؤں موصوف کے سامنے کر دیے اور انہوں نے نہایت باریک بینی سے میرے پیروں کا جائزہ لینا شروع کیا اور پھر اچانک ”ارشمیدس“ کے سے انداز میں چلائے ”میں نے پالیا..... میں نے پالیا..... یہ دیکھیں یہ رہا نشان..... خدا کی پناہ کتنا بڑا نشان ہے۔“ میں نے گھبرا کر اُس جگہ دیکھا اور پھر اطمینان سے محدب عدسہ موصوف کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا ”پہلی بات تو یہ کہ یہ نشان کسی مجھڑ کے کاٹنے کا ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ بہت چھوٹا نشان ہے، بشرط کہ آپ اسے محدب عدسے کے بغیر دیکھیں۔“ یہ سنتے ہی نجومی نے چونک کر طویل سانس لی اور نارمل ہو کر بیٹھ گیا۔ ”آپ مجھے زچ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن کوئی بات نہیں، ہر

## پیشین گوئی

شناپنگ مال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اچانک میری نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا ”آسٹرالوجی کنسلٹنٹ..... آپ کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، یہ ہم آپ کو بتائیں گے۔“ میرے قدم خود بخود رک گئے کیونکہ مجھے شروع ہی سے پامسٹری، ستارہ شناسی اور علم نجوم وغیرہ سے دلچسپی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں تو ہم پرست واقع ہوا ہوں بلکہ ہر انسان کی طرح میں بھی مستقبل کے بارے میں متحس ہوں۔ میں نے بورڈ پر لکھی ہوئی سمت کی جانب بڑھنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے کیمین کے سامنے پایا، وہاں گنجه سر کا ایک شخص لیپ ٹاپ سامنے رکھے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ ہلکی سی مسکراہٹ کا تبادلہ کیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اُس کے ساتھ فیس کا معاملہ طے کیا اور پھر اُس سے علم نجوم کے مطابق اپنے بارے میں کچھ معلومات چاہیں۔ نجومی صاحب نے سب پہلے مجھ سے تاریخ پیدائش اور وقت پیدائش پوچھا اور پھر اپنے لیپ ٹاپ میں کچھ انٹری کی۔ موصوف نے دو چار قسم کے ضمنی سوالات بھی پوچھے اور جب اپنی ابتدائی معلومات مکمل کر لیں تو پھر اپنے بنائے ہوئے زائچے کے مطابق میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے ”ستمبر 2007ء سے اب تک آپ کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آ چکی ہے۔“ یہ بات سن کر میں نے نفی میں سر ہلایا، لیکن اس نے میری ”ناں“ کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اُسی اعتقاد کے ساتھ دوبارہ اپنی بات دہرائی۔ لیکن میں نے بھی اُسی اعتقاد کے ساتھ دوبارہ نفی میں سر ہلادیا اور کہا کہ ”میری زندگی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔“ یہ

کی مدد کو نہ آتا تو ان تین ماہ میں آپ کسی جہال میں پھنس سکتے تھے۔“ میں اس کی بات سمجھ گیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ یہ دیکھ کر اس نے سمجھا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے لہذا فوراً ہی اگلی پیشین گوئی کر ڈالی ”آپ کو ایک لڑکی بھی بہت پسند ہے۔“ اور یہ کہہ کہہ چہرے پر مسکراہٹ سجا لی۔ میں بھی جواباً مسکرایا اور بولا ”لیکن قبلہ! مجھے تو تقریباً ایک درجن لڑکیاں پسند ہیں!!!“

”استغفر اللہ“ نجومی نے بلند آواز میں کہا اور گھور کر بولا ”چاندنی چاند سے ہوتی ہے ستاروں سے نہیں..... محبت ایک سے ہوتی ہے ہزاروں سے نہیں۔“ میں نے اطمینان سے اس کا ٹوکوں والا شعر سنا اور عرض کی ”آپ نے بالکل ٹھیک کہا، لیکن محترم محبت تو مجھے ان میں سے کسی سے بھی نہیں، ہاں پسند ضرور ہیں۔“

”عجیب آدمی ہیں آپ!!!“ وہ تمللا کر بولا ”خیر چھوڑیں اس بات کو اور اب اپنے بارے میں ایک آخری پیشین گوئی سن لیں۔ آپ اگلے ایک دو ماہ تک اپنے ایک بہت بڑے دشمن سے چھٹکارہ پالیں گے۔“ یہ بات کرتے ہوئے اس نے اپنی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے میری آنکھوں میں ایسے دیکھا گویا اسے پکا یقین ہو کہ اس کی یہ بات جھٹلائی نہیں جاسکتی۔ میں نے دل میں سوچا کہ باقی تمام پیشین گوئیاں اپنی جگہ لیکن اس نجومی کی کم از کم یہ بات واقعی غور طلب تھی۔ ایک ہی لمحے میں میرے ذہن میں اپنے کئی دشمنوں کا خیال آ گیا لیکن پھر میں نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا کیونکہ وہ تمام لوگ کسی طور بھی ”بڑے دشمن“ کی تعریف پر پورا نہیں اترتے تھے۔

اٹھنے سے پہلے میں نے نجومی سے ایک آخری سوال کیا ”محترم یہ فرمائیے کہ جس دشمن کی آپ بات کر رہے ہیں کیا وہ آسانی سے میرا پیچھا چھوڑ دے گا؟ یا اس کے لیے مجھے کوئی خاص تدبیر اختیار کرنی پڑے گی؟“ میری بات سن کر نجومی کے چہرے پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا ”ایسے دشمن خود بخود پیچھا نہیں چھوڑتے، ان کو بھگانے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے لیکن آپ چونکہ اس جدوجہد کے آخری مرحلے میں ہیں اس لیے آخری فتح آپ ہی کی ہوگی۔“ نجومی کا جواب سن کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑے ادب سے اُسے فیس پیش کی کیونکہ بالآخر اس نے ایک ایسی پیشین گوئی کی تھی جو شانہ مجھ سمیت ہر کوئی سنا چاہتا ہے۔

(31 مارچ 2008ء)

سو میں سے ایک کسٹریا ضرور ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں دوبارہ لیپ ٹاپ پر جما دیں اور تھوڑی دیر پر ایک لینے کے بعد بولا..... ”آج سے دس سال پہلے آپ نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں آپ ایک شارک مچھلی سے لڑ رہے تھے، قریب تھا کہ وہ شارک اپنا جبراً کھول کر آپ کو کچا چبا جاتی کہ یکا یک بجلی کڑکی، شارک پر گری اور وہ وہیں کوئلے کا ڈھیر بن گئی۔ فرمائیے، کیا میں اب بھی غلط ہوں؟“ میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا ”جی ہاں..... کیونکہ اول تو دس سال کجا مجھے دس منٹ پرانا خواب بھی یاد نہیں رہتا اور ایسا ہولناک خواب تو قطعاً نہیں لہذا میں آج سے دس سال پہلے کے خواب کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں؟“ نجومی صاحب غالباً اسی جملے کے منتظر تھے، فوراً بولے ”لیکن میں بتا سکتا ہوں، اس خواب کی تعبیر کے مطابق آپ کو سمندری جانور سے جان کا خطرہ ہے لہذا اسی فوڈ سے پرہیز ضروری ہے۔“ میں نے ”تعبیر اور علاج“ سننے کے بعد غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن اس دفعہ خاموش ہی رہا۔ یہ دیکھ کر نجومی نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ ”ایک اور پیشین گوئی سن لیں کہ پچھلے تین ماہ سے آپ کا ستارہ گردش میں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ گھر میں پریشانی ہے، ذہنی سکون نہیں ہے، طبیعت میں بے چینی ہے، کوئی کام ٹھیک سے نہیں ہو پاتا، کامیابی دور بھاگتی ہے اور.....“ میں نے جلدی سے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور کہا ”محترم میرا خیال ہے کہ آپ ذرا غور سے ستاروں کی چال ملاحظہ فرمائیں کیونکہ میرے خیال میں میرا ستارہ گردش میں نہیں بلکہ آپ کے ستاروں کی گردش ٹھیک نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس دفعہ اس نے چونک کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ مجھے پچھلے تین ماہ سے تو کیا بفضل تعالیٰ پچھلے کئی سال سے کوئی پریشانی یا ٹینشن نہیں، میں بالکل خوش و خرم ہوں اور کامیاب زندگی گزار رہا ہوں۔“ یہ سن کر اس نے متمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا ”یہ آپ کی غلط فہمی ہے، اصل میں آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ آپ کی پریشانی کیا ہے!!!“ میں نے حیرت سے نجومی کی طرف دیکھا ”بہت خوب! یہ کیسی پریشانی ہے جو مجھے پریشان ہی نہیں کرتی؟“

”میرا یہ مطلب نہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا ”دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر زحل کا ستارہ آپ

تھا۔ یہ تو میرا کمال ہے کہ میں نے آپ کا کام پندرہ منٹ میں نبیڑ دیا۔“

ملکین حضرات کا حال بھی کچھ اسی قسم کا ہے، ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اچانک میری گاڑی کے ڈیش بورڈ سے کھڑکھڑکی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنے محلے کے ملکین کو دکھایا تو اس نے اچھی طرح گاڑی کو ٹھوک بجا کر دیکھنے کے بعد بے نیازی سے کہا ”جناب اس کا گیر اور ماؤنٹنگ خراب ہے، فوراً بدلوا لیں، گاڑی تین دن کے لیے ورکشاپ چھوڑنی پڑے گی۔“ یہ سن کر میرا موڈ سخت آف ہو گیا کیونکہ گاڑی کے بغیر تین دن تو کجا آج کل تین گھنٹے بھی نہیں گزارے جاسکتے۔ یہی سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ آج تو نہیں البتہ اگلے روز گاڑی ملکین کو بھجوا دوں گا۔ گھر واپس آتے وقت بھی ڈیش بورڈ سے مسلسل کھڑکھڑکی آواز آتی رہی لیکن جیسے ہی میں نے نصیبو لعل کا گانا لگایا، کھڑکھڑکی آواز فوراً بند ہو گئی کیونکہ..... یہ نصیبو لعل ہی کی کیسٹ تھی جو ڈیش بورڈ میں ”کھڑک“ رہی تھی!!!

اس ضمن میں سرکاری ملازم بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ آپ ان کے پاس جائز سے جائز کام بھی لے کر چلے جائیں، ان کا پہلا رسپانس منفی ہی ہوگا۔ عموماً ان کا انکار اس قسم کا ہوتا ہے کہ ”Rules میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔“ یہاں روڈز سے مراد غالباً ان کی تنخواہ ہوتی ہے جس میں وہ کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ Rules کے ”R“ کو Rupees کے ”R“ سے بدل دیتے ہیں تو آپ کا کام فوراً ہو جاتا ہے۔

لڑکیوں کی ”ناں“ اوپر بیان کیے گئے تمام لوگوں کی ”ناں“ سے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر لڑکیوں کی ”ناں“ کا مطلب ”ہاں“ ہوتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی ”ہاں“ کا مطلب ”ناں“ ہوتا ہے یا ہمیشہ ہی ان کی ”ناں“ کا مطلب ”ہاں“ ہوتا ہے۔ یہ ان کے موڈ پر منحصر ہے کہ کب ان کی ”ناں“..... ”ہاں“ میں بدل جائے اور ان کی ”ہاں“..... ”ناں“ میں تبدیل ہو جائے۔ یقیناً یہ مسائل خاصے گھمبیر ہیں اور خاکسار قلم ان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم ایک مرد عاقل نے ایسی لڑکیوں پر ریسرچ کے بعد ایک مختصر سی ”خواتین ڈکشنری“ ترتیب دی ہے جس میں لڑکیوں کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کے معانی درج کیے گئے ہیں..... مثلاً!!! اگر لڑکی کہے کہ ”ہمیں ضرورت ہے“ تو اس کا مطلب ہے کہ ”اُسے ضرورت ہے“۔ لڑکی کہے کہ ”جاؤ جو دل چاہے کرو“ تو اس کا مطلب ہے ”تم جو بھی کرو گے تمہیں بھگتنا پڑے گا“۔ لڑکی کہے کہ ”ہمیں بات کرنی چاہیے“ تو اس کا مطلب ہے ”میں نے کچھ شکایت

## کبھی ہاں کبھی ناں!!!

کچھ لوگوں کی ہر بات ”ناں“ سے شروع ہوتی ہے، کام کی نوعیت چاہے کچھ بھی ہو، ان کا پہلا جملہ یہی ہوتا ہے کہ ”یہ کام نہیں ہو سکتا۔“ ایسے لوگ اگر کسی کام کے جواب میں مکمل طور پر انکار نہ بھی کریں تو بھی آپ کو ایسے گنجل میں ڈال دیں گے کہ آپ ”لنڈورے ہی بھلے“!!! اس قسم کے لوگ تمام شعبہ ہائے زندگی میں پائے جاتے ہیں مثلاً ملکین، سرکاری ملازم، الیکٹریشن، اکاؤنٹنٹ، لڑکیاں، خا کرو ب وغیرہ وغیرہ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان تمام لوگوں کی قدر مشترک ان کی ”ناں“ ہی نہیں بلکہ ”ہاں“ بھی ہے جو بالآخر ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ مثلاً پچھلے دنوں میں نے لالو الیکٹریشن کو بلایا، مجھے گھر میں ایک جگہ بلب لگوانا تھا، لالو نے آتے ہی بلب والی جگہ کا سروے کیا اور حسب عادت مایوسی سے سر ہلا کر بولا ”سر یہ بلب یہاں نہیں لگ سکتا، اس کے لیے پورے کمرے کی وائرنگ اکھاڑنی پڑے گی اور اس کام میں پورا دن لگ جائے گا۔“ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ”یار! ہر مرتبہ کی طرح اس مرتبہ بھی یہ کام تمہی کرو گے اور ابھی کرو گے اور بغیر وائرنگ اکھاڑے“ کرو گے۔“ لالو نے یہ سن کر بتیسی نکالی اور بولا ”سرجی اب آپ کہہ رہے ہیں تو کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا زنبیل نما بیگ کھولا اور محض پندرہ منٹ کے اندر بغیر کوئی تار چھیڑے بلب لگا کر فارغ ہو گیا۔ لالو کی پھرتی دیکھ کر میں نے پوچھا کہ اب یہ کام اتنی جلدی کیسے ہو گیا؟ تو جواباً موصوف نے ایک مرتبہ پھر دانت نکالے اور یکدم سیرس ہوتے ہوئے کہا ”میری جگہ اگر کوئی اور الیکٹریشن یہ کام کرتا تو اسے وہی سب کچھ کرنا پڑتا جیسے میں نے بتایا



آپ کا کام تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، سمجھیں ہو گیا۔ دوسرے دن کہا جائے گا کہ ”جناب آپ ہی کا کام ہو رہا ہے، دو دن بعد پتا کر لیں۔“ تیسرے دن سے آپ کا فون نہیں سنا جائے گا اور اگر آپ نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا تو آخر کار ”ناں“ ہو جائے گی!!!

پس ثابت ہوا کہ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی بات ”ہاں“ یا ”ناں“ سے تو شروع کرتے ہیں مگر پھر مختلف مصلحتوں کی بناء پر اپنے موقف سے پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر کام کے حق اور مخالفت میں دلائل مل جاتے ہیں اور دونوں میں ہی وزن ہوتا ہے لہذا ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دلائل کے بل بوتے پر اپنے موقف میں تبدیلی پیدا کی ہے جبکہ اسے محض موقف میں تبدیلی نہیں بلکہ بے غیرتی کہا جاتا ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ ”مصلحت اور بے غیرتی میں بہت باریک فرق ہوتا ہے۔“

(8 اپریل 2008ء)

کرنی ہے۔“ لڑکی کہے کہ ”تم میں مردانہ وجاہت ہے۔“ تو اس کا مطلب ہے کہ ”تمہیں شیوکی ضرورت ہے اور تمہیں پسینہ بہت آتا ہے۔“ لڑکی کہے کہ ”ہمارا کچن ٹھیک نہیں ہے۔“ تو مطلب ہے کہ ”مجھے نیا گھر چاہیے۔“ لڑکی کہے کہ ”مجھے نئے پردے چاہئیں۔“ تو اس کا مطلب ہے کہ ”مجھے نیا کارپٹ، نیا فرنیچر اور نیا وال پیپر چاہیے۔“ لڑکی کہے کہ ”میں ایک منٹ میں تیار ہو جاؤں گی۔“ تو اس کا مطلب ہے کہ ”تم ایک گھنٹے بعد مجھے pick کر لینا۔“

انکاری لوگوں کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہر کام کا دعویٰ کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ ان کی ہر بات ”ہاں“ سے شروع ہوتی ہے اور وہ نہایت اعتماد کے ساتھ ہر کام کرنے کی حامی بھر لیتے ہیں۔ چاہے آپ انہیں ایف سولہ لانے کے لیے ہی کیوں نہ کہہ دیں، ان کے منہ سے ہمیشہ یہی فقرہ نکلے گا ”ہاں ہاں..... بے فکر رہیں، آپ کا کام ہو جائے گا۔“ اور اگر آپ فالو اپ کے طور پر چند دن بعد اس کام کی بابت پوچھیں تو بھی جواب حوصلہ افزائی آئے گا کہ ”سر آپ سمجھیں آپ کا کام ہو گیا..... اب تو خوش ہیں ناں!!!“ ایسے لوگوں کو دیکھ کر حوصلہ افزائی تو ضرور ہوتی ہے تاہم اکثر یہ لوگ بھی اتنی ہی مایوسی کا باعث بنتے ہیں جتنے کہ اول الذکر انکاری لوگ۔ تاہم ان دونوں اقسام کے لوگوں میں ایک قدر ضرور مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں پارٹیاں بتدریج اپنی اپنی انتہا سے پیچھے ہٹتی چلی جاتی ہیں، اور بالآخر ناں ہاں میں بدل جاتی ہے اور ہاں، ناں بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کا کام کسی سکی قسم کے اکاؤنٹ کے پاس پھنس گیا ہے تو اس کے رسپانس کے مدارج کچھ اس قسم کے ہوں گے کہ پہلے دن موصوف صاف صاف کہہ دیں گے کہ ”آپ کا کام نہیں ہو سکتا۔“ دوسرے دن وہ آپ کو فائل کا پیٹ بھرنے کے لیے آٹھ دس قسموں کے تصدیق شدہ کاغذات لانے کے لیے کہہ دیں گے، تیسرے دن وہ آپ کو بتائیں گے کہ آپ کے کام کی وجہ سے وہ دوپہر کا کھانا تک نہیں کھا سکے، لہذا اسی وقت آپ انہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلائیں گے اور اس کے ساتھ ہی فائل کا پیٹ بھی بھر جائے گا۔ چوتھے روز بانی پاکستان کی چند تصاویر ان کی نذر کی جائیں گی اور جواب میں وہ آپ کو خوشخبری سنائیں گے کہ آپ کا کام ہو گیا ہے۔ یعنی ”ناں، ہاں“ میں بدل جائے گی!!!

دوسری طرف اگر آپ کسی بڑے افسر کے ہتھے چڑھ گئے تو عین ممکن ہے کہ آپ معرفت کی منزل میں کچھ اس طرح طے کریں کہ پہلے دن آپ کو یہ مژدہ سنایا جائے گا کہ ”جناب





اچھی طرح آتے تھے۔ آج کل کی نئی پود کو ان لفظوں کی پہچان ہی نہیں رہی بلکہ خود نئی پود کی کوئی پہچان نہیں رہی کیونکہ اب بچوں کو ناموں سے نہیں بلکہ نمبروں سے یاد رکھا جاتا ہے!!! یوں تو اس زمانے کی بے شمار باتیں اب قصہء پارینہ بن چکی ہیں لیکن لاہور کی ایک ایسی خصوصیت جس کے بغیر یہ ذکر مکمل نہیں ہوتا، اس کے سٹیج ڈرامے اور تھیٹر تھے۔ ان کی مقبولیت کی خاص بات ان میں ”مجرا“ کرنے والی خواتین تھیں جنہیں معاشرے میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جن پڑھنے والوں کو اس بات میں میں مبالغہ آرائی کا شائبہ نظر آئے وہ بے شک ”علامہ مجول“ کی مشہور کتاب ”شاہی کشتے اور ان کا استعمال“ کی جلد نمبر 1، صفحہ 142 پڑھ لیں جس میں علامہ نے ان عقیقاؤں کے چال چلن پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مزید برآں، اُس زمانے کے ٹی وی چینلز کے انٹرویو بھی نکلوا کر دیکھے جاسکتے ہیں جن میں یہ پاکدامن عورتیں معاشرے میں پھیلی برائیوں پر افسوس کا اظہار اور قوم کے نام اپنے پیغام میں لوگوں کو صاف ستھری تفریح کی طرف مائل کرتی نظر آتی ہیں۔ اُس زمانے کی ایک سٹیج ڈانس آج کل ایڈز کے خلاف این جی او چلا رہی ہے۔ ان تھیٹروں کی اداکارائیں جب اپنے ”فن“ کا مظاہرہ کرتی تھیں تو بڑھکیں اور سیٹیاں بجاتے ہوئے شائقین کا شوق دیدنی ہوتا اور کچھ تو مستی کے عالم میں سٹیج پر چڑھنے کی کوشش بھی کرتے لیکن سٹیج کے پاس موجود انتظامیہ کے ”کن ٹی“ انہیں کانوں سے پکڑ کر سٹیج سے نیچے اتار دیتے۔ آج کل ایسا روح پرور روایتی کلچر کہاں دیکھنا نصیب ہوتا ہے، اب تو ان تھیٹر کی جگہ ”اسٹریٹ ٹیز“ کلبوں نے لے لی ہے نہ جانے لاہور کو کس کی نظر لگ گئی!!!

آج جب 2058ء میں ہم 2008ء کے لاہور پر نظر ڈالتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان پچاس سالوں میں ہم نے لاہور کا حسن گہنا دیا ہے، پچاس سال پہلے کا لاہور میرے دل میں یوں بسا ہوا ہے جیسے میرے بزرگوں کے دلوں میں 1908ء کا لاہور بسا کرتا تھا۔ اصل میں ہم سب لوگ اپنے اپنے شہروں میں پچاس سال پرانی باتیں ڈھونڈتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کو نہ پا کر ہمیں اس زمانے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ درحقیقت اُس زمانے کی تمام یادیں ہماری جوانی سے جڑی ہوتی ہیں، جوانی چلی جاتی ہے تو صرف یادیں رہ جاتی ہیں اور جب یادیں رہ جائیں تو پھر ماضی اچھا اور حال برا لگنے لگتا ہے۔

(14 اپریل 2008ء)

کے موقع پر ایک دوسرے کو موبائل فون کے ذریعے تہنیتی پیغامات بھیجا کرتے تھے اور اس طرح ایک دوسرے کی خوشی میں بذریعہ ”لاسکی رابطہ“ شریک ہوتے تھے۔ نئی میں شریک ہونے کے لیے بھی عموماً یہی طریقہ استعمال کیا جاتا تھا یعنی کسی کے رشتہ دار کی ناگہانی وفات پر ایک ایس ایم ایس بھیج دی جاتی جو کچھ یوں ہوتی:

v.sad 2 hair abt.de newz of ur dad

جنازوں میں شرکت کا رواج انہی دنوں کم ہونا شروع ہو گیا تھا، تاہم ایک اچھی بات یہ تھی کہ معاشرے کے بااثر لوگوں کے جنازوں میں جانے کی روایت قائم تھی۔ افسوس کہ آج کل یہ روایت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے، اب لوگ صرف دوسروں کی بیویوں کے جنازوں کو کندھا دینے جاتے ہیں!!!

اُن دنوں خوشحالی کا معیار موبائل فون کا مالک ہونا تصور کیا جاتا تھا، لہذا اس تصور کی رو سے اُس دور کا خاکروب بھی خاصا خوشحال تھا جو اپنی جیب میں مختلف موبائل کمپنیوں کی ”سیمیں“ ڈال کر پھرا کرتا تھا۔ اُن دنوں چونکہ کال کرنے کے بھی پیسے ہوا کرتے تھے اس لیے، کس کمپنی کا کافی منٹ کال ریٹ سب سے کم ہے، کون سب سے زیادہ فری منٹ دے رہا ہے، کس پنچ میں ایس ایم ایس سب سے زیادہ سستی ہے، یہ تمام معلومات بچے بچے کے پاس ہوتی تھیں۔ تاہم ان دنوں پندرہ سال سے کم عمر بچوں کے پاس عموماً موبائل فون نہیں ہوتا تھا جبکہ آج کل تو ہر بچہ ہی pre-paid پیدا ہوتا ہے۔

اُس زمانے میں فقیر بھی بہت سادہ لوح ہوا کرتے تھے، صرف اللہ کے نام پر مانگا کرتے تھے۔ ان کے پاس نہ ہی کوئی کریڈٹ کارڈ ہوتا، نہ موبائل فون کا بل کہ جس کو جمع کرانے کے لیے وہ لوگوں سے بھیک مانگتے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی فقیر ایک کلو آٹا مانگ لیتا، جو اس زمانے میں بیس پچیس روپے کلو مل جاتا تھا۔ آج کل کے فقیر تو اپنی موٹر سائیکل میں دو لٹر سے کم پٹرول ڈلوئے بغیر جان نہیں چھوڑتے۔

آج سے پچاس سال پہلے ہر گھر میں ”کیبل“ کا کنکشن ہوا کرتا تھا جس کی فیس صرف دو سو روپے ماہوار ہوا کرتی تھی، ٹی وی پر ساٹھ کے قریب چینل آیا کرتے تھے اور سارے گھر والے ایک ساتھ بیٹھ کر ہر وقت ٹی وی دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے کے ٹی وی ڈرامے دیکھ دیکھ کر بچوں کو بھی ”نمشکار، کریا کرم، بلائکار اور سہاگ رات“ جیسی تراکیب کے معانی بہت

محنت مزدوری کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔“ دفتر میں بھی لوگ میری محنت کی مثالیں دیتے ہیں، میں ہر وقت اپنے ماتحتوں کو بھی لگن سے کام کرنے کی تلقین کرتا رہتا ہوں، اسی وجہ سے اب انھوں نے مجھے ”تلقین شاہ“ کہنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن میں نے کبھی کسی بات کا برا نہیں مانا، یہ میری ایک اور خوبی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کسی اہلکار کی تربیت کی خاطر اس کی سرزنش ضرور کر دیتا ہوں تاکہ اسے ملازمت کرنے کا گر سکھایا جاسکے۔ میری سرزنش کے نتیجے میں اکثر ملازمین نوکری چھوڑ کر اپنا کاروبار کر رہے ہیں اور پہلے سے کافی خوشحال ہیں۔

میری ایک اور بہت بڑی خوبی سچ بولنا ہے، حق گوئی و بے باکی میری سرشت میں ہے۔ سچ بولنے کا ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ اس وقت سچ بولتا ہوں جب اس کا فائدہ ہو، باقی موقعوں پر میں اپنی زبان قابو میں رکھتا ہوں کہ شریفوں کا یہی وطیرہ ہے۔ سچ بولتے وقت میں مد مقابل کا ادب و احترام بھی ملحوظ خاطر رکھتا ہوں بشرطیکہ وہ رشتے، عہدے یا حیثیت میں مجھ سے بڑا ہو، اس صورت میں ایسی کوئی بات نہیں کرتا جس سے اُس شخص کی دل آزاری اور میری ”آوازاری“ کا اندیشہ ہو۔ البتہ اپنے سے کم حیثیت لوگوں کے منہ پر حق بات کہنے سے بالکل دریغ نہیں کرتا کیوں کہ جیسا میں نے کہا ہے باکی میری سرشت میں ہے۔

میں اپنی رکن رکن خوبیوں کا ذکر کروں، کچھ تو ایسی ہیں جو بیان سے ہی باہر ہیں۔ فی الحال میں ان کی تفصیل میں نہیں جاتا بلکہ آپ کو اپنی ایک ایسی خوبی بتاتا ہوں جس کا ایک عالم نہ صرف گواہ ہے بلکہ معترف ہے۔ میں غریبوں کا بہت ہمدرد ہوں، آئے دن کسی نہ کسی غریب کی مدد کرنا میری عادت بن چکی ہے۔ روزانہ شام کو واپس جاتے ہوئے جب تک میں پانچ روپے کا چمکتا ہوا سکہ کسی فقیر کی جھولی میں نہ ڈال دوں، میں گھر میں داخل نہیں ہوتا۔ اکثر یہ سکہ میں اپنی گاڑی کا شیشہ کھول کر زمین پر رینگنے والے اپانچ بھکاریوں کے سامنے پھینک دیتا ہوں جس پر وہ یوں گھسٹتے ہوئے لپکتے ہیں جیسے کوئی بیٹسمین رن آؤٹ سے بچنے کے لئے خود کو بلے سمیت گھسیٹتا ہوا کریمز میں داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح جب بھی میں اپنے گھریلو ملازمین سے ”اوور ٹائم“ کرواتا ہوں، جس کی نوبت ہفتے میں محض تین یا چار مرتبہ ہی آتی ہے، تو ہمیشہ مہینے کے آخر میں ان کی تھیلی پر سو دو سو روپے ضرور رکھ دیتا ہوں تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ ویسے بھی مجھے کسی غریب کا استحصال گوارہ نہیں۔

## باکمال آدمی

میں ایک باکمال انسان ہوں اور مجھ میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ یہ خوبیاں اس قدر زیادہ ہیں کہ کبھی کبھی مجھے اپنے آپ پر حیرت ہونے لگتی ہے۔ مثلاً میری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ میرے پاس دنیا کے ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ عراق سے لے کر افغانستان تک اور پٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمت سے لے کر ٹیلیٹی سٹور میں آٹے کی فراہمی تک میرے پاس ہر تالے کی چابی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ کسی نے مجھ سے پوچھا کہ ملک میں آٹا سستا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ میں نے اطمینان سے جواب دیا کہ ”بہت آسان..... تمام مل مالکان کو لائن میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دو آٹا خود بخود سستا ہو جائے گا!!!“ میرا جواب سن کر سوال کرنے والا بیچارہ اپنا سامنہ لے کر رہ گیا، یقیناً وہ میری فہم و فراست کا قائل ہو گیا ہوگا۔ اسی طرح ایک دن میرا ایک دوست جو خود کو بہت عقل مند سمجھتا ہے (جبکہ اصل میں بالکل چغہ ہے) میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اسے ملک میں ہونے والے خود کش بم دھماکوں پر بہت تشویش ہے، کیا اس کا کوئی حل ہے؟ یہ سن کر میں نے قہقہہ لگایا اور کہا ”برخوردار اس کا حل بھی بہت سادہ ہے، تمام قبائلی علاقہ جات میرے ماتحت کر دیئے جائیں، میں دونوں میں یہ خود کش حملے بند کروا دوں گا!!!“ یہ سن کر میرے دوست نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور اجازت لے کر چلا گیا، یقیناً لوگ دوسروں کی ذہانت سے حسد کرتے ہیں۔

میری ان گنت خوبیوں میں سے ایک خوبی ان تھک محنت کرنا بھی ہے۔ بقول شخصے ”مجھے محنت کرنا بہت پسند ہے“ میں سارا سارا دن کسی درخت کی چھائوں میں بیٹھا لوگوں کو

خوبی جس کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے، میری انا ہے جسے کچھ لوگ ”سیلف ریسپیکٹ“ بھی کہتے ہیں۔ میں نے زندگی میں کبھی بڑے افسر، بد معاش اور نائی کے علاوہ کسی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ میں ”خودی میں نام پیدا کرنے“ کا قائل ہوں اسی لئے میں نے آج کل اپنے نام کے آگے ”خودی“ کا اضافہ کر لیا ہے تاکہ ایک تو یہ میرے نام کا حصہ لگے اور دوسرے لوگ اسے میرا تخلص سمجھتے ہوئے میری عزت کریں۔ ویسے اپنی جن خوبیوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ان کے ہوتے ہوئے مجھے مزید عزت کی ضرورت تو نہیں لیکن جب اوپر والا کسی کو عزت دینا چاہے تو بندہ عاجز محض اس کا شکر ہی ادا کر سکتا ہے۔

آخر میں چلتے چلتے ایک ضروری وضاحت کہ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود میں اپنے تشہیر کا قائل نہیں ہوں۔ میری حتی الامکان یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنی خوبیوں کو پروجیکٹ کرنے کی بجائے میں لوگوں کی کوتاہیوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرواؤں تاکہ انہیں اپنی شخصیت میں بہتری پیدا کرنے کا موقع مل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمہ وقت میری نظر اپنی خوبیوں کی بجائے لوگوں کی کمزوریوں پر ہوتی ہے اور میں گاہے بگاہے ان کی نشاندہی کر کے ان کی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ تاہم کچھ لوگ اس بات کا بالکل الٹا مطلب لے لیتے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے میں ایسے ہی اپنے ایک دوست کو سمجھا رہا تھا کہ اُس میں کیا کیا خامیاں ہیں اور محض اسے سمجھانے کی خاطر میں کہیں کہیں اسے اپنی شخصیت کی مثال بھی دے رہا تھا۔ اچانک اس نے میری بات کاٹی اور قدرے ترش لہجے میں بولا ”تم اپنے آپ کو دنیا کا سب سے ذہین اور باکمال انسان سمجھتے ہو جس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہے؟؟“ یہ سن کر میں نے اس کے لہجے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انکساری سے سر ہلایا تو وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا ”اے ذہین و باکمال شخص ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم اپنی ذاتی زندگی میں تو نوکری سمیت کوئی کام ڈھنگ سے کر نہیں سکتے اور دعویٰ کرتے ہو کہ بین الاقوامی مسائل کا حل تمہارے پاس موجود ہے!!!“

(22 اپریل 2008ء)

اب جبکہ میں اپنی خوبیاں گنوانے بیٹھ ہی گیا ہوں تو لگے ہاتھوں یہ بھی بتانا چلوں کہ مجھ میں طمع، لالچ اور حرص نام کو بھی نہیں۔ مجھے ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو اندھا دھند روپے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ نینجن فرینکلن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ”جو آدمی پیسے کو سب کچھ سمجھتا ہے، وہ پیسے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔“ میں پیسے کو سب کچھ نہیں سمجھتا اس لئے اس کے لئے سب کچھ تو نہیں..... البتہ کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتا ہوں تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں حریص ہوں۔ ٹھیک ہے کہ شہر میں میرے چار پلازے اور آٹھ پٹرول پمپ ہیں لیکن اس کے باوجود طبیعت میں قناعت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ ڈیفنس میں ایک دو پلاٹ خرید کر رکھ چھوڑ دوں ”پر طبیعت ادھر نہیں آتی“۔ گھر والی کے اصرار پر البتہ سونے کی چند ڈلیاں اس نیت سے خرید لی ہیں کہ ہر سال ان پر زکوٰۃ دے دیا کروں گا۔ اب سنا ہے کہ سونا دن بدن مہنگا ہوتا چلا جا رہا ہے، نہ جانے اس ملک کا کیا بنے گا۔ میں نے چند ڈلیاں مزید خرید لی ہیں!!

میری ایک خوبی ایسی ہے جس پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں اور وہ ہے میری ذہانت۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ میرے پاس دنیا کے ہر مسئلے کا حل ہے سو میری اس خوبی سے متاثر ہو کر لوگ اب دنیاوی مسائل کے ساتھ ساتھ مجھ سے مابعد الطبیعیاتی اور روحانی مسائل کا حل بھی دریافت کرنے لگے ہیں جس کا میں انہیں اپنی ذہانت کی بناء پر تسلی بخش جواب دے دیتا ہوں۔ اور اب تو کچھ عرصے سے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے مجھے کچھ الہامی اشارے بھی مل رہے ہوں۔ میں نے ایک دو دفعہ انہی اشاروں کی روشنی میں کچھ فیصلے بھی کئے جن کا نتیجہ حیرت انگیز طور پر میرے حق میں نکلا، مثلاً ایک روز مجھ پر ”القاء“ ہوا کہ اگر میں لوگوں کو ان کی مشکلات کے حل کے لئے تعویذ دھاگا دینا شروع کر دوں تو ان کے مشکلات بھی کم ہوں گی اور میرے ”رزق“ میں بھی برکت ہوگی۔ یہی ہوا۔ یعنی میرے رزق میں ایسی برکت پیدا ہوئی کہ چارو نا چار مجھے ایک سال کے اندر اندر ڈیفنس میں پلاٹ لینا پڑ گیا۔ بے شک وہ چھپڑ پھاڑ کر ہی دیتا ہے۔ اس پلاٹ پر اب ”سادات کمپلکس“ کے نام سے پلازہ بنانے کا ارادہ ہے!!!

کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنی خوبیوں کا احاطہ کرنے کے لئے مجھے بھی ایک آبِ بیتی لکھنی پڑے گی۔ خیر یہ تو وقت آنے پر دیکھا جائے گا، فی الحال ایک آخری



عالمی کساد بازاری کے نتیجے میں 1991ء میں ڈالر کی شرح میں رد و بدل کے بعد 825 ڈالر سالانہ مقرر کی گئی تھی، اب ٹیکس جی ڈی پی ریٹھ کی 9 فیصد بڑھوتی کے بعد، کم سے کم غربت کی لکیر سے تقریباً 33.7 فی صد تک بڑھ چکی ہے۔“ یقین کریں کہ کوئی مائی کا لعل اس دلیل کا جواب نہیں دے سکے گا، جواب دینا تو دور کی بات، کوئی اس کے بعد آپ سے سوال کرنے کی بھی جرات نہیں کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے تئیں کوئی چالاک شخص آپ سے یہ پوچھ بیٹھے کہ ان اعداد و شمار کا ذریعہ کیا ہے؟ تو نہایت اطمینان سے جواب دیں..... ”ڈاکٹر انجیل بائٹ (یا اس قسم کا کوئی بھی مہمل نام جس کے ساتھ فقط ڈاکٹر لگا ہو) کی سٹڈی آف ورلڈ اکنامکس جو نیویارک پریس نے 1998ء میں شائع کی، پڑھ کر دیکھ لیں۔“ اور بے شک یہ کہتے ہوئے اُس ”شوئے“ سے یہ بھی پوچھ لیں کہ کیا اُس نے یہ سٹڈی نہیں پڑھی؟ آپ کے پوچھنے کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ جیسے کہہ رہے ہوں ”برخوردار! آئندہ مجھے چیلنج نہ کرنا۔“

بحث جیتنے سے متعلق دوسری tip یہ ہے کہ دوران گفتگو مختلف حوالے دینے میں کبھی بخل سے کام نہ لیں۔ آپ جتنے حوالے دیں گے، آپ کی بات میں اتنا ہی وزن پیدا ہوگا۔ کوشش یہ کریں کہ زیادہ سے زیادہ امریکی اور برطانوی یونیورسٹیوں کی ریسرچ اور سٹڈیز کے ریفرنس دیں اور ہو سکے تو چند مشکل یونیورسٹیوں کے نام بھی یاد کر لیں جیسے کہ ”میساجیوسٹس، پنسلوینیا“ وغیرہ وغیرہ (یہ نام لینے سے پہلے گھر میں ان کا تلفظ دہرانے کی مشق بلند آواز میں کر لیں۔)

بحث کے دوران آپ کے چہرے پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ ہمہ وقت بچی رہنی چاہیے جو اس بات کا ثبوت ہو کہ بحث میں جیت آپ ہی کی ہوگی۔ مد مقابل چاہے لاکھ مدلل گفتگو کرے، آپ کے چہرے پر ایسی تمسخرانہ مسکراہٹ ہونی چاہیے جو اسے زچ کر دے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی بات ہمیشہ دو ٹوک انداز میں اور قطعیت کے ساتھ کریں، کبھی بھی ایسا نہ لگے کہ آپ کسی بات میں تذبذب کا شکار ہیں۔ ہمیشہ اس طرح بات کریں کہ جیسے اس موضوع پر آپ کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہو۔ مثلاً آپ کا انداز کچھ اس قسم کا ہونا چاہیے..... ”میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر امریکی سینٹ کے صرف 57 ارکان بھی بٹش کی مخالفت کر دیتے تو کبھی عراق جنگ کی نوبت نہ آتی۔“ اسی طرح یہ فقرہ بھی آزمودہ ہے کہ..... ”جو بات آپ کر رہے ہیں، اگر یہ ثابت ہو جائے تو میں اسی وقت استعفیٰ دے دوں گا۔“

## مفید مشورے

ہم لوگوں کو بحث کرنے کا بہت شوق ہے، کوئی نجی محفل ہو، شادی بیاہ کا موقع ہو، دفتر ہو یا پھر کسی کے قُل ہی کیوں نہ ہوں، ہم لوگ کسی نہ کسی بحث میں ہی الجھے نظر آتے ہیں۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ بحث میں یہ ثابت کر سکے کہ اس سے زیادہ قابل آدمی اس روئے زمین پر دستیاب نہیں تاہم خواہش کی یہ تکمیل کچھ زیادہ آسان کام نہیں البتہ کچھ ترکیبیں ایسی ہیں کہ جن پر عمل کر کے عام زندگی میں ہر بحث جیتی جاسکتی ہے۔ ان ترکیبوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بھلے آپ کو موضوع کے متعلق کچھ علم ہو نہ ہو، ان پر عمل کرنے کی بدولت آپ ہی کو صاحب علم سمجھا جائے گا۔ عوام الناس کی آگاہی کے لئے یہ ”مفید مشورے“ فی سبیل اللہ یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔

بحث جیتنے کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ آپ نے کوئی بھی بات سادہ الفاظ میں بیان نہیں کرنی۔ یعنی اگر آپ کسی بھی بات کو گھما پھرا کر، مشکل الفاظ کا لبادہ پہنا کر بیان کر سکتے ہیں تو کبھی بھی اُسے عام فہم زبان میں بیان مت کریں۔ مثال کے طور پر اگر ”موزمبیق“ کی معیشت پر بحث ہو رہی ہو اور آپ کو یہ بھی اندازہ نہ ہو کہ ”موزمبیق“ دنیا کے نقشے میں کس جگہ ہے (خود مجھے بھی اندازہ نہیں) تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کر سکتے۔ اگر آپ یہ دلیل دینا چاہتے ہیں کہ ”موزمبیق“ میں ہر ملازمت پیشہ فرد کو اپنی قابلیت سے کم تنخواہ ملتی ہے (کیونکہ خود آپ کی تنخواہ بھی کم ہے) تو اس دلیل کو سادہ الفاظ کی بجائے یوں بیان کیجئے..... ”موزمبیق کے ایک اوسط شہری کی تنخواہ جو



چند آخری tips..... اپنے مد مقابل کو بات بات پر ٹوکیں مثلاً یہ کہ ”تم جو دلیل دے رہے ہو، اس کے لیے تمہارے پاس کوئی quantifiable indicator ہے.....؟؟؟“ یا یہ کہ ”تم کن parametres کی بناء پر اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہو کہ.....!!!“ آپ یقین کریں کہ ان ترکیبوں کا علم سوائے خشک کتابوں کے مصنفین اور کنسلٹنٹ کے کسی کو نہیں ہو سکتا..... اور ہاں! کبھی کسی بات سے اتفاق نہ کریں، اپنی بات ہمیشہ اختلافی نوٹ سے شروع کریں، کیونکہ اگر آپ نے اتفاق کر لیا تو پھر بحث ہی ختم ہو جائے گی۔

مجھے پورا یقین ہے کہ ان tips پر عمل کرنے کے بعد کوئی بھی آپ سے بحث میں نہیں جیت سکتا۔ اور اگر فرض کریں کہ ایسا ہو جائے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ اُس نے ان tips کو آپ سے پہلے پڑھ لیا ہے۔ اور اگر آپ ان tips کو پہلے پڑھنے کے باوجود اپنے مد مقابل سے بحث میں نہیں جیت پاتے تو پھر یقیناً مد مقابل کوئی خاتون ہے اور خاتون کو جیتنے کے لیے بحث ہارنا بہت ضروری ہے.....!!!

(نوٹ۔ ایک بات کا خاص خیال رکھیں کہ ان tips کا استعمال اُن لوگوں کے سامنے ہرگز نہ کریں جو عام طور پر مسلح رہنا پسند کرتے ہیں)

(3 مئی 2008ء)

ایک ماسٹر tip یہ ہے کہ آپ چند عالمگیر مثالیں صحیح اعداد و شمار کے ساتھ رٹ لیں۔ بلکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ریاضی، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، جغرافیہ، فزکس، معاشیات وغیرہ کے موضوع پر ایک ایک مثال یاد کر لیں۔ چونکہ ہماری زیادہ تر گفتگو انہی موضوعات کے گرد گھومتی ہے اس لیے ہر جگہ اپنی یاد کی ہوئی مثال موضوع کی مناسبت سے بے دھڑک استعمال کریں، کافی افادہ ہوگا۔ مثلاً جب کبھی بھی فزکس کی بات ہو تو محض فزکس کی بجائے ہمیشہ ”کوانٹم فزکس یا نیوٹن فزکس“ کا لفظ استعمال کریں۔ اسی طرح اگر فلسفہ کا ذکر ہو رہا ہو تو بے تکان ”ہیگل اور ڈیکارٹس“ کا نام لیتے جائیں، کوئی آپ کو ٹوکنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ ایک اور ضمنی بات..... کہ گفتگو کرتے کرتے اچانک کسی مشہور کتاب کا حوالہ بھی دے دیں لیکن خیال رہے کہ کتاب زیادہ مشہور بھی نہ ہو، مبادا وہ آپ کے مد مقابل نے تو پڑھ رکھی ہو لیکن آپ نے نہ پڑھی ہو (جس کا کہ زیادہ چانس ہے!!!)

اب میں آپ کو چند ایسے جملے بتانے لگا ہوں جن کی بدولت آپ کبھی بھی بحث میں نہیں ہار سکتے۔ مثلاً.....!!!

☆ انسانیت کی دس ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے.....!!!

☆ پوری یورپین تاریخ ایسے انقلابات سے بھری پڑی ہے۔

☆ بے شک دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی

☆ You are comparing apple with oranges

☆ You are stretching the arguement too much

☆ You are being defensive

یہ تمام تیر بہدف جملے ہیں جن کا ڈسا ہوا پانی بھی نہیں مانگتا۔ آزمائش شرط ہے!!!

اپنی گفتگو میں جہاں تک ہو سکے لاطین یا فرانسیسی الفاظ کا استعمال کریں۔ چند ترکیبیں

یاد کر لیں، بے حد سود مند ثابت ہوں گی، جیسے Lassie-Fare / Quid pro quo

وغیرہ وغیرہ۔ کوئی لائق سے لائق شخص بھی آپ سے ان الفاظ کا مطلب پوچھ کر اپنی کم علمی کا

ثبوت نہیں دے گا، بالفرض محال کوئی ایسا کر بیٹھے تو اپنی روایتی زچ کر دینے والی فاتحانہ

مسکراہٹ چہرے پر لانے کے بعد یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں کہ ”اب آپ سے کیا گفتگو

کی جائے، آپ کو تو بنیادی باتوں کا ہی علم نہیں۔“

(ہیں؟؟)

کچھ لوگوں کو اس بات کی خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ بہت عقل مند ہیں اور ایک مختلط اندازے کے مطابق ایسے لوگوں کی تعداد 90 فیصد سے کچھ زیادہ ہے (باقی 10 فیصد ذہنی امراض کے اداروں میں زیر علاج ہیں!!!) خوش فہمی کے مارے ہوئے ان لوگوں سے گفتگو کرنا اکثر پر لطف تجربہ ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

”حضرت! آپ خاصے عقل مند واقع ہوئے ہیں، ایک مشورہ تو دیجئے کہ.....“

”بھئی مشورہ تو میں بعد میں دوں گا، پہلے میں تمہیں یہ خوش خبری بتا دوں کہ میں نے اس دفعہ اپنا نام صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی کے لئے بھجوا دیا ہے، اور تم دیکھنا کہ اس مرتبہ یہ اعزاز مجھے ہی دیا جائے گا۔“

”ماشاء اللہ یہ تو کمال کی بات ہے..... ویسے تو جناب کی مہارت کئی شعبوں میں ہے لیکن پھر بھی احتیاطاً پوچھ رہا ہوں کہ یہ اعزاز خاص طور پر کس شعبے میں دیا جائے گا؟“

”ہا ہا ہا..... برخوردار! میں نے متواتر 30 سال تک کالج میں لڑکوں کو پی۔ ٹی کروائی ہے اور ہر سال میرا رزلٹ 100 فیصد رہا!!“

”محترم 100 فیصد رزلٹ سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”مطلب یہ کہ میری پی۔ ٹی کی کلاس میں کبھی کوئی لڑکا فیل نہیں ہوا!!“

یقیناً پی۔ ٹی کے شعبے میں گراں قدر خدمات انجام دینے پر ان صاحب کو اس سال صدارتی ایوارڈ مل جائے گا۔

شاعروں ادیبوں سے زیادہ خوش فہم اور کوئی نہیں ہوتا۔ اگر اس دعوے کی حقیقت میں کسی کو شبہ ہو تو وہ بے شک پاک ٹی ہاؤس (مرحوم)، ادبی بیٹھک یا چوپال وغیرہ میں بنفس نفیس کسی شاعر ادیب کو مل کر دیکھ لے۔ میں نے بھی یہی کیا، یعنی پچھلے دنوں شاعر شال، محترم کمال بغدادی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ یوں تو موصوف کے ان گنت اشعار ”ٹرک ز دعاء“ ہیں، تاہم جو شعرا ان کی حقیقی وجہ شہرت بنا وہ کچھ یوں ہے!!!

کہاں جا رہے ہو، کدھر کا خیال ہے

بیمار سائیکلوں کا یہی ہسپتال ہے

کسی نے موصوف سے اس شعر کے وزن کے بارے میں شک کا اظہار کیا تو ٹرک کر

## خوش فہمی

خوش فہمی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اور ہر انسان اس نعمت کا حسب توفیق فائدہ ضرور اٹھاتا ہے۔ اگر ہماری زندگی سے خوش فہمیاں نکل جائیں تو ہماری زندگی بالکل بے رنگ اور پھیکی ہو جائے۔ مثلاً ہر دوسرے شخص کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ دنیا کا حسین ترین انسان ہے..... حسین ترین نہ سہی تو کم از کم پرکشش شخصیت کا مالک ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صبح تیار ہوتے وقت ایسے تمام خوش فہم حضرات دیر تک شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر مختلف زاویوں سے اپنا ہیئر سٹائل بدل بدل کر دیکھتے ہیں اور پھر ایک ہیرو کی مانند سیٹی بجاتے ہوئے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ اب آئینہ چاہے لاکھ انہیں سچائی دکھا رہا ہو کہ صاحب اس نگلی ہوئی توند، پکی رنگت اور بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ”گنج“ کی ابتدائی منزلوں کو طے کرتے ہوئے آپ ہیرو تو کیا ولن کے ”پٹھے“ بھی نہیں لگتے لیکن اس خوش فہمی کا کیا کیا جائے جس میں ہر انسان زندہ ہے۔ اس قدر اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر گھر سے نکلنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سڑک پر چلنے والا ہر شخص اُسی کو دیکھ رہا ہے اور کیوں نہ دیکھے، آخر ایک ”ہیرو“ کو دنیا یونہی دیکھتی ہے!!! ان خوش فہمی کے مارے ہوؤں کو صرف آئینہ ہی نہیں بلکہ آس پاس کے ملنے والے بھی اشاروں کنایوں میں خبردار کرتے رہتے ہیں کہ میاں کچھ خیال کرو، وزن بہت بڑھا لیا ہے، مگر ہمارے یہ خوش فہم دوست ایسی باتوں کو بالکل دل پر نہیں لیتے بلکہ یہ کہہ کر چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں کہ ”آج کل شادیوں کا سیزن چل رہا جس کی وجہ سے ڈانٹ کچھ بڑھی ہوئی ہے، باقی میں بالکل فٹ ہوں۔“ (اللہ جانے یہ لوگ کوئی فنس کی بات کرتے

والی لڑکی ان پر عائد جھوٹے الزامات سے نمٹ سکتی ہے جبکہ صحافت کی ڈگری والی لڑکی میڈیا میں تال میل پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود 26 سالہ وجے کمار پر بدعنوانی کا الزام ہے اور ان کا نام ماؤ نواز باغیوں کی ہٹ لسٹ میں بھی شامل ہے!!!

تاہم خوش فہمی کے اس میدان میں خواتین بھی کسی سے کم نہیں بلکہ مردوں سے دو ہاتھ آگے ہی ہیں۔ اپنے بارے میں تو ہر خاتون یہی سمجھتی ہے کہ وہ دنیا کی خوبصورت ترین، عقلمند اور سکھڑ عورت ہے۔ (ویسے یہ اور بات ہے کہ اگر کسی مرد کو ان خوبیوں کی تلاش ہو تو اسے بھی وجے کمار کی طرح کم از کم تین شادیاں کرنی پڑیں!!!) ایک واجبی شکل کی عورت کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ خوبصورت ہے، ایک خوبصورت عورت کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ حسینہ عالم ہے جبکہ حسینہ عالم یہ سمجھتی ہے کہ وہ پورے لباس میں بھی قیامت ڈھاتی ہے۔

میں ذاتی طور پر خوش فہمی کو کچھ اتنا غلط نہیں سمجھتا کیوں کہ ہمارے ارد گرد بے شمار ایسے انسان ہیں جو محض اپنی خوش فہمیوں کے سہارے ہی زندہ ہیں۔ اگر ان کی یہ خوش فہمیاں ختم ہو جائیں تو یقیناً ان کی موت واقع ہو جائے، تاہم ان تمام لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو چند ماہ پہلے تک پاگل پن کی حد تک خوش فہمی کا شکار تھا۔ یہ شخص میرا محلے دار ہے اور اب جبکہ اس کی ذات کے حوالے سے اس کی خوش فہمیاں دم توڑ رہی ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ کچھ نقصان نہ کر بیٹھے۔ اس کے سابقہ ریکارڈ کو مد نظر رکھتے ہوئے میں ایک بات ضرور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو بھی حرکت کرے گا، نقصان ہمارا ہی ہوگا اس لئے میری دعا ہے کہ وہ جلد از جلد اپنی خوش فہمیوں کے خول سے باہر نکل آئے اور حقیقت کا سامنا کرے، اسی میں ہماری اور اس کی بھلائی ہے!!!

(7 مئی 2008ء)

بولے ”آج کل ”سائیکل“ ویسے ہی بیمار ہے، اُس پر مزید وزن ڈال دیا تو اُس کا ”پٹھہ“ ہی بیٹھ جائے گا۔“ موصوف کی خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ جب ان کو فون کیا جائے تو نہایت متزنم آواز میں خود ہی فرماتے ہیں:

”Hello! Kamal Baghdadi, the famous poet speaking“

صرف یہی نہیں بلکہ پچھلے دنوں ان سے ملاقات ہوئی تو چھوٹے ہی فرمانے لگے کہ ان کی نئی کتاب ”مغلظاتِ بغدادی“ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ میں نے اطمینان سے پوچھا ”کیا پہلا ایڈیشن چوری ہو گیا؟؟؟“ میری بات سن کر انہوں نے بمشکل زبان پر آیا ہوا لفظ واپس نکلتے ہوئے گہرا سانس لے کر کہا ”برخوردار! ابھی تم لوٹدے ہو اس لیے معاف کر رہا ہوں ورنہ آج اگر غالب بھی زندہ ہوتا تو مجھ ہی سے اصلاح لیتا۔“

ہمارے ہاں لوگوں کی خوش فہمیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا آسان نہیں ہے۔ لوگوں کو اپنی ذات پات کے حوالے سے بھی خاصی خوش فہمی ہوتی ہے۔ اگر آپ کسی سے یہ سوال کریں کہ آپ کی ذات کیا ہے؟ تو اس ایک سوال کا جواب سن کر آپ کو لگے گا کہ موصوف نواب ابن نواب ہیں اور ان کا شجرہ نسب بارہویں پشت میں کسی مقدس ہستی سے جاملتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یار لوگ اپنی ذات کے حوالے سے ایسے ایسے دعوے کرتے ہیں کہ ان پر ”بد ذات“ ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایسے ہی ایک خوش فہم صاحب کو میں بھی جانتا ہوں، وہ جب بھی ملتے ہیں ہمیشہ اپنے آپ کو دنیا کی اعلیٰ و ارفع جنس قرار دیتے ہیں۔ ان کی خوش گمانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نوکری کے حصول کے لیے ایک جگہ فارم بھر رہے تھے، جنس کا خانہ آیا تو بلا توقف لکھ دیا ”اعلیٰ و ارفع“۔

لوگوں کی خوش فہمی ایک اور موقع پر بھی اپنے عروج پر ہوتی ہیں اور وہ موقع ہوتا ہے رشتہ تلاش کرنے کا۔ لڑکا بھلے ویلا اور نکما ہو، کالا اور گنجا ہو، مگر اس کی خوش فہمی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے ایسی لڑکی چاہتا ہے جو سرفرد ہو، جس کی بادامی آنکھوں ہوں، رنگت گوری اور چہرہ کتابی ہو۔ ایک خبر کے مطابق بھارت کی ریاست بہار کے ایک رکن اسمبلی نے اپنی دلہن کی تلاش کے لئے اخبار میں اشتہار شائع کروایا ہے جس میں انہوں نے ایسی دلہن کی فرمائش کی ہے جس کے پاس بزنس مینجمنٹ، قانون یا پھر کم از کم صحافت کی ڈگری ہو۔ موصوف کا کہنا ہے کہ ایم۔بی۔اے لڑکی بزنس میں ان کی مدد کر سکتی ہے، قانون کی ڈگری

دونوں کو نے میں لگی ایک میز پر بیٹھ گئے۔

”اور سناؤ سامری تم آج کل کہاں ہوتے ہو اور کیا کرتے ہو؟“ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

”لگتا ہے تم آج کل اخبار نہیں پڑھتے..... برادر میں اب بھی وہیں ہوں جہاں پہلے تھا، یعنی افراسیاب کے محل میں!!“

”واقعی؟؟“ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”کیونکہ میرا خیال تھا کہ شاید تمہارا کٹرلیکٹ کینسل ہو گیا ہو۔“

”ہا ہا ہا.....“ سامری نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا ”تم بھی بھولے کے بھولے ہی رہے، عزیزم میرا کٹرلیکٹ کبھی ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر دور میں افراسیاب کو میری ضرورت رہی ہے اور اب تو شاید پہلے سے بھی زیادہ ہے!!“

”کمال ہے“ میں نے ایک مرتبہ پھر حیرت کا اظہار کیا ”لیکن یار اب تو کوئی بھی تمہارے جادو میں دلچسپی نہیں رکھتا ہوگا کیونکہ آج کل تو ”ڈیوڈ کا پرفیلڈ“ اور ”کرس ائبل“ جیسے جادوگر محیر العقول قسم کے جادو دکھا رہے ہیں، ان لوگوں کے مقابلے میں تمہارے جادو تو بہت آؤٹ ڈیوڈ لگتے ہوں گے۔“

میری بات سن کر سامری کے چہرے پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولا ”پہلی بات تو یہ ہے کہ جن چھپورے لوگوں کا تم نے نام لیا ہے وہ میرے آگے کل کے لوٹے ہیں جنہیں میں چٹکیوں میں اڑا سکتا ہوں، اور دوسری بات یہ ہے کہ آج کل میں نے اپنی فیلڈ کچھ تبدیل کر لی ہے، اب میں افراسیاب کو آئینی امور پر مشورے دیتا ہوں!!“

سامری کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا لیکن سامری کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا، اس نے کافی کا گھونٹ بھرا جو ابھی ابھی بیرے نے میز پر لا کر رکھی تھی، اور اسی ازلی منخوس مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا ”میرا مطلب ہے تمہارا کام تو افراسیاب کو اپنے جادو دکھا کر خوش کرنا ہوا کرتا تھا لیکن تم کہہ رہے ہو کہ.....!!“

”دیکھو بر خوردار!“ سامری میری بات کاٹ کر بولا ”افراسیاب اب ان جادو ٹونوں سے متاثر نہیں ہوتا، اب اس کے پاس موبائل فون ہے، لیپ ٹاپ ہے، ڈیجیٹل سیٹیلٹ ریسیور ہے،

## سامری جادوگر

میں بلال گنج میں اپنی گاڑی کے لئے ”کابلی گوڈے“ خرید رہا تھا کہ اچانک کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا، مڑ کر دیکھا تو ”سامری جادوگر“ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ چونکہ اسے کافی عرصے کے بعد دیکھا تھا اس لئے فوری طور پر پہچان نہیں سکا لیکن جب اس کے چہرے پر موجود ازلی قسم کی مکروہ مسکراہٹ پر غور کیا تو پہچاننے میں مشکل پیش نہیں آئی۔ وہی تو جیسا کالا رنگ، شانوں تک بکھرے لمبے لمبے بال، سرمہ لگی بڑی بڑی کالی آنکھیں، باہر کونکلی ہوئی سرخ زبان، یعنی مجموعی طور پر ایک مکمل منخوس شخصیت۔ اچانک ایسا کوئی شخص اگر راہ چلتے مل جائے تو آپ اس سے پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتے اس لئے میں نے بھی اپنے چہرے کی اندرونی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھا دیا ”ہیلو سامری! کیسے ہو، شاید ہم کئی سال کے بعد مل رہے ہیں؟“ سامری نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے تقریباً زبردستی گلے لگایا اور کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں اور ویسا ہی ہوں جیسا آج سے پچاس سال پہلے تھا مگر لگتا ہے تمہیں اب بھی منافقت کرنی نہیں آئی۔“ اور پھر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں، تم سے اچانک مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ میں نے کھسیانی سی ہنسی ہنسنے ہوئے جواب دیا۔

”تو چلو پھر کہیں چل کر کافی پیتے ہیں اور پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر سامری نے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتا ہوا نزدیکی کیفے میں لے گیا۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد ہم

گارنٹی میں دیتا ہوں..... ہاں ٹھیک ہے، اوکے، بائی۔“  
 ”کیا فون پر عمرو عیار تھا؟“ میں نے سامری کو گھورتے ہوئے پوچھا ”جہاں تک مجھے علم ہے،  
 عمرو سے تو تمہاری دشمنی تھی۔“  
 ”تم ٹھیک کہتے ہو مگر یہ پرانی بات ہے، اب ہم نے ”مفاہمت“ کر لی ہے!!“ سامری نے  
 اطمینان سے جواب دیا۔

”یار تمہاری باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آ رہیں۔“ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور منہ  
 پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا، سامنے سے ایک خوبصورت لڑکی آ رہی تھی۔ تاہم اس وقت  
 میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ لڑکی سیدھی ہماری میز کی طرف آئی  
 اور اچانک اپنا سینڈل اتار کر سامری کے سر پر دے مارا۔ سامری بلبلاتا اٹھا!!!! اس سے پہلے کہ  
 میں کچھ سمجھتا، لڑکی اسی تیزی کے ساتھ واپس پلٹ گئی۔ میں نے سامری کی طرف دیکھا، جو  
 ابھی تک اپنا سر پکڑے کراہ رہا تھا۔

”یہ لڑکی کون تھی؟“ میں نے سکتے کے عالم میں پوچھا۔ جواباً سامری نے ایک بلخ گالی نکالی  
 اور نارمل ہوتے ہوئے بولا ”نو پرابلم! یہ سول سوسائٹی کی نمائندہ تھی اور محض اپنے جذبات کا  
 اظہار کر رہی تھی۔“ میں نے حیرت سے پوچھا ”جذبات کے اظہار کا یہ کون سا طریقہ  
 ہے؟“ سامری نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور اطمینان سے بولا ”یار  
 یہ سول سوسائٹی آج کل خاصی aggressive ہو رہی ہے، اپنے جذبات کا اظہار ایسے ہی  
 کرتی ہے، شیطان کا شکر ہے کہ عزت بچ گئی!!!“

”لا حول ولا قوۃ..... یقیناً ایسی عزت شیطان ہی کی بدولت ہو سکتی ہے۔“ میں نے جل کر  
 کہا۔

”یار کم از کم لا حول تو نہ پڑھو..... ویسے ہی کہہ دو، میں چلا جاتا ہوں۔“ سامری اٹھتے ہوئے  
 بولا ”ویسے بھی افراسیاب کے ایس ایم ایس آ رہے ہیں، کوئی ایمر جنسی لگتی ہے۔“  
 ”تب تو تمہیں فوراً حاضری دینی چاہیے“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ”ایمر جنسی ہی تو تمہاری  
 چاندی کی وجہ بنی ہے!!“

یہ کہتے ہوئے میں نے کافی کے پیسے میز پر رکھے اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں اچانک  
 سامنے والی میز پر بیٹھا ہوا ایک شخص اٹھا اور تیزی سے ہماری طرف لپکا۔ ہم دونوں چونک

انٹرمیٹ ہے، ایل۔سی۔ ڈی ٹیلی وژن ہے..... بھلا بتاؤ ان چیزوں سے بڑا جادو کیا ہوگا؟“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ تم نے آئینی مشوروں والی بات کیا کہی ہے؟“ میں نے اچھے ہوئے  
 لہجے میں پوچھا ”افراسیاب تو ایک بادشاہ ہے، بھلا اسے کن آئینی مشوروں کی ضرورت ہو سکتی  
 ہے، اور پھر تم ٹھہرے ایک جادوگر.....!!“

سامری نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک قہقہہ لگایا اور پھر ایک بے موقع  
 شعر پڑھا ”ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد.....“ اور پھر یک بیک چہرے پر  
 سنجیدگی طاری کر لی، سنجیدہ ہونے سے پہلے وہ ہمیشہ ایک بے محل شعر پڑھا کرتا تھا۔ ”یار اصل  
 میں بات یہ ہے کہ تم جیسے لوگ چاہے جتنا بھی پڑھ لکھ جائیں مگر رہتے ”ڈنگر“ ہی ہیں..... آج  
 کل بادشاہت کرنے کے ڈھنگ بھی بدل گئے ہیں، اب افراسیاب جیسے بادشاہ کو بھی کسی نہ  
 کسی سچے جھوٹے آئین کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بغیر حکومت کرنا آج کل ذرا مشکل ہو  
 گیا ہے، اور پھر یہ آئینی مشورے دینا بھی کسی جادو سے کیا کم ہے؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ تم اب بھی ایک جادو کا کام ہی کر رہے ہو مگر ذرا مختلف انداز میں؟“  
 میں نے پوچھا۔

”شیطان تمہارا بھلا کرے“ سامری پہلی مرتبہ خوش ہو کر بولا ”اب تم کچھ سمجھنے لگے  
 ہو، اصل میں تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میں اب تقریباً نوے سال کا ہو چکا ہوں اور اصولی طور پر  
 مجھے ریٹائرمنٹ لے لینی چاہیے لیکن کیا کروں، یہ افراسیاب ہی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا کیونکہ  
 اس کی بادشاہت میرے مشوروں کے دم سے ہی قائم ہے۔“

”آہ..... تب تو تم افراسیاب سے کافی پیسے اینٹھ لیتے ہو گے؟“ میں نے سامری کو آنکھ  
 مارتے ہوئے کہا۔

”ہاں، شیطان کا شکر ہے اب تک میں تقریباً پانچ کروڑ روپے ”کنسلٹنسی“ کے ہیڈ میں سے  
 وصول کر چکا ہوں۔“ سامری نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”مگر اس کافی کے پیسے  
 پھر بھی تم ہی ادا کرو گے۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگانا چاہا مگر اس کے موبائل فون کی گھنٹی نے  
 اس کی ہنسی کا گلا گھونٹ دیا۔ ”ایس..... سامری سپیکنگ..... ہاں ابھی عمرو عیار کیا بات ہے؟ کیا  
 کہا..... ڈیل کے بارے میں شبہ ہے؟ نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں، تمہارے ساتھ کی گئی ہر  
 ڈیل کو آنر کیا جائے گا، اوہو..... قانونی دفعہ کو دفع کرو اور تم بالکل بے فکر رہو..... افراسیاب کی



## کافی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلباء کے ایک گروہ نے، جو اپنی اپنی زندگیوں میں ”سیٹل“ ہو چکے تھے، فیصلہ کیا کہ وہ اپنے یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر سے ملنے جائیں گے۔ جب وہ اس کے گھر پہنچے تو پروفیسر اپنے پرانے شاگردوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ گپ شپ شروع ہوئی اور پھر جلد ہی گفتگو کا رخ ان کی زندگیوں اور روزمرہ کے کاموں کی ٹینشن کی طرف مڑ گیا، ہر کوئی اپنی زندگی میں موجود الجھنوں کی شکایت کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر پروفیسر چپکے سے اٹھا، کچن میں جا کر ان سب کے لئے کافی بنائی اور پھر اسے بڑی سے ”پاٹ“ میں ڈال کر لے آیا۔ اس نے کافی کی ٹرے میز پر سجائی، جس میں مختلف قسم کے کپ رکھے تھے، ان میں سے کچھ کپ سادے اور سستے سے تھے جبکہ کچھ کپ مہنگے اور سٹائلش تھے۔ پروفیسر نے اپنے ان سابقہ شاگردوں سے کہا کہ وہ خود ہی اپنے لئے کافی ڈال لیں۔ جب سب لوگوں نے اپنے اپنے کپ میں کافی ڈال لی تو پروفیسر نے ان پر ایک نگاہ ڈالی اور بولا ”تم سب نوٹ کرو کہ تم میں سے ہر ایک نے اپنے لئے بہترین کپ کا انتخاب کیا ہے جبکہ سستے اور گھٹیا کپ ویسے کے ویسے ہی رکھے ہیں، گو یہ بڑی نارمل بات ہے کہ تم اپنے لئے بہترین چیز کا ہی انتخاب کرو، لیکن اصل میں تمہاری یہی چوائس ہی تمہارے تمام مسائل اور ٹینشن کی وجہ ہے۔“

اپنے پروفیسر کی بات سن کر تمام لوگ حیران ہو گئے، ان کی حیرانی دیکھ کر پروفیسر مسکرایا اور پھر بولا ”تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ کپ بذات خود کافی کی کوالٹی میں کوئی اضافہ نہیں

گئے، سامری نے کچھ سوچا اور پھر یکدم جمپ لگا کر میرے عقب میں چھپ گیا۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔ سامری نے میرے کان میں سرگوشی کی ”سول سوسائٹی!!!“۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُسے دلا سہ دیا ”ڈونٹ وری..... اُس نے سینڈل نہیں بوٹ پہن رکھے ہیں اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بوٹ اتنی جلدی نہیں اُترتے۔“ میری بات سن کر سامری کو کچھ اطمینان ہوا، اتنے میں وہ شخص سامری کے قریب آیا اور نہایت عزت سے بولا ”کیا آپ ہی سامری جادوگر ہیں؟“ سامری نے فخر سے گردن اکڑائی اور سامنے آتے ہوئے پوری نخوت سے بولا ..... ”تم نے ٹھیک پہچانا..... کہو کیا بات ہے؟“ یہ سنتے ہی آنے والے شخص نے رسان کے ساتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ”قینچی چپل“ نکالی اور اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا، پٹاخ سے سامری کے سر میں دے ماری۔ میں نے ایک نظر مرغ بلبل کی طرح تڑپتے ہوئے سامری پر ڈالی اور کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا کیفے سے باہر نکل آیا۔

(16 مئی 2008ء)

کئے بغیر ہی تمام پیالیاں سمیٹ کر یہ جاوہ جا۔

دوسرے قوعے کے بعد مجھے کچھ فرسٹریشن سی محسوس ہوئی مگر میں نے ایک ٹرائی مزید کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مرتبہ میں نے اپنے ایک خوش خوراک دوست کو کھانے پر بلایا۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو قوع موصوف نے بیٹھے کی فرمائش کی، میں تو اسی بات کا منتظر تھا، فوراً ہی اس کے آگے کھیر اور پیالیاں سجا دیں اور خود تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ موصوف ڈونگے میں سے ہی ساری کھیر صاف کر چکے ہیں، مجھ پر نظر پڑی تو مسکرا کر بولے ”یار میرے علاوہ کوئی اور مہمان تو تھا نہیں لہذا میں نے سوچا اپنا ہی گھر ہے..... تکلف کیا..... بھئی بہت ہی مزیدار کھیر تھی۔“

نارل لوگ اس قسم کے تجربات کے بعد عموماً خود کشی کر لیتے ہیں، میں چونکہ کچھ ابنارمل واقع ہوا ہوں اس لئے میں نے ایک حتمی قسم کا آخری چانس لینے کا فیصلہ کیا۔ اس دفعہ میں نے ایک سرکاری ملازم کو یہ کہہ کر گھر پر بلایا کہ اسے ایک سپیشل قسم کی کھیر کھلانی ہے۔ چونکہ میں اس مرتبہ کسی قسم کا کوئی چانس نہیں لینا چاہتا تھا اس لئے میں نے اس کے سامنے ڈونگے میں کھیر سجا دی اور کہا کہ وہ کوئی سی بھی پیالی منتخب کر کے اس میں کھیر ڈال لے۔ میری بات سن کر وہ تسمنہ لہجے میں بولا ”یہ تم مجھے کھیر کھلا رہے ہو یا پھر فال نکلا رہے ہو؟“ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا کہ وہ ادھر ادھر کی باتیں نہ کرے اور جلدی سے اپنے لئے پیالی کا انتخاب کرے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا اور پھر بولا ”کھیر تو میں کھا لوں گا، لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ اس کام کے مجھے کتنے پیسے دو گے؟“

ایک لمحے کے لئے تو میرے دل میں آیا کہ کھیر کا ڈونگا توڑ کر اس کا ٹوٹا ہوا حصہ اس کے پیٹ میں گھسیڑ دوں لیکن پھر سوچا کہ اس اقدام سے دل کی تسلی تو ضرور ہو جائے گی مگر ساتھ میں پھانسی بھی پکی ہے جسے رکوا یا بھی نہیں جاسکے گا۔ ویسے تو میں دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ یہ میرا آخری چانس ہوگا لیکن پھر میں نے سوچا کہ اپنے دل میں کئے گئے وعدے پر نظر ثانی کرنے میں کوئی حرج نہیں، یوں بھی یہ وعدہ عوام سے نہیں کیا گیا تھا!! یہی سوچ کر میں نے آخری حربے کے طور پر ایک مولانا کو آ زمانے کا فیصلہ کیا اور اس مرتبہ ”مینو“ میں ایک چھوٹی سی تبدیلی بھی کر ڈالی یعنی کھیر کو حلوے سے تبدیل کر دیا۔ مولانا کو گھر پر دعوت دی، کھانا اور حلوہ ان کے آگے سجایا اور خود دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ کھانا تناول فرمانے کے بعد حضرت نے

کرتا، زیادہ سے زیادہ وہ اس چیز کو چھپا لیتا ہے جو تم پینا چاہتے ہو۔ تم سب لوگ بھی اصل میں اچھی سی کافی پینا چاہتے تھے چاہے وہ کسی بھی قسم کے کپ میں ہوتی لیکن تم لوگوں نے شعوری طور پر اپنے لئے بہترین کپ کا انتخاب کیا اور پھر ایک دوسرے کے کپ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ زندگی بھی دراصل اس کافی کی مانند ہے جبکہ تمہارا پیسہ، تمہاری نوکری اور سوسائٹی میں تمہارا مقام کپ کی طرح ہے۔ تمہارے ہاتھ میں جو بھی جیسا بھی کپ ہو، وہ تمہاری زندگی کی ”کوالٹی“ تبدیل نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات ہم محض ”کپ“ پر ہی اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیتے ہیں اور ”کافی“ کا مزہ ہی نہیں لے پاتے، خدا ہمیں ”کافی“ دیتا ہے جبکہ انسان ”کپ“ کا انتخاب کرتا ہے، یہیں سے ساری ٹینشن شروع ہوتی ہے، لہذا سادہ زندگی گزارو اور اپنی ”کافی“ کو انجوائے کرو۔“

میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو فوراً ذہن میں خیال آیا کہ مجھے بھی یہ ”کافی“ والی بات لوگوں سے شیئر کرنی چاہیے، ایک تو لوگوں کی رہنمائی ہوگی اور دوسرے اس پروفیسر کی طرح میری قابلیت کا سکھ بھی جھے گا۔ تاہم میں نے سوچا کہ اپنے لوگوں سے شیئر کرنے سے پہلے اس واقعے کو ”دیسی تڑکا“ لگا لیا جائے چنانچہ میں نے کافی کی جگہ کھیر کھلانے کا فیصلہ کیا۔ میرا حلقہ احباب چونکہ خاصا متنوع قسم کا ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ سب لوگوں کو اکٹھے بلانے کی بجائے ان سے فرداً فرداً مل کر یہ تجربہ کر لیا جائے۔

سب سے پہلے میں نے راجو بلکی کے سامنے ایک ڈونگے میں کھیر رکھی اور ساتھ میں مختلف قسم کی اعلیٰ اور گھٹیا پیالیاں سجا دیں۔ راجو نے ایک نظر کھیر پر ڈالی لیکن پھر کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولا ”سرجی! آپ کو تو پتہ ہے کہ مجھے کھیر نہیں پکتی۔“ اس سے پہلے کہ میں کھیر کا ڈونگا راجو کے سر پر دے مارتا، میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے فقط اتنا ہی کہا کہ ”راجو تم نے تو ”کھوتا“ ہی ”کھو“ میں پھینک دیا ہے۔“

گو کہ میرا پہلا تجربہ ہی ناکام رہا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور فیصلہ کیا کہ اس دفعہ کسی خاتون کو موقع دیا جائے چنانچہ میں نے بلی کو بلایا اور ایک مرتبہ پھر اسی طرح اس کے سامنے ڈونگے میں کھیر رکھی اور ساتھ میں مختلف قسم کی اعلیٰ اور گھٹیا پیالیاں سجا دیں۔ بلی نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر بولی ”واؤ..... تمہارے پاس کس قدر خوبصورت اور ”اینٹیک“ پیالیاں ہیں، یہ سب میرے لئے لائے ہو نا..... ہاؤ سوپٹ!!“ اور پھر میرے جواب کا انتظار

بیٹھے کی طرف توجہ کی تو حلوے کو دیکھ کر مایوسی سے سر ہلایا اور بولے ”بھائی! اب بیٹھے میں حلوہ کون کھاتا ہے، آج کل تو سویٹ میں ”چاکلیٹ چپ“ یا ”بنانا بوٹ“ یا پھر کم از کم ”ہاٹ فٹ“ جیسے فلیورز کی آئس کریم تو ہو۔“

مولانا کی بات سن کر میں بھونچکا رہ گیا، مجھے ان سے اس رسپانس کی امید ہرگز نہیں تھی تاہم میں نے دل کڑا کر کہا ”جناب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ یہ سب تو فرنگیوں کے بنائے ہوئے فلیور ہیں!!“ میری بات سن کر مولانا نے ہلکا سا تبسم فرمایا اور بولے ”برخوردار! ہم فرنگیوں کے خلاف ضرور ہیں لیکن اگر ہم اسی طرح انکی بنائی ہوئی چیزوں کا استعمال چھوڑنے لگیں تو پھر ہمیں اونٹوں پر سفر کرنا پڑے اور اے سی کے بغیر گرمیاں گزاریں گی۔“

تفنن برطرف، میرا خیال ہے کہ اصولی طور پر ہمیں اس پروفیسر کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنی ”کافی“ کو انجوائے کرنا چاہئے لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری زندگی (کافی) کی کوالٹی اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ اب اسے انجوائے نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اپنی زندگی کی ”کافی“ کسی اعلیٰ کپ میں ڈالیں یا گھٹیا کپ میں..... اب وہ بد ذائقہ ہو چکی ہے اور ہم روزانہ اسی بد ذائقہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک تو ٹھیک ہے تاہم میرا خیال یہ ہے کہ اپنی کافی کو بد ذائقہ کرنے کے ذمہ دار بھی ہم خود ہی ہیں کیونکہ ہم اپنی کافی کو نوکری اور سٹیٹس کے مختلف اعلیٰ قسم کے cups میں ڈالتے رہتے ہیں جس سے ہماری کافی ٹھنڈی اور بد ذائقہ ہو جاتی ہے، ہم اس گرم گرم کافی کو انجوائے ہی نہیں کر پاتے جو خدا کی طرف سے ہمیں ملی تھی۔

(20 مئی 2008ء)

## یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے

ہم لوگوں کو دوسروں کی ٹوہ میں رہنے کی بہت عادت ہے اور یہ عادت اس قدر پکی ہو چکی ہے کہ اگر ہم سے کسی کی نگرانی کرنے کو کہا جائے تو ہم دو دن اس کی نگرانی کرنے کے بعد ”صوبیدار لیول“ کی ایک اچھی خاصی رپورٹ مرتب کر کے دے سکتے ہیں۔ چونکہ دوسروں کی جاسوسی کرنا ہماری فطرت بن چکا ہے اس لئے ہم اکثر یہ کام لاشعوری طور پر بھی بلا کسی خاص مقصد کے انجام دیتے رہتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ جو دفاتروں میں کام کرتے ہیں، ہر وقت اس بات کی فکر میں رہتے ہیں کہ کون کس کے پاس بیٹھایا بیٹھی ہے، کون اخبار پڑھ رہا ہے، باس سے کون کون ملنے جاتا ہے اور کیا بات کرتا ہے، کون ٹیلی فون پر کہیں بانک رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے چہرے اسی بھی اچھے خاصے جاسوس ہوتے ہیں، کسی دوسرے کے کمرے میں دروازے کی جھری میں سے دیکھ کر اپنے صاحب کو سرگوشی کے سے انداز میں کچھ اس قسم کی اطلاع دیتے ہیں ”سرجی! ان کے کمرے میں تو دبا دب بوتلیں چل رہی ہے۔“ یہ کمبخت ”بوتلوں“ کی اطلاع کچھ اس انداز میں دیتے ہیں کہ سننے والا ایک مرتبہ پھر انہیں ”سوہ“ لینے بھیج دیتا ہے اور اس مرتبہ یہ کچھ اس قسم کی خبر لاتے ہیں ”جناب! اب تو انہوں نے اپنے لئے ”نمکو“ بھی منگوا لی ہے!!!“ لیجیے ہو گیا کام تمام۔ اب اگر تو اس چہرے کے صاحب اس شخص کے باس ہیں جس کی مجبری کی گئی ہے تو پھر یہ افسر صاحب اپنے چہرے کی باتوں پر ایمان لاتے ہوئے اپنے ماتحت کو رگڑ دیں گے اور اگر محض کو لیگ ہیں تو پھر یہ صاحب ان مرچ مصالحہ لگی خبروں کو فی سبیل اللہ دفتر میں ہر خاص و عام میں پھیلا

دفعہ موصوف ایک خاتون کی نگرانی کر رہے تھے جو کسی زمانے میں ان کی محلے دار رہ چکی تھیں۔ وہ محترمہ اپنے آفس سے نکلیں تو ساتھ میں ایک نوجوان بھی تھا جس سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں، تھوڑی دیر بعد وہ نوجوان اس خاتون سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی خاتون نے اپنا موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملایا، یہ دیکھ کر ہمارے ”ایکس ٹو“ صاحب ایک درخت کی اوٹ لے کر اس خاتون کے قریب ہو گئے اور ان کی گفتگو سنی جو کچھ اس قسم کی تھی ”ہیلو..... پس مائی ڈیر..... پس میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی، اصل میں وہ منحوس ابھی گیا ہے، ہاں، اوکے، بائی۔“ فون بند کرتے ہی اس عقیفہ کے موبائل کی بیل بجی، اس مرتبہ اس نے کچھ اس قسم کا فون سنا ”ہیلو! سویٹ ہارٹ، ہاؤ آر یو؟..... میں بھی تمہیں بہت مس کر رہی ہوں پر کیا کروں آفس میں اتنا کام ہے کہ ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہیں نکل سکتی، ہاں ٹھیک ہے، اوکے، بائی۔“ واضح رہے کہ ہمارے ”ایکس ٹو“ صاحب اس قسم کی سکہ بند رپورٹ لینے میں شاز و نادر ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

پچھلے دنوں موصوف میرے پاس آئے اور حسب عادت میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے ”مجھے لگتا ہے کہ عنقریب تمہارے دفتر میں بغاوت ہو جائے گی، میرے ذرائع نے مجھے یہی بتایا ہے۔“ میں نے برادر ”ایکس ٹو“ کی اطلاع کو نہایت دلچسپی کے ساتھ سنا اور پھر پوچھا ”کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ یہ اطلاع تمہیں کن ذرائع سے ملی ہے؟“ یہ سن موصوف کے چہرے پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولے ”ایک جاسوس اپنا source کبھی نہیں بتاتا۔“ یہ سن کر میں نے قہقہہ لگایا اور کہا ”میں تمہارے ذرائع اچھی طرح جانتا ہوں، تمہارا پہلا سورس ہمارا وہ کینیٹین والا ہے جس کے چائے کے پیسے ہم نے ابھی تک ادا نہیں کئے اور تمہارا دوسرا سورس وہ چڑاسی ہے جسے ہم نے پچھلے مہینے نوکری سے فارغ کیا تھا، یہ دونوں اشخاص ہم سے خار کھائے بیٹھے ہیں اور ہر آنے جانے والے سے اسی قسم کی گفتگو کرتے ہیں جیسی انہوں نے تمہارے ساتھ کی ہے۔“ ظاہر ہے کہ یہ بات سن کر کوئی بھی معقول آدمی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا لیکن نذیر احمد چونکہ ایک نامعقول انسان ہے اس لئے اس نے نہ صرف اگلے کئی گھنٹے میرے ساتھ گزارے بلکہ کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھایا۔

فی سبیل اللہ جاسوسی کرنے والوں کی فہرست یوں تو کافی لمبی ہو سکتی ہے تاہم ان میں

دیں گے۔ ہر دو صورتوں میں ان صاحب کے ذوق کی تسکین ہو جائے گی اور اس بیچارے کی کوئی نہیں سنے گا کہ اس نے محض پیٹ درد میں افاتے کی نیت سے ”ڈائٹ سیون اپ“ منگوائی تھی۔

مخبری کا ایک انداز گھروں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے مگر ایسا زیادہ تر ان گھروں میں ہوتا ہے جہاں بہت ساری نندیں، بہوئیں، بھابھیاں اور ایک عدد ساس ہو۔ یہ سب ایک دوسرے کی by default جاسوس ہوتی ہیں۔ ان گھروں میں intelligence اور counter intelligence کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ اگر کوئی بہو ہانڈی میں سے زائد بوٹی نکال کر کھالے تو اوپری منزل پر بیٹھی بھابھی کو وہیں خبر پہنچ جاتی ہے۔ اس خبر رسانی میں بچے بھی نہایت اہم بلکہ گھناؤنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر چھوٹی نند کالج سے لیٹ آئی ہو تو بڑی بہو کا منجھلا لڑکا کچھ اس قسم کی اطلاع دے گا ”امی جان! چھوٹی خالہ کو ابھی کوئی گاڑی میں چھوڑ کر گیا ہے۔“ یہ سن کر بہورانی کی آنکھوں میں چمک سی آجائے گی اور وہ پوچھیں گی ”پنٹو! سچ بتا کون چھوڑ کر گیا ہے، کس طرح کا حلیہ تھا، تم نے دیکھا؟“ اس پر منحوس پنٹو بولے گا ”میں نے خود تو ٹھیک سے نہیں دیکھا لیکن وہ سامنے والا نہ تھا رہا تھا کہ اس کی بڑی بڑی موچھیں تھیں اور خالہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی!!!“ انا للہ وانا علیہ راجعون۔

میرے ایک دوست کو بھی خواخواہ جاسوسی کرنے کا بہت شوق ہے۔ موصوف کا نام تو نذیر احمد ہے لیکن اپنے آپ کو ”ایکس ٹو“ کہلوانا پسند کرتے ہیں اور عموماً تاریک شیشوں والی عینک لگائے رکھتے ہیں۔ دانتوں میں سگار دبا رہتا ہے جو محض دکھانے کے لئے ہے کیونکہ جب پینے کا ٹائم آتا ہے تو قبلہ ”ایکس ٹو“ بیڑی سے شوق فرماتے ہیں۔ کانوں میں ”بلیو ٹوٹھ“ (کوئی مائی کال ل اس کا ترجمہ کر کے دکھائے) کا آلہ لگا کر رکھتے ہیں اور یہ دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جیسے انہیں ہمہ وقت جاسوسی پیغامات موصول ہوتے رہتے ہیں تاہم میرے اندازے کے مطابق موصوف کو اس ”لاسلی آلہ سماعت“ کے ذریعے محض بیوی کی گالیاں ہی لائیو وصول ہوتی ہوں گی۔ یہ صاحب اکثر شوقیہ لوگوں کا پیچھا کرتے ہیں اور اس عادت کی وجہ سے کئی دفعہ پٹ بھی چکے ہیں مگر مجال ہے جو جاسوسی کا جذبہ ماند پڑا ہو۔ مجھے ایک آدھ مرتبہ ان کی ”رپورٹیں“ سننے کا اتفاق ہوا ہے جو کبھی کبھار دلچسپ ہوتی ہیں۔ ایک

## ایک گھنٹہ نہیں، چھ ماہ آگے کریں!!!

”بھائی جان! ٹائم کیا ہوا ہے؟“ موٹر سائیکل کو روکتے ہوئے ایک نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔

”آٹھ بجے ہیں۔“ میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا تو اس کا مطلب ہے سات بجے ہیں۔“ نوجوان بڑبڑایا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ”نہیں یار پورے آٹھ بجے ہیں۔“

اس پر نوجوان کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا ”وہی تو میں کہہ رہا ہوں جناب کہ گھڑی پر آٹھ بجے ہیں لیکن ویسے تو سات ہی بجے ہیں ناں.....“

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اتنی دیر میں نوجوان نے موٹر سائیکل کو بک لگائی اور ہوا ہو گیا۔

میں دفتر پہنچا تو وہاں چوکیدار کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو

بولا ”صاحب! ابھی تو 7 بجے ہیں، دفتر تو 8 بجے لگتا ہے۔“ میں نے اُس سے کہا کہ آج سے

گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے ہو گئی ہیں اس لیے اس وقت سات نہیں بلکہ آٹھ بجے ہیں۔ یہ سن کر

اس نے دانت نکالے اور بولا ”صاحب جی! بھلا ایک گھنٹہ پہلے ہی ایک گھنٹہ آگے کیسے کیا

جاسکتا ہے؟“ میں نے اُس جاہل سے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے دفتر میں جا کر

بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میرا ایک کولیگ بھی آ گیا، میں نے احتیاطاً اس سے ٹائم پوچھا تو آنکھ

مار کر بولا ”کون سا ٹائم، پرانے والا یا نئے والا؟“ میں نے جواب دینے کی بجائے محض

ایک گروہ ایسا ہے جس کے تذکرے کے بغیر یہ کالم مکمل نہیں ہو سکتا اور وہ ہے گلی محلوں کے دکاندار یا تھڑوں پر بیٹھنے والے بزرگوار۔ ویسے تو یہ رواج اب ختم ہوتا جا رہا ہے تاہم ابھی بھی اندرون شہر میں یہ روایت کچھ کچھ برقرار ہے۔ اب سے کئی سال پہلے جب میں ایک انگریزی روزنامے میں کرائم رپورٹر ہوا کرتا تھا، اندرون شہر میں ایک جوان لڑکی کا قتل ہو گیا۔ جب میں اس محلے میں پہنچا اور لوگوں سے قتل کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنی شروع کیں تو ایک ادھیڑ عمر کے صاحب مجھے ہاتھ سے پکڑ کر سائیڈ پر لے گئے اور فرمانے لگے کہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے محلے کی عزت اخباروں میں اچھالی جائے لہذا میں فوراً وہاں سے چلا جاؤں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان کو کیا جواب دوں، وہ صاحب خود ہی بولے ”میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں برخوردار، مجھے سب پتا ہے کس گھر میں کیا ہو رہا ہے، مجھے اس لڑکی کے بارے میں بھی علم تھا کہ چار گھر چھوڑ کر جو لڑکا رہتا ہے، اس کے ساتھ اس کا چکر تھا اور اسی چکر میں اس کا قتل ہو گیا، لیکن میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا، خدا سب کی عزتیں سلامت رکھے۔“ خدا واقعی سب کی عزتیں سلامت رکھے کیونکہ پولیس تفتیش کے ایک ماہ کے بعد پتا چلا کہ بیچاری لڑکی کے باپ کا چند ماہ پہلے انتقال ہوا تھا، وہ جائیداد کی اکلوتی وارث تھی، اور اس کے چچا نے پیسوں کی لالچ میں اس کا قتل کر دیا۔

مجھے ان تمام خدائی فوجدار قسم کے جاسوسوں سے سخت چڑ ہے۔ یہ اپنی نام نہاد معلومات کی بنیاد پر اپنے آپ کو بہت ”ویل انفارمڈ“ سمجھتے ہیں اور اپنے ارد گرد ہونے والے ہر واقعے کے بارے میں برملا دعویٰ کرتے ہیں کہ ”مجھے سب پتا ہے۔“ یہ ان لوگوں کا محبوب فقرا ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی بیچارہ کسی بات کے بارے میں ایمانداری کے ساتھ لاعلمی کا اظہار کر دے تو اسے اس کی ”لاعلمی“ کے طعنے دے دے کر ہی مار چھوڑتے ہیں۔ ہمیں ان کے طعنوں سے بچنے کے لئے ان جیسا بننے کی کوئی ضرورت نہیں، ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ ہمیشہ سچائی تلاش کی جائے اور اسی کا اظہار کیا جائے، بے شک یہ ایک مشکل ترین کام ہے۔

(27 مئی 2008ء)



میرے ایک کرم فرما ایسے بھی ہیں جنہیں اپنی قابلیت جھاڑنے کا بہت شوق ہے، جب سے گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے ہوئی ہیں، انہوں نے اپنی علیمت کی دھاک بٹھانے کے لیے میرے کئی گھنٹے ضائع کر دیئے ہیں۔ تاہم تیسری دفعہ جب وہ اس موصوع پر مجھ سے بحث کرنے کے لئے تشریف لائے تو میں نے بھی اچھی خاصی تیاری کر رکھی تھی چنانچہ جونہی ان سے ملاقات ہوئی میں نے انہیں کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر پہلے ہی سوال داغ دیا کہ گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے کرنے سے ہمیں حقیقت میں توانائی کی کس قدر بچت ہوگی؟ ابھی انہوں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے جھٹ سے کہا ”نہیں معلوم.....؟ کوئی بات نہیں، میں بتاتا ہوں..... گھڑیاں آگے کرنے کا رواج مغرب میں خاصا پرانا ہے، عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اس پریکٹس سے توانائی کی بچت ہوتی ہے مگر چند سٹڈیز سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اس بات میں کوئی خاص سچائی نہیں..... مثلاً سن 2000ء میں آسٹریلیا کے کچھ حصوں میں یہ پریکٹس شروع کی گئی تو مجموعی طور پر بجلی کے خرچ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ الٹا صبح کے وقت بجلی کا لوڈ بڑھ گیا جس سے اس کے نرخ بھی بڑھ گئے۔ اسی طرح مغربی آسٹریلیا میں 2006-07ء میں مجموعی طور پر بجلی کے خرچ میں %0.6 اضافہ ہو گیا۔ کیلیفورنیا میں 2007ء جب یہ پریکٹس شروع کی گئی تو پتا چلا کہ اس سے بجلی کے خرچ میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور 2008ء کی ایک سٹڈی کے مطابق امریکہ کی ایک اور ریاست میں جب یہ کام شروع کیا گیا تو گھریلو بجلی کے خرچ میں الٹا %4 تک اضافہ ہو گیا۔“ میری بات سننے کے بعد وہ صاحب کچھ دیر تک مجھے خشمگیں لگا ہوں سے دیکھتے رہے اور پھر مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ نہ جانے لوگ اس قدر حاسد کیوں ہوتے ہیں؟

گھڑیاں آگے کرنے کا کم از کم ایک فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ اب ہم یکدم پسماندہ ممالک کی صف میں سے نکل کر ترقی یافتہ ممالک سے بھی ایک گھنٹہ آگے نکل گئے ہیں۔ لیکن نہیں..... محض ایک گھنٹے سے کام نہیں چلے گا، ہمیں تو گھڑیوں کی بجائے اپنا پورا کیلیڈنر ہی چھ ماہ آگے کر دینا چاہیے، اس کا یقیناً خاطر خواہ فائدہ ہوگا!!! مثلاً سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہمارے کیلیڈنر پر جب یکم جون کی بجائے یکم دسمبر کی تاریخ ہوگی تو ہمیں سردی کی وجہ سے تمام اے۔سی اور نچکے بند کرنے پڑیں گے جس سے بجلی کی فوری بچت ہوگی اور لوڈ شیدنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ بچے یکدم چھ ماہ بڑے ہو جائیں گے

مسکرائے پر ہی اکتفا کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دفتر کی حاضری پوری ہو گئی اور پھر توقع کے عین مطابق ”گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے کرنے“ والی بحث چھڑ گئی۔ لوگ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے، کسی کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی گھڑی آگے نہیں کی اور وہ پرانے ٹائم کے مطابق ہی چلے گا، کسی نے کہا کہ اس نے اپنے گھر میں سوائے ایک کے تمام گھڑیاں آگے کر لی ہیں، کسی نے کہا کہ آج سے وہ ہمیشہ دو ٹائم بتایا کرے گا، ایک سرکاری اور دوسرا اصلی!!! تاہم سب سے دلچسپ حرکت ایک صاحب نے کی جو دو گھڑیاں لگا کر تشریف لے آئے، ان کا کہنا تھا کہ وہ ”مفادمتی جذبے“ کے تحت سب کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ ایک اور صاحب نے اطلاع دی کہ چاہے کوئی گھر اور دفتر کی تمام گھڑیاں ہی کیوں ناں آگے کر لے، کمپیوٹر کا کلاک ایسا ہے جو آگے کر دینے کے بعد بھی ”آنے والی تھان پر واپس“ آ جاتا ہے تا وقتیکہ اس کی bios میں جا کر اس کے کلاک کی سیٹنگ ناں کر لی جائے۔ ایک شخص محض اسی بات پر خوش تھا کہ اب ہمارے ملک میں بھی ولایت کی طرح آٹھ بجے سورج غروب ہوگا۔ پچھلے سال اس کا برطانیہ کا ویزا رتبیکٹ ہوا تھا۔

محفل برخاست ہوئی تو تھوڑی دیر بعد میرے ایک دوست کا فون آیا، وہ سخت غصے میں تھا، میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا ”یار تم ٹھیک ہی کہتے ہو، یہ لڑکیاں ہمیشہ جھوٹ ہی بولتی ہیں۔“ اس کی بات سن کر میں ٹھٹھک گیا اور بولا ”عزیز جان! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے ایسا کوئی غیر ذمہ دارانہ بیان نہیں دیا اور دوسری بات یہ ہے کہ لڑکیاں ہمیشہ تو نہیں لیکن اکثر جھوٹ بولتی ہیں لیکن اس قدر جھوٹ تو تم اور میں بھی ان کے ساتھ بولتے ہیں لیکن خیر تم اس بات کو چھوڑو اور اپنا مدعا بیان کرو۔“

”کیا خاک بیان کروں“ اس نے جھنجھلا کر کہا ”میں پچھلے آدھے گھنٹے سے ایک خاتون کا انتظار کر رہا ہوں، لیکن موصوفہ 11 بجے کا ٹائم دے کر ابھی تک نہیں آئیں۔“ اس کی بات سن کر میں زیر لب مسکرایا اور اسے سمجھانے والے انداز میں کہا ”میرے پیارے دوست! تمہیں کم از کم آدھ گھنٹہ مزید انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ابھی تک اس عقیفہ نے اپنی گھڑی ایک گھنٹہ آگے نہیں کی ہوگی۔“ جواباً میرے دوست نے اس عقیفہ کی گھڑی کی شان میں اچھی خاصی گستاخی کر کے فون بند کر دیا۔

## فرعون کے دربار میں

فرعون نے اپنے درباریوں پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی اور تخت پر براجمان ہو گیا۔ اس کے درباریوں میں اس کا مشیر خاص، شاہی مسخرہ، پبلک ریلیشننگ کا وزیر، (غیر) قانونی مشیر، شاہی نجومی، طبیب، چند لونڈیاں اور دربان وغیرہ شامل تھے۔ فرعون کو دیکھتے ہی سب نے یک آواز ہو کر اس کی درازی عمر اور درازی حکومت کے نعرے لگائے اور اور پھر احمقانہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ فرعون نے ان سب کی طرف بیزار سے دیکھا اور پھر یک بیک دربار کی سب سے خوبصورت لونڈی کو گھورنے لگا، وہ بیچاری گڑبڑا کر رہ گئی۔ یہ دیکھ کر فرعون کے چہرے پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر درباریوں کی بھی کچھ جان میں جان آئی۔

”عالم پناہ! آج ایک مدت بعد شاہی چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا ہے۔“ مشیر خاص ہمت کر کے بولا ”اس خوشی میں آپ کے خادموں نے ایک چھوٹی سی محفل کا اہتمام کیا ہے، اگر اجازت ہو تو پروگرام شروع کیا جائے؟“

”نہیں!“ فرعون نے اکتاہٹ سے کہا ”ہم ابھی تک اپنے آپ کو ذہنی طور پر پوری طرح فٹ محسوس نہیں کر رہے۔“

”عالی جاہ! ذہنی تناؤ کم کرنے کے لئے تو یہ پروگرام اور بھی ضروری ہے۔“ شاہی مسخرے نے کسی قدر فری ہوتے ہوئے کہا۔ فرعون اس کی باتوں کا برا نہیں مناتا تھا، لیکن اس وقت فرعون نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

لیکن ان کے کپڑے اتنے ہی سائز کے رہیں گے لہذا نئے نہیں خریدنے پڑیں گے۔ اسی طرح جن لوگوں کی شادیاں گرمیوں میں ہونا تھیں اب وہ اپنا ہی مون دسمبر میں منائیں گے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بغیر کام کئے چھ ماہ کی تنخواہ مل جائے گی جبکہ چھ ماہ کوئی خرچہ بھی نہیں کرنا پڑے گا لیکن ٹھہریئے..... ایک خرچہ ضرور کرنا پڑے گا اور وہ ہوگا خواتین کے نئے سیزن کے کپڑوں کا خرچہ.....!!!

کیلینڈر چھ ماہ آگے کرنے کا آئیڈیا جب میں نے ممتاز سکالر ”راجو بلیکی“ کو سنایا تو اس نے میری طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور کہا ”سرجی! آئیڈیا تو بڑا کمال ہے لیکن آپ ایک بات مس کر گئے ہیں۔“

میں نے جلدی سے پوچھا ”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ چھ مہینے کے بعد آپ کی جان اپنے اس ڈھیٹ دوست سے بھی چھوٹ جائے گی جس کا اگلے کچھ مہینوں میں باہر سیٹل ہونے کا ارادہ ہے!!!“ راجو نے مجھے داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”واقعی یار یہ بات تو میرے ذہن سے ہی نکل گئی تھی۔“

”جی سر! اور پھر آپ اسے ڈھیٹ نہیں کہیں گے بلکہ ”باہر والا“ کہا کریں گے۔“ راجو نے اپنی باتیں آنکھ دباتے ہوئے کہا اور مجھ سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

(8 جون 2008ء)

فکس کمیشن پر کر دیا کرے گا۔“

مشیر کی بات سن کر دربار میں سناٹا چھا گیا، فرعون کا چہرہ بھی لال بھسکا ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ کوئی چیز توڑ دیتا، شاہی طبیب فوراً آگے بڑھا اور فرعون کو ”ریلیکس“ رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہنے لگا ”عالم پناہ! زیادہ ٹینشن نہ لیں، آپ کا بلڈ پریشر بڑھ جائے گا اور پھر آپ رات کو اپنی دوا بھی نہیں لے پائیں گے۔“ شاہی طبیب کے طبی مشورے میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ فرعون حیرت انگیز طور پر یکدم نارل ہو گیا۔ درباری اب بھی چپ تھے، پھر اچانک شاہی مسخرے نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ”شہنشاہ معظم! ایک خبر میں بھی آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔“ فرعون نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہ رہا ہو کہ ”تم بھی بکو!“ شاہی مسخرہ اپنی بات جاری رکھتا ہوا بولا ”عالی جاہ! آپ کے 50 عدد بچوں میں سے 20 نے اپنی ولدیت کے خانے میں ”نا معلوم“ لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے چونکہ عرصہ دراز سے آپ کا دیدار نہیں کیا اس لئے انہیں یقین نہیں ہے کہ آپ ہی ان کے.....“ ابھی شاہی مسخرے نے اتنا ہی کہا تھا کہ جلاد نے میان میں سے تلوار نکال لی تاکہ اس گستاخ مسخرے کا سر قلم کر سکے لیکن فرعون نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ دربار میں ایک مرتبہ پھر ”پن ڈراپ سائیکلینس“ ہو گیا۔ قانونی مشیر نے یہ ”سائیکلینس“ چیک کرنے کے لئے تو وہ ”پن“ بھی زمین پر پھینک کر دیکھی جسے وہ کچھ دیر قبل اپنے کان میں کھجا رہا تھا، ”پن“ نے اچھا خاصا ”کھڑاک“ کیا!!! تھوڑی دیر تک دربار میں یہی کیفیت رہی پھر فرعون نے زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا ”مسخرے! آج تم نے کافی عرصے کے بعد کوئی ڈھنگ کی جگت لگائی ہے۔“

”حضور! بس آپ کی صحبت کا فیضان ہے۔“ شاہی مسخرے نے آداب بجا لاتے ہوئے کہا۔ دفعتاً فرعون کی نظر نجومی پر پڑی جو ایک کونے میں چپکا کھڑا تھا، اسے دیکھتے ہی فرعون کی آنکھوں میں چمک سی آگئی اور وہ بولا ”اوئے نجومی! ذرا حساب لگا کر بتاؤ کہ میری حکومت کب تک قائم رہے گی؟“ یہ سن کر نجومی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے مگر فرعون کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر اسے چارو ناچار حساب لگانا ہی پڑا ”عالی مرتبت! میرے منہ میں کچھ..... علم نجوم کے مطابق ظل الہی بہت جلد اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے ہمراہ ”ممی“ کی صورت میں اہرام مصر میں قیام فرمانے والے ہیں۔“ فرعون یہ سنتے ہی تخت سے لڑھک گیا اور اس سے

”حضور! اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟“ پبلک ریلیشننگ کا وزیر بڑی لجاجت سے بولا، یہ ایک پچاس پچپن سال کا مکروہ شکل کا شخص تھا جس کی آنکھوں سے ہی کمینگی ٹپکتی تھی۔

”بکو۔“ فرعون بولا ”لیکن یاد رکھنا اگر کوئی بے ہودہ بات کی تو گردن اڑوا دوں گا۔“

”جی حضور!“ وزیر بولا ”بات یہ ہے جناب والا کہ میں نے نوٹ کیا ہے کہ جب سے حضور نے شاہی منادی کے علاوہ دیگر پرائیویٹ پارٹیوں کو بھی منادی کرانے کی اجازت دی ہے، تب سے اب تک عالم پناہ ایک دن بھی چین کی نیند نہیں سوئے، میں تو کہتا ہوں ان سب احسان فراموشوں پر پابندی لگوا کر زندان میں ڈال دیجئے۔“

”ہوں!“ فرعون کچھ سوچتا ہوا بولا ”دل تو میرا اس سے بھی کچھ زیادہ کرنے کو چاہتا ہے مگر.....“

”مگر کیا عالی جاہ؟“ وہی لونڈی اٹھلا کر بولی جسے کچھ دیر قبل فرعون نے گھورا تھا ”جودل چاہتا ہے وہ کیجئے، آپ کے لئے کوئی کام کیا مشکل ہے!“

یہ دیکھ کر درباریوں نے ایک دوسرے سے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا اور مسکرانے لگے، فرعون کو بھی غالباً اس بات کا احساس ہو گیا اس لئے فوراً بولا ”حد ادب لڑکی! تم ان معاملات کو نہیں سمجھتی، یہ پرائیویٹ منادی والے بڑے خبیث لوگ ہیں، یہ غلط سلط منادیاں کروا کے میرا امیج خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں پکڑنا بھی اب کوئی آسان کام نہیں رہا کیونکہ انہوں نے اپنے اڈے مصر سے باہر بنا لئے ہیں۔“

”اور ویسے بھی حضور یہ آزاد منادی کا زمانہ ہے، اب شاہی منادی کون سنتا ہے!“ شاہی مسخرے نے لقمہ دیا۔

”آج تم بہت خاموش ہو“ فرعون اپنے قانونی مشیر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ”کیا تمہارے پاس کوئی خبر نہیں؟“

”عالی جاہ! خبر تو ہے مگر کوئی اچھی نہیں“ مشیر نے سر کھجاتے ہوئے کہا ”ہم نے جس فرم کو اہرام مصر کی renovation کا ٹھیکہ دیا تھا، وہ ہمیں 20 پریسینٹ کمیشن دینے کو تیار نہیں، اس کا کہنا ہے کہ، خاتم بدہن، حضور کے چل چلاؤ کا وقت ہے اس لئے اب وہ کمیشن کے معاملات آنے والے فرعون سے ہی طے کریں گے، سنا ہے کہ وہ فرعون ہر کام 10 پریسینٹ

## خودکشی

چوراہے کے قریب پہنچ کر اس نے اطمینان سے زیر اکر اسنگ سے ذرا پہلے گاڑی کو بریک لگائی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ اشارہ ابھی سرخ تھا اور پیدل چلنے والے سڑک پار کر رہے تھے، اتنے میں پچھلی گاڑی سے کسی نے ایسی بے ہودگی سے ہارن بجانا شروع کر دیا گویا قیامت کا اعلان کرنا چاہتا ہو!!! اس نے اپنے بیک مر میں دیکھا، وہ اس قدر خبیث صورت انسان تھا کہ اس پر ایک لمحے کو تو ابو جہل کا گمان ہوا۔ اس نے دروازے کا شیشہ نیچے کر کے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ ”کیا تکلیف ہے؟“ جواباً اس ”ابو جہل“ نے مزید زور و شور سے ہارن بجانا شروع کر دیا جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ ”تم ایک احمق انسان ہو جو اشارے کے احترام میں گاڑی روکے کھڑے ہو لہذا تم جہنم میں جاؤ اور مجھے راستہ دے دو۔“ اسی اثناء میں اشارہ کھل گیا اور اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی، پچھلی گاڑی والا بھی تیزی سے آگے نکل گیا مگر جاتے جاتے کچھ ایسے نازیبا اشارے کر گیا جن سے شاید یہ مراد تھی کہ آئندہ اشارے پہ گاڑی مت روکنا، اسے غصہ تو بہت آیا مگر وہ پی گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی گاڑی ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور کے قریب کھڑی کی، اسے وہاں سے اپنے لیے ایک لوٹن خریدنا تھا۔ لوٹن کے قیمت 190 روپے تھی مگر دکاندار نے اسے کاٹ کر اس کے اوپر 205 روپے کا سٹیکر لگایا ہوا تھا۔ اس نے کیشیئر سے بحث کرنی چاہی مگر اس نے نہایت روکھے سے لہجے میں جواب دیا ”جناب اس کی قیمت وہی ہے جس کا ہم نے سٹیکر لگایا ہوا ہے، آپ نے لینا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ زیادہ بحث نہ کریں، اوئے

پہلے کہ وہ کچھ کہتا، نجومی فوراً بول پڑا ”لیکن عالی جاہ، گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آپ تو مصر کے لئے ناگزیر ہیں اس لئے آپ کبھی نہیں مر سکتے.....“  
”اور اگر مر گئے تو؟؟؟“ فرعون نے آنکھیں نکالیں۔

”حضور! فرعون کبھی نہیں مرتے، اور یوں بھی ہمارا ایمان ہے کہ جب فرعون ”ممی“ کی صورت میں اہرام مصر میں قیام کرتے ہیں تو انہیں ایک دن دوبارہ زندہ ہونا پڑتا ہے۔“  
”تمہارا مطلب ہے کہ ہم دوبارہ جنم لیں گے؟“ فرعون نے چونک کر پوچھا۔  
”جی عالی مرتبت! نہ صرف آپ دوبارہ زندہ ہوں گے بلکہ کروڑوں لوگوں کے ملک پر حکومت بھی کریں گے۔“

”واقعی!!“ فرعون بے یقینی کے عالم میں بولا

”جی عالی جاہ! مگر ایک چھوٹا سا مسئلہ ہوگا کہ آپ کی اس حکومت کے خاتمے کے بعد آپ کو مصر جانے کے لئے کوئی محفوظ راستہ نہیں دیا جائے گا۔“  
”ہا ہا ہا.....“ فرعون نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا ”میں فرعون ہوں اور فرعون کو راستہ دینے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“  
فرعون کا قہقہہ مزید بلند ہو گیا اور پھر اس میں درباریوں کے قہقہے بھی شامل ہو گئے کیونکہ شاہی مسخرے نے اٹھ کر فرعون کے سامنے ناچنا شروع کر دیا تھا۔

(23 جون 2008ء)

میں آتا لیکن اپنی بے بسی کی وجہ سے وہ دل ہی دل میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ کچھ ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی مریض بنتا جا رہا ہے کیونکہ جب وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کو دیکھتا تو وہ سب اسے نارمل behave کرتے ہوئے نظر آتے جبکہ اس کی اپنی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ہر کسی کو کھانے کو دوڑتا، کئی دفعہ تو وہ پٹنے سے بال بال بچا۔ اس کے گھر والے اسے اپنے ساتھ پبلک مقامات پر لے جانے سے احتراز کرنے لگے اور اس کے دوستوں نے بھی اس سے ملنا کم کر دیا۔ اور پھر ایک دن اس نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا!!!

خودکشی کا فیصلہ کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک عدد پستول خریدا، ایک موقع پر تو وہ پستول خریدتے ہوئے بھی دکاندار سے الجھنے لگا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے ارادہ بدل دیا اور پستول کی قیمت ادا کرنے کے بعد چپ چاپ دکان سے باہر نکل آیا۔ پارکنگ سٹینڈ سے اپنی گاڑی نکالنے لگا تو یکدم ایک شخص نے گاڑی کا شیشہ کھٹکھٹایا اور اس سے پارکنگ فیس طلب کی۔ ”مگر یہ تو ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کا منظور شدہ پارکنگ سٹینڈ نہیں ہے اور ویسے بھی تم نے مجھے گاڑی لگاتے ہوئے کوئی ٹکٹ نہیں دی تھی۔“ اس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اوجی! یہ پرائیویٹ پارکنگ ہے، بیس روپے فی گھنٹہ، جلدی کریں آپ کی گاڑی کی جگہ بچھلی گاڑی لگوانی ہے۔“ پارکنگ والے نے اکھڑ سے لہجے میں کہا۔ دکان سے خریدا ہوا پستول ابھی اس کے ہاتھ میں ہی تھا جسے اس نے بے دھیانی میں ڈیش بورڈ پر رکھ دیا تھا، اچانک پارکنگ والے کی نظر پستول پر پڑ گئی اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ”موتیاں والیو! معاف کر دو، میں تو غریب آدمی ہوں، جو ٹھیکیدار کہتا ہے وہی کرتا ہوں، آپ جائیں سرکار..... آپ نے پہلے بتا دیا ہوتا.....!!!“ پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ اچانک پارکنگ والے کا رویہ کیوں بدل گیا، لیکن جب اسے پوری سیچو ایشن کا اندازہ ہوا تو وہ محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

خودکشی کرنے کے بارے میں اس نے سوچا تھا کہ گھر سے باہر کی جائے ورنہ اس کی موت کے بعد پولیس خواخواہ اس کے گھر والوں کو تنگ کرے گی۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی گاڑی سڑکوں پر دوڑانی شروع کر دی تاکہ خودکشی کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کی جاسکے، اس تلاش کے دوران اسے اپنے کالج کا زمانہ یاد آ گیا جب وہ ایک لڑکی کے ساتھ ایسے ہی کسی ”مناسب جگہ“ کی تلاش میں نکلا کرتا تھا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یکدم اس

چھوٹے، اسے واپس رکھ دے۔“ کیشیئر نے قدرے بدتمیزی سے لوٹن اس کے ہاتھ سے چھین کر ”چھوٹے“ کی طرف پھینک دیا۔ اک لمحے کو تو اس کا دل کیا کہ کیشیئر کو دل ہلا دینے والی گالی دے، تاہم کیشیئر کے تیور دیکھتے ہوئے اس نے محض اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ ”یہ سراسر زیادتی ہے، میں اس کے خلاف متعلقہ ادارے کو شکایت کروں گا۔“ کیشیئر نے یہ بات سن کر یوں ہاتھ بلایا جیسے ناک سے مکھی اڑا رہا ہو، اس نے دل ہی دل میں کیشیئر کو وہی گالی دی اور پھر سٹور سے باہر نکل آیا۔

شام کو اس نے اپنے چند دوستوں کو ایک مشہور ریستوران میں کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو اس نے بل طلب کیا، ویٹر نے اس کے جواب میں ایک چمکی سی پرچی اس کے ہاتھ میں تھادی جس پر غالباً کسی نے پاؤں سے کھانے کے بل کا ٹوٹل کیا ہوا تھا۔ اس نے ویٹر سے نیچر کو بلانے کے لئے کہا، نیچر آیا تو اس سے پوچھا کہ اس نے پکا بل بمع سیلز ٹیکس کیوں نہیں بنایا تو جواباً نیچر نے کہا کہ ”سر ہم نے تو اس لئے کچا بل بنایا ہے تاکہ آپ کو پندرہ پرسینٹ ٹیکس نہ دینا پڑے، ورنہ دو ہزار کے بل میں تقریباً تین سو روپے ٹیکس پڑ جاتا ہے۔“ اس نے نیچر کی بات سن کر اسے ”مینو“ دکھایا جس میں درج تھا کہ تمام قیمتیں Taxes سمیت ہیں، لیکن جو کچا بل ریستوران والوں نے بنایا تھا اس میں وہی قیمتیں درج تھیں جو بمع ٹیکس تھیں یعنی ہوٹل والے گاہکوں کی محبت میں نہیں بلکہ سرکار کا ٹیکس کھانے کے لیے کچا بل بنا کر دے رہے تھے۔ اس نے نیچر نے مزید بحث کرنی چاہی مگر اس کے دوستوں نے ٹوک دیا ”یار تم کس چکر میں پڑ گئے ہو، ان باتوں پر گر مبل کرتے رہے تو ایک دن پاگل ہو جاؤ گے۔“ طوعاً و کرہاً اس نے وہی کچا بل بھر دیا۔

اگلے کئی دنوں تک اس کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے رہے جو بظاہر تو معمولی نوعیت کے تھے مگر اس کے ذہن پر بری طرح اثر انداز ہوئے۔ ایک روز وہ اپنے بچے کے سکول والوں سے الجھ پڑا جنہوں نے تین ماہ بعد پھر فیس میں ڈیڑھ ہزار کا اضافہ کر دیا تھا، اسی طرح ایک دن اس کی ایک سرکاری دفتر میں اس بات پر تو تو میں میں ہو گئی کہ وہاں کسی کلرک نے اس سے بدتمیزی سے بات کی تھی۔ ایسے واقعات کی ”فریکوئنسی“ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی جس سے اس کے ذہنی تناؤ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ روز ہی اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا جو اس کے خیال میں بے اصولی، لوگوں کی روایتی بے ہودگی یا پھر بے ایمانی کے زمرے



## ویزا

ایمپسی کا ویزا سیکشن کچا کچھ بھرا ہوا تھا، ہال کے تمام اے۔سی چل رہے تھے لیکن پھر بھی گرمی محسوس ہو رہی تھی اور لوگ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائلوں کو پچھنے کی طرح جھل رہے تھے۔ ان فائلوں میں ان کی ویزا درخواست سے متعلق کاغذات تھے، اگر غلطی سے اس میں سے کوئی کاغذ گرنے لگتا تو وہ اسے یوں لپک کر پکڑتے جیسے زمین پر گرنے سے اس کاغذ کی ”بے حرمتی“ ہو جاتی۔ ہال میں ٹی۔وی بھی چل رہا تھا مگر شائد ہی کوئی اس کی طرف متوجہ تھا اور اگر کسی کی نظریں ٹی۔وی کی طرف لگی بھی ہوئیں تھیں تو صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کا دماغ کہیں اور ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کسی کا ٹوکن نمبر پکارا جاتا جسے سن کر ایک مختصر سی ہلچل مچتی، کوئی شخص ہڑبڑا کر اٹھتا، احتیاط سے اپنی فائل سمیٹتا اور متعلقہ کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہاں ویزا افسر اس سے چند سوالات پوچھتا، اس کے کاغذات کی جانچ پڑتال کی جاتی اور پھر چند منٹوں میں اس کے ”مقرر“ کا فیصلہ سنا دیا جاتا۔ کھڑکی سے واپسی کا منظر بڑا دلچسپ تھا، جن لوگوں کا ویزا مسترد کر دیا جاتا ان کے چہروں سے ایسا لگتا جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز فوت ہو گیا ہو اور اس کے برعکس جن لوگوں کا ویزا منظور کر لیا جاتا ان کے چہروں پر ایسے ایکسپریشن ہوتے جیسے انہیں کسی نے اسی دنیا میں جنت الاٹ کر دی ہو!!!

شاید بھی پچھلے ایک گھنٹے سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا، اس کا ٹوکن نمبر 254 تھا جبکہ سکرین پر اس وقت 143 نمبر چل رہا تھا، اس لئے اس کی باری میں ابھی مزید دیر تھی۔ تاہم دوسرے لوگوں کی نسبت وہ کافی پرسکون دکھائی دے رہا تھا اور اس کی دو وجوہات

کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا کیونکہ اشارے پر رکی ہوئی کچھلی گاڑی میں سے کسی ”ابوجہل“ نے پے در پے ہارن بجانا شروع کر دیا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ لال بھسکا ہو گیا اور اس نے کچھلی گاڑی والے کو ویسا ہی اشارہ کر دیا جیسا کچھ عرصہ پہلے خود اسے کسی نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے کیا تھا۔ یہ دیکھ کر کچھلی گاڑی والا تیزی سے اپنی گاڑی سے نکلا اور اس کی گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے باہر نکالنے لگا کہ اچانک اس کے نظر اس پستول پر پڑی جو ڈیش بورڈ سے نکل کر اب اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر کچھلی گاڑی والے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اس نے گھگھیا کر معافی مانگی اور اپنی گاڑی کی طرف یوں بھاگا جیسے اس نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

اس گاڑی والے کی حالت دیکھ کر اسے ایک عجیب سی سرشاری محسوس ہوئی، جبکہ اس سے پہلے عموماً ایسی صورتحال میں خود اس کی اپنی ذہنی کیفیت وہ ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے ذہن کو سکون سا مل رہا تھا، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا تمام ذہنی تناؤ یکدم کافور ہو گیا ہو۔ اس نے ہوا میں دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور پستول کو اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال کر گاڑی کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا، اس نے خود کشی کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا!!!

( یکم جولائی 2008ء )

کھڑکی سے واپس لوٹا تھا۔

”بھائی جی! آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ گورے کتنی کنجوسی سے ویزا لگاتے ہیں، بھلا ان کے باپ کا کیا جائے اگر یہ لوگوں کا ویزا لگا دیں؟“ نوجوان نے، جس کا نام قادر تھا، کسی قدر بھولپن سے کہا۔

”انہیں اپنے باپ کی نہیں بلکہ اپنے ملک کی پرواہ ہے، یہ اس شخص کا ویزا نہیں لگاتے جس کے بارے میں ان کا خیال ہو کہ اس کا رشتہ اپنی زمین سے مضبوط نہیں، اگر یہ قائل ہو جائیں کہ ویزا لینے والا شخص ان کے ملک سے واپس اپنے ملک میں آ جائے گا تو یہ فوراً اس کا ویزا لگا دیتے ہیں۔“ شاہد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”بات تو ان کی سہی ہے.....“ قادر بڑبڑایا ”ویسے بھائی میں بھی کوئی باہر سیٹ ہونے نہیں جا رہا، بس تھوڑے سے پیسے کمانے ہیں..... اتنے کہ میری تین بہنوں کی شادی ہو جائے اور جو قرضہ میرے باپ پر چڑھا ہوا ہے وہ اتر جائے، بس، پھر میں واپس آ جاؤں گا۔“ قادر نے گویا اپنی پوری زندگی کا خلاصہ بیان کر کے رکھ دیا۔

”اور اگر قادر باؤ خدا نخواستہ تمہارا ویزا نہ لگا تو پھر.....؟“ شاہد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ایسی بات ناں کریں جی، میرے دل کو کچھ ہو جائے گا، اگر ان گوروں نے مجھے ویزا نہ دیا تو میں یہیں زہر کھالوں گا۔“

قادر کے جذبات کا اظہار ابھی جاری تھا کہ ایک اور کھڑکی سے ہلکا سا شور بلند ہوا، اس مرتبہ یہ خوشی کا تہقہہ تھا، ایک میاں بیوی جن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہال سے باہر جا رہے تھے۔ بیوی اپنے خاوند سے کہہ رہی تھی ”میں ناں کہتی تھی کہ میرا ویزا بھی ساتھ میں اپلائی کرو، فوراً لگ جائے گا لیکن اب خدا کے لئے اپنی اس بیوہ بہن کو یہ مشورہ مت دینا کہ وہ بھی ویزا لے کر ہمارے پاس باہر آ جائے، سمجھ آئی تمہیں؟“

”اب اس خوشی کے موقع پر تو اس قسم کی باتیں مت کرو، جیسے تم کہو گی ویسے ہی ہوگا۔“ خاوند نے سعادت مندی سے کہا۔

”بڑی ڈاڈی“ عورت ہے۔“ قادر ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر شاہد کے کان میں بولا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے پھر اچانک جیسے قادر کو کچھ یاد آیا ”سرجی! آپ تو

تھیں، ایک تو یہ کہ اس کے پاسپورٹ پر چند ممالک کے ویزے پہلے ہی لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کا کیس دیگر لوگوں کی نسبت ذرا مضبوط تھا، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ویزا اس کے لئے زندگی موت کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ محض اپنے گھر والوں کے اصرار پر ایمپسی میں اپنا کیس جمع کروانے آیا تھا جن کا خیال تھا کہ یہ ملک اب رہنے کے قابل نہیں رہا اس لئے انہوں نے شاہد کو مجبور کیا کہ وہ باہر کا ویزا اپلائی کرے اور پھر جتنی جلدی ممکن ہو باہر سیٹل ہو کر اپنی فیملی کو بھی وہیں بلا لے۔ اس کے ذہن میں یہ خیالات بھٹک ہی رہے تھے کہ اچانک کسی نے اسے ٹھوکا دیا، یہ سانولی سی رنگت والا ایک ستائیس اٹھائیس برس کا نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے ہی بے چارگی ٹپکتی تھی۔

”بھائی جان! اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات پوچھوں؟“ اس نے لاجت سے پوچھا۔ شاہد نے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلایا کہ ”پوچھو۔“

”میں نے سنا ہے کہ اگر ویزا فارم پر لگی ہوئی تصویر میں کان نظر نہ آتے ہوں تو یہ گورے ویزا نہیں دیتے؟“ نوجوان نے معصومیت سے سوال کیا۔ شاہد کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن پھر نوجوان کے چہرے کی معصومیت کو دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا کہ ”نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں، بس تصویر واضح ہونے چاہئے اور اس کا بیک گراؤنڈ سفید ہونا چاہئے۔“ جواب سن کر نوجوان کے چہرے پر اطمینان کی ایک جھلک آئی لیکن پھر فوراً ہی اس نے ایک اور سوال داغ دیا ”لیکن سرجی، وہ ایجنٹ تو کہہ رہا تھا کہ..... پر نہیں ایجنٹ نے بھی یہی کہا تھا جو آپ کہہ رہے ہیں..... وہ تو پیچھے ایک ”کھڑکنا“ بیٹھا ہے اس نے مجھے یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ تصویر میں میرے کان نظر نہیں آ رہے۔“ شاہد نے یہ سن کر غور سے اس نوجوان کی طرف دیکھا تو ایک مرتبہ پھر اسے ہنسی آ گئی کیونکہ اس کے کان واقعی اتنے چھوٹے تھے کہ تصویر میں نظر نہیں آ سکتے تھے، شاید اسی لئے اس نے مشورہ دینے والے شخص کو ”کھڑکنا“ کہا تھا۔ اتنے میں ایک کھڑکی سے غافلہ سا بلند ہوا، ایک شخص قدرے اونچے لیکن مودب لہجے میں ویزا افسر سے بحث کر رہا تھا ”سر! پلیز میری بات سنیں، پلیز ڈونٹ رتجیکٹ مائی ویزا، میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں، آپ جو بھی کاغذ کہیں گے میں وہ لا دوں گا لیکن میرا ویزا رتجیکٹ نہ کریں، پلیز“

لیکن ویزا افسر اس منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ شخص سخت مایوسی کے عالم میں

## ایک بھوت کا سوال ہے بابا!!!

آپ نے شاید دنیا کی مختصر ترین کہانی سنی ہو اور اگر نہیں سنی تو میں سنا دیتا ہوں، دو اشخاص ایک ٹرین کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے کہ اچانک ایک نے دوسرے سے پوچھا ”کیا تم بھوتوں پر یقین کرتے ہو؟“ دوسرے نے جواب دیا ”نہیں۔“ پہلے نے کہا ”میں بھی نہیں کرتا۔“ اور یہ کہہ کر ایک دم سے غائب ہو گیا۔

مجھے بھی ایک عرصے سے کسی جن، چڑیل یا بھوت پریت کی تلاش ہے لیکن اپنی تمام تر کوشش کے باوجود آج تک مجھے ایسی کوئی مخلوق نہیں مل سکی جس پر مافوق الفطرت ہونے کا گمان ہو سکے۔ تاہم مجھے شدید حیرت ہوتی ہے جب یار لوگ نہایت اعتماد کے ساتھ جنوں اور بھوتوں کے قصے سناتے ہیں اور اگر کوئی مائی کا لعل انہیں چیلنج کرنے کی کوشش کرے تو آخر میں اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے یہ ٹکڑا لگا دیتے ہیں کہ ”یہ میرا آنکھوں دیکھا حال ہے۔“ اس قسم کے واقعات کی راوی عموماً عورتیں ہوتی ہیں اور ان واقعات کے زیادہ تر کردار بھی صنف نازک سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم ایسے قصے سننے میں چونکہ بے حد دلچسپ لگتے ہیں اس لئے انہیں سنانے والی اور فی سبیل اللہ آگے پھیلائے والی عورتیں ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی ہیں۔ مثلاً سال پرانی بات ہے، میرے ایک دوست نے کچھ اس قسم کا واقعہ سنایا کہ اس کی بیوی کے نکھیل کے ہمسایوں کی لڑکی جو دو ماہ پہلے کسی گاؤں میں بیابھی تھی، اچانک پراسرار قوتوں کی مالک بن گئی۔ راوی کے بیان کے مطابق (جو اس کیس میں اس لڑکی کی پینتالیس سالہ کنواری نندتھی) وہ لڑکی بیٹھے بیٹھے شیشے کے گلاس کو گھورتی تو گلاس

سیانے بیانے آدمی ہیں، مجھے ایسا مشورہ دیں کہ یہ گورے فوراً میرا ویزا لگا دیں، میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسی بات بتائیں کہ جس سے ان کو یقین آ جائے کہ میں واپس آ جاؤں گا۔“

”یار قادر ایسی تو میں کوئی بات نہیں بتا سکتا کیونکہ ان گوروں کا کچھ پتا نہیں چلتا، کبھی جی میں آئے تو اچھا بھلا ویزا ریکٹ کر دیتے ہیں اور اگر لگانے پر آئیں تو بغیر کسی خاص وجہ کے پانچ سال کا multiple ویزا بھی لگا دیتے ہیں، بہر حال تم ایسا کرنا کہ انہیں یہ بتانا کہ تمہاری بہنیں، ماں باپ، سب رشتے دار یہاں ہیں اس لئے تمہارا باہر رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ قادر نے بڑی توجہ سے یہ بات سنی اور پھر اس طرح سر ہلایا جیسے کوئی مرید اپنے مرشد کی ہدایت سن کر ہلاتا ہے۔ اتنے میں قادر کا ٹوکن نمبر پکارا گیا، وہ تیزی اٹھا اور اپنے کاغذ سمیٹتا ہوا متعلقہ کھڑکی پر چلا گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، وہ تیر کی طرح شاہد کے پاس آیا اور تقریباً اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتا ہوا بولا ”جناب عالی! آپ نے تو کمال کر دیا، جیسا آپ نے کہا بالکل ویسا ہی ہوا، انہوں نے اسی ٹائپ کے سوال پوچھے جیسے آپ نے کہے تھے اور میں نے بھی ویسے ہی جواب دیے۔“

”پھر کیا ہوا؟“ شاہد نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا؟ انہوں نے ٹھک کر کے ویزا لگا دیا اور کہا کہ پاسپورٹ ایک ہفتے کے بعد مل جائے گا، بس اب آپ دعا کریں کہ میں وہاں جا کر واپس نہ آؤں اور اتنے پیسے کماؤں کہ میری بہنوں کی شادی عزت کے ساتھ ہو جائے۔“ قادر کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”لیکن اپنی بہنوں کی شادی میں شرکت کرنے کے لئے تو تمہیں واپس آنا ہی پڑے گا؟“ شاہد نے کہا۔

”نہیں بھائی جی! اب میں واپس نہیں آؤں گا کیونکہ اگر میں پیسے کمائے بغیر واپس آ گیا تو پھر میری بہنوں سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا، ان کی شادی کے موقع پر بھائی سے زیادہ پیسے کی موجودگی ضروری ہے، اس لئے آپ دعا کریں کہ میں اب واپس نہ آؤں۔“ یہ کہتے ہوئے قادر نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی اور تیزی سے ہال سے باہر نکل گیا۔

(8 جولائی 2008ء)

پر ہی بلا لیا۔ موصوف سر کے بل چل کر آئے کیونکہ انہوں نے ڈی۔سی۔ او صاحب کے علاقے میں روزی کمائی تھی اس لئے ان کے ”موکل“ بھی ان کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد عامل صاحب نے اپنا عمل شروع کیا یعنی سر سے پیر تک ایک چادر اوڑھ کر لیٹ گئے اور یوں پوز کرنے لگے جیسے ان کی زبان میں اب کوئی ”اور“ بول رہا ہے۔ کچھ دیر مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرنے کے بعد انہوں نے میرے ماضی اور حال کے واقعات بتانے شروع کئے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ الحمد للہ شروع سے آخر تک وہ سب واقعات حرف بہ حرف غلط تھے!!!

جنوں، بھوتوں، چڑیلوں وغیرہ سے زیادہ تر دو باتیں منسوب کی جاتی ہیں، پہلی، چونکہ یہ غائب ہونا جانتے ہیں اس لئے انسانوں کو نظر نہیں آتے اور دوسری یہ کہ عموماً یہ مخلوق عورتوں پر عاشق ہوتی ہے۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو یہ دلیل تو ہر اس مخلوق کے بارے میں دی جاسکتی ہے جس پر آپ یقین کرنا چاہیں بھلے وہ مخلوق کوئی وجود رکھتی ہو یا نہیں۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ صبح سویرے تیار ہو کر گاڑی میں دفتر پہنچیں تو آپ کو پتا چلے کہ آپ کا ڈرائیور تو آدھے راستے میں ہی کہیں اتر گیا تھا اور باقی آدھے راستے کوئی بھوت آپ کی گاڑی ڈرائیو کر کے لایا؟ یا پھر ایسا ہوا ہے کہ آپ نے کسی روز اپنا بینک بیلنس چیک کیا تو پتا چلا کہ کوئی چڑیل اس میں دس لاکھ کا ڈپازٹ کروا گئی ہے؟ (کچھ چڑیلیں البتہ بینک بیلنس کم ضرور کروا دیتی ہیں)۔ یقیناً ایسے واقعات آپ نے کبھی نہیں سنے ہوں گے، آپ نے جب بھی سنی ہوگی کچھ ایسی بات سنی ہوگی کہ فلاں شخص کے پاس کچھ ایسی نادیدہ قوتیں ہیں جن کی بدولت وہ ہر ناممکن کام کو ممکن بنا دیتا ہے بشرطیکہ کام کروانے سے پہلے ان قوتوں کو سات سیر حلوہ کھلایا جائے۔ میرے خیال میں یہ نادیدہ قوتیں نہیں بلکہ ”نادیدہ قوتیں“ ہوتی ہوں گی!!!

جہاں تک بھوتوں کا عورتوں پر عاشق ہونے کا تعلق ہے تو یہ بات بھی آج تک میرے حلق سے نہیں اتر سکی کیونکہ بھوتوں کا معاشرہ چڑیلوں سے ہونا چاہئے نہ کہ عورتوں سے؟ اگر بھوتوں کا کوئی وجود ہے تو اصولی طور پر تو انہیں اپنے ہی قبیلے میں سے کوئی اچھی سی چڑیل تلاش کر کے اس سے شادی کر لینی چاہئے اور خواہ مخواہ ادھر ادھر منہ مارنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں چڑیلوں کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی کیونکہ کبھی کسی نے یہ نہیں سنا کہ کوئی چڑیل کسی مرد پر عاشق ہوئی ہو، پس ثابت ہوا کہ ”نر“ کسی بھی شکل میں ہو، ہر جائی ہی

لوٹ جاتا، چھت سے چھلانگ لگا کر زمین پر آ جاتی، مردانہ آواز میں باتیں کرتی، ایک وقت میں دس دس روٹیاں کھا جاتی لیکن تھی دھان پان سی (تاہم نند کا وزن دو ماہ میں تقریباً 80 کلو ہو گیا)، راوی کا خیال تھا اور دیگر جملہ خواتین امت کا اس پر ”اجماع“ کہ لڑکی پر کسی بھوت کا سایہ ہے لہذا اسے فوری طور پر کسی عامل یا پیر کو دکھانا چاہئے۔ ”پیرزادہ“ ہونے کے ناتے میں نے اس ضمن میں اپنی خدمات پیش کیں جو فوراً قبول کر لی گئیں، میں نے ایک تعویذ ”دم“ کر کے لڑکی کو بھجوا دیا اور ہدایت کی کہ نیم گرم پانی میں گھول کر پی لے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہلوا دیا کہ لڑکی کی نند کو چند ماہ کے لئے کسی صحت افزاء مقام پر بھیج دیا جائے۔ دونوں باتیں مان لی گئیں جس کے بعد نہ صرف لڑکی بھلی چنگی ہو گئی بلکہ ایک سال بعد اس نے ایک گول مٹول سے بچے کو بھی جنم دیا۔ اس گاؤں میں اب میری بے شمار کلائنٹ ہیں!!!

ویسے اس میدان میں مرد بھی عورتوں سے کچھ پیچھے نہیں ہیں، آپ کسی بھی شخص کو ٹول کر دیکھ لیں وہ آپ کو ایک پہنچا ہوا توہم پرست معلوم ہوگا۔ مردوں کے قصے عورتوں سے کچھ مختلف ہوتے ہیں لیکن تان ایک ہی جگہ آ کر ٹوٹتی ہے۔ اکثر قصوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کا کاروبار بہت ڈاؤن تھا، مالی پریشانیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، دوست رشتہ دار سب ساتھ چھوڑ چکے تھے ایسے میں کسی نے انہیں ایک ”باباجی“ کے بارے میں بتایا جن کے قبضے میں نادیدہ قوتیں تھیں۔ آخری چانس سمجھ جب کر باباجی سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے ایسا عمل کیا کہ کچھ ہی دنوں میں کا یا پلٹ گئی۔ تاہم اگر آپ ایسے لوگوں سے ان باباجی کا پتہ پوچھیں تو آپ کو کچھ اس قسم کا جواب دیا جائے گا کہ ”باباجی تو پچھلے سال فوت ہو چکے ہیں، اب ان کا ایک لڑکا ہے جو ہال روڈ پر UPS کا کام کرتا ہے!!!“

ایک دفعہ ایک ایسا ہی ”چشم دید“ واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ مظفر گڑھ کے قریب کوئی عامل ہے جس کے قبضے میں ”موکل“ ہیں جن کی مدد سے وہ نہ صرف آپ کے دل کا حال بلکہ ماضی اور مستقبل بھی بتا دیتا ہے۔ بتانے والے نے یہ بھی بتایا کہ وہ بقلم خود اس عامل سے نہ صرف مل چکا ہے بلکہ شرمندہ بھی ہو چکا ہے کیونکہ اس نے بھری محفل میں موصوف کے کچھ راز کھول دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے دعوے کے بعد اس عامل کی زیارت ضروری تھی اس لئے میں فوری طور پر مظفر گڑھ روانہ ہو گیا جہاں میں ڈی۔سی۔ او کا مہمان تھا۔ ڈی۔سی۔ او صاحب کو جب اس سفر کی غایت معلوم ہوئی تو انہوں نے عامل کو گھر

## ”میڈرڈی میسرو“

فرینکفرٹ ائر پورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر پر جب میں نے اپنا پاسپورٹ امیگریشن آفیسر کے حوالے کیا تو اس نے پاسپورٹ پر اچھتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے سوال کیا: ”جرمنی میں آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟“

”ایک مقصد تو آپ کی زیارت کرنا تھا۔“ میں نے ذرا ”جولی“ بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے“ وہ سر ہلا کر بولا ”ہوگئی زیارت، اب واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟“

”واپس اس لئے نہیں جاسکتا کیونکہ مجھے دودن بعد پرتگال میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اپنا ایک مقالہ پڑھنا ہے۔“ میں نے جلدی سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا کہ کہیں وہ واقعی اپنی زیارت کو ہی میری آمد کا مقصد نہ سمجھ بیٹھے۔

”اوہ! تو کیا تم براگا، پرتگال میں ہونے والی کانفرنس میں شرکت کرنے کیلئے آئے ہو؟“ اس نے کچھ کچھ متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جی سرکار“ میں نے جواب دیا ”ورنہ آپ کو کیا لگا تھا کہ میں واقعی جناب کی زیارت کرنے آیا ہوں؟“ یہ دوسرا جملہ میں نے اپنے دل میں کہا۔

”Ok man have a good time“ کہہ کر اس نے میرے پاسپورٹ پر انٹری کی مہر ثبت کی اور پاسپورٹ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے پاسپورٹ بیگ میں ڈالا اور میٹنگ پوائنٹ کی طرف بڑھ گیا جہاں تین چار لوگ ہاتھ میں کارڈ لئے کھڑے تھے۔ ایک کارڈ پر

ہوتا ہے۔

ایک اور بات جو مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ جو لوگ اپنے قبضے میں جنات، بھوت پریت، موکل یا مافوق الفطرت ہستیوں کو رکھتے ہیں وہ محض ’72 گھنٹوں میں محبوب آپ کے قدموں میں“ کا دعویٰ کرنے کی بجائے کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتے؟ یعنی کیا بھوت پریت صرف ”دلالی“ کے قابل ہی رہ گئے ہیں؟ کوئی عامل یہ دعویٰ کیوں نہیں کرتا کہ وہ 72 گھنٹوں میں عراق سے امریکی فوجیں واپس بھجوادے گا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے قبضے میں کچھ ایسے ”جن“ ہیں جن کا توڑ پوری دنیا میں کسی کے پاس نہیں اور یہ ٹیکنالوجی، معیشت اور سائنس کے ”جن“ ہیں اور ان میں سے کچھ کے تو مجھے نام بھی معلوم ہیں جیسے بل گیٹس، وارن بلف، آئن سٹائن وغیرہ وغیرہ۔

ڈزنی لینڈ میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں آپ کو ایک ٹرین میں جنگل کی سیر کروائی جاتی ہے اور اس سیر کے دوران مختلف قسموں کے خوفناک اور خونخوار جانوروں (جو کہ مصنوعی ہوتے ہیں) سے ٹاکرا ہوتا ہے اور سیر کرنے والوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں تاہم پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب سیر کروانے والے منتظمین کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ ”خواتین و حضرات! اب دل تھام کر بیٹھیں کیونکہ اب ہم جس جگہ جا رہے ہیں وہاں ایک ایسی مخلوق بستی ہے جس سے زیادہ خطرناک ہستی پوری دنیا میں اور کوئی نہیں..... کیونکہ..... اب ہم انسانوں کی بستی میں داخل ہونے لگے ہیں!!!“

مجھے بھی اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے کہ انسانوں سے زیادہ خطرناک مخلوق اس روئے زمین پر کوئی نہیں، جنات بے چارے تو یونہی بدنام ہیں۔ ویسے اب رات کے دو بج چکے ہیں، لائٹ جا چکی ہے اور باہر کھڑکی سے کچھ عجیب عجیب آوازیں آرہی ہیں۔ بقول شخصے ”میں جنوں بھوتوں پر یقین نہیں کرتا لیکن اگر وہ ڈرانے پر تل جائیں تو میں ڈر جاؤں گا۔“ اس لئے اب میں یہ کالم یہیں ختم کرتا ہوں، اگر میری بات سے کسی جن، بھوت یا چڑیل کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں، تاہم بھوت پریت اور چڑیلیں اگر مناسب سمجھیں تو اپنا فیڈ بیک مجھے ای میل کر سکتے ہیں۔ تمام خط و کتابت صیغہ راز میں رکھی جائے گی!!!

(15 جولائی 2008ء)



اس شہر کی خوبصورتی دیکھ کر میں نے سوچا کہ کاش یہاں زیادہ دن رک سکتا لیکن پھر یہ سوچ کر کچھ تسلی ہوئی کہ اگلی منزل اس سے بھی زیادہ رومانوی ہے یعنی میڈرڈ، سپین!!!۔

میڈرڈ میں داخل ہوتے ہی آپ کو ایک بات کا فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ یورپ کے دیگر ملکوں کے برعکس یہاں کے لوگ کالے بال اور کالی آنکھوں کے مالک ہیں جس نے ان کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور سونے پر سہاگہ تو سپینی عورتیں اور ان کا لباس ہے جس میں وہ قیامت ڈھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہاں جس عورت کو آپ نسبتاً کم کھلے گلے کا لباس پہنے ہوئے دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ وہ پردہ دار بی بی ہے! میڈرڈ کی ایک اور خاص بات اس کی ”میٹرو“، یعنی انڈر گراؤنڈ ٹرین سروس ہے جو پورے شہر میں چلتی ہے۔ اسے ”میٹرو دی میڈرڈ“ کہتے ہیں جس کا پنجابی میں ترجمہ ”میڈرڈ دی میٹرو“ بنتا ہے۔ ویسے تو میٹرو، یورپ کے تمام بڑے شہروں میں ہے لیکن میڈرڈ کی یہ ٹرین اور اس کے سٹیشن نسبتاً دوسروں سے زیادہ جدید اور صاف ستھرے ہیں۔ میڈرڈ کی یہ وہی میٹرو ہے جہاں 2004ء کے دھماکوں کے نتیجے میں تقریباً 190 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ دھماکوں کے مرکزی ملزم کو جو کہ مسلمان ہے حال ہی میں عدالت نے بری کیا ہے۔

”پورٹو دی سول“ میڈرڈ کا سٹی سنٹر ہے۔ جس شام میں وہاں پہنچا وہ ویک اینڈ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے پورا میڈرڈ وہاں اٹھ آیا ہو۔ ”پردہ دار بیبیاں“ خال خال ہی نظر آئیں، لوگ ٹولیوں کی صورت میں گھوم رہے تھے، کھانسی رہے تھے اور موج مستی کر رہے تھے۔ میں نے ایک پولیس والے سے کسی ایچھے سے ریسٹورنٹ کا پتہ پوچھا تو اس نے اشارے سے بتایا کہ سامنے والی گلی میں تین چار کیفے ہیں، وہاں چلے جاؤ۔ میں نے پوچھا کہ ”کیا وہاں چکن ملے گا؟“ اس نے کندھے اچکا کر کہا ”پتہ نہیں۔“ میں نے پوچھا ”کیا چاول ملیں گے؟“ اس نے پھر کہا ”پتہ نہیں۔“ میں نے کچھ اور پوچھنا چاہا تو وہ جھلا کر بولا ”تم وہاں جا کر ان سے خود ہی کیوں نہیں پوچھ لیتے؟“ بات معقول تھی اس لئے میں نے بحث نہیں کی۔ کیفے میں صرف کافی ملی جسے میں نے چینی کے تقریباً آٹھ چمچ ڈال کر پینے کے قابل بنایا۔ بلاشبہ وہ دنیا کی کڑوی ترین کافی تھی۔

میڈرڈ میں ایک رات گزارنے کے بعد میں پورٹو پہنچا جو پرتگال کا دوسرا بڑا شہر ہے اور جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ بندرگاہ بھی ہے۔ پورٹو کے اتر پورٹ پر اترتے ہی مجھے

”ہائیڈل برگ“ بھی لکھا ہوا تھا۔ چونکہ مجھے اپنے بھائی علی سے ملنے ہائیڈل برگ جانا تھا اور اس نے میرے لئے ٹیکسی سروس ہائر کی ہوئی تھی اس لئے میں سمجھ گیا کہ یہ ٹیکسی والا میرے ہی انتظار میں کھڑا ہوگا۔ جونہی میں اس کے پاس پہنچا، اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی مجھے اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا اور پھر اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی پولیس والا کسی ملزم کی شناخت کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر تصویر دیکھنے کے بعد اس نے مایوسی سے سر ہلا دیا اور جرمن میں کچھ بول کر تصویر واپس جیب میں ڈال لی اور لا پرواہی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہ ٹیکسی والا نہیں جسے ہائر کیا گیا تھا بلکہ وہ ٹیکسی والا سرے سے آیا ہی نہیں تھا چنانچہ میں اتر پورٹ سے باہر نکل آیا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کدھر کو جاؤں کہ میری نظر ایک ادھیڑ عمر درویش نما جرمن شخص پر پڑی جو سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں نے اس سے ہائیڈل برگ جانے کا طریقہ پوچھا تو اس نے کہا کہ سامنے والی بس میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو وہ مسکرا کر بولا ”بیٹھ جاؤ برخودار، اس بس کا ڈرائیور میرے ساتھ کھڑا ہے اور تم یقین کرو کہ بس میں بیٹھے پر یہ تمہیں گولی نہیں مار دے گا!!“ میں فوراً بس میں بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد وہ درویش بھی میرے ساتھ آ کر براجمان ہو گیا۔ بس نے ہمیں اتر پورٹ کے ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل تک پہنچایا جہاں اتر کر وہ شخص کئی منٹ کی واک کر کے میرے ساتھ ٹرین کے ٹکٹ کاؤنٹر تک آیا جہاں سے میں نے ہائیڈل برگ کیلئے ٹکٹ خریدی، پھر وہ بزرگوار مجھے اس پلیٹ فارم تک چھوڑنے آئے جہاں سے اس ٹرین نے چلنا تھا۔ واضح رہے کہ پلیٹ فارم، ٹکٹ کاؤنٹر سے کافی فاصلے پر تھا۔ اس سارے کام میں اس شخص کا تقریباً آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا اور جاتے ہوئے جب میں نے ممنون ہو کر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا ”کوئی بات نہیں، اگر کبھی میں پاکستان آیا تو ایسے ہی کوئی شخص وہاں میری مدد کرے گا“ یہ کہہ کر اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور جرمن لہجے میں ”سلام علیکم“ کہہ کر غائب ہو گیا۔

ہائیڈل برگ پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ شہر کیا ہے، جنت کا ٹکڑا ہے۔ شہر کے پتھوں بیچ ”دریائے نیکر“ ہے۔ جس کے ایک کنارے پر ہائیڈل برگ یونیورسٹی واقع ہے۔ جب شام کو میں ہائیڈل برگ پہنچا تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور یونیورسٹی کے سٹوڈنٹ جوق در جوق اس شام کو منانے کے لئے سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔

ترقی۔ اسی شہر کی یونیورسٹی جو ”یونیورسٹی آف من ہو“ کہلاتی ہے، میں وہ چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جہاں مجھے مقالہ پڑھنا تھا۔ اس کانفرنس میں 32 ممالک کے 94 مندوبین نے شرکت کی۔ کانفرنس کا سب سے دلچسپ کردار جارجن کا ”ابوجابر“ تھا جو اپنی حرکتوں کی وجہ سے ابوجابر کم اور ابوجہل زیادہ لگتا تھا ہر سیشن کے اختتام پر وہ کوئی نہ کوئی جہالت آمیز سوال ضرور کرتا اور پھر اس طرح خوش ہوتا جیسے بچے اپنے سے بڑے کسی شخص کو کسی کھیل میں ہرا کر خوش ہوتے ہیں۔

کانفرنس میں شرکت کے بعد میں واپس پورٹو آگیا جہاں مجھے ایک رات گزارنی تھی۔ یہ شہر اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ شہر میں اونچی نیچی گھاٹیاں ہیں جن کے کناروں پر جابجا کیفے، ریستوران اور دکانیں ہیں۔ ”ساؤتھ“ شہر کا مرکزی سٹیشن ہے جہاں سے پورے پرتگال کے لئے ٹرین مل جاتی ہے اور ٹرین کی ٹائمنگ ایسی کہ آپ اپنی گھڑی درست کر لیں۔ میں نے خود کئی دفعہ ٹرین کی آمد کے وقت کے ساتھ اپنی گھڑی ملائی۔ پورٹو کو پلوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس شہر کے پلوں بیچ بھی ایک دریا گزرتا ہے جس کے اوپر کئی خوبصورت پل بنائے گئے ہیں۔ رات کو پلوں پر روشنیاں جگمگاتی ہیں جس سے ایک عجیب رومانوی سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو دریا کے کنارے بیٹھ کر کھانے کا شوق ہو تو گھاٹی سے نیچے دریا کی طرف ایک کیبل کار آپ کو کنارے تک پہنچا دے گی جس کے بعد آپ کسی بھی ریستوران سے ”فران گو“ کھا سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ یہ شہر بالکل ویسا ہے جیسا عموماً جیمز بونڈ کی کسی فلم کے پہلے سین میں دکھایا جاتا ہے۔ ایک سردار جی سڑک کے پلوں بیچ بھنگڑا ڈال رہے تھے، کسی نے پوچھا ”سردار جی! کیا بات ہے؟ کہیں شراب تو نہیں پی ہوئی؟“ سردار جی بولے ”نہیں! ابھی تو لینے گئے ہیں!!!“ میری کیفیت بھی تقریباً اسی سردار جیسی ہے تاہم خوشی کی وجہ مختلف ہے اور وہ یہ کہ ابھی مجھے آگے پیرس جانا ہے!!

(22 جولائی 2008ء)

احساس ہوا ہے کہ اس شہر کو میں نے کچھ under estimate کیا تھا۔ پرتگال، یورپ کے دیگر ممالک کے مقابلے میں نسبتاً غریب ملک ہے لیکن پورٹو کا اتر پورٹ کہیں سے بھی غریب نہیں لگتا بلکہ اسے 2007ء میں یورپ کے بہترین اتر پورٹ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا ہے۔ یہ اتر پورٹ ضرورت سے زیادہ صاف ہے اور رش ہونے باوجود نہ جانے کیوں یہاں شور محسوس نہیں ہوتا۔ اتر پورٹ کے اندر ہی سے آپ کو ”پورٹو ڈو میٹرو“ یعنی پورٹو کی لائن ٹرین مل جاتی ہے جو آپ کو شہر میں ہر جگہ پہنچاتی ہے۔ اس میٹرو کی دو خاص باتیں ہیں، پہلی یہ کہ اس کا ٹکٹ خریدنے کے بعد آپ کو اسے صرف ایک مشین کے آگے کر کے validate کروانا ہوتا ہے لیکن اگر آپ ایسا نہیں بھی کرتے تو بھی بغیر رکاوٹ کے میٹرو میں بیٹھ سکتے ہیں اور دوسری خاص بات یہ کہ یہ میٹرو صرف انڈر گراؤنڈ ہی نہیں بلکہ شہر کے پلوں بیچ سڑک پر بھی چلتی ہے جو بذات خود ایک نہایت دلکش نظارہ ہے۔ میٹرو کے سٹیشن پر اتر کر میں سیدھا انفارمیشن کے کاؤنٹر پر گیا اور پوچھا کہ اگلی ٹرین کب آئے گی؟ جواب ملا ”سوا بارہ بجے“۔ میں نے پوچھا ”اس سے اگلی کب آئے گی؟“ جواب میں کاؤنٹر کلرک نے مجھے ٹائم ٹیبل کی کاپی تھما دی۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر میں سڑک پار کر کے ایک ریستوران میں گھس گیا۔ انگریزی میں کچھ کھانے کے لئے طلب کیا تو ریستوران میں سرو کرنے والا لڑکا ہونفوق کی طرح میرا منہ دیکھ کر پرتگالی میں کچھ بولا اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں نے دوبارہ انگریزی میں اسے چکن لانے کے لئے کہا تو اس نے پرتگالی میں ہی کچھ جواب دیا اور نہایت مسرت سے میری طرف دیکھ کر دوبارہ ہنسا۔ اب جونہی میں انگریزی بولتا وہ خوش ہو کر پرتگالی میں کچھ کہتا اور ہنسنے لگتا۔ تنگ آ کر میں نے پرتگالی میں بڑبڑا کر کہا ”فیراگوں پرتگالی ہی بولی جانا ایں!“ یہ سنتے ہی وہ چونک پڑا اور جھٹ سے چکن کی پلیٹ لا کر میرے آگے رکھ دی، میں سخت حیران ہوا اور اشارے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا ”فیراگوں!“ یعنی ”فیراگوں“ کا ترجمہ موصوف نے ”فران گو“ کیا جسے پرتگالی میں چکن کہتے ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کر کے ”فران گو“ کھایا اور بل ادا کر کے ریستوران سے باہر نکل آیا۔

براگا، پورٹو سے تقریباً 35 منٹ کی ڈرائیو پر واقع پہاڑیوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ پہلی نظر میں یہ آپ کو ایبٹ آباد یا مری کی طرح لگتا ہے لیکن جب آپ دوسری نظر ڈالتے ہیں تو آپ کا خیال بدل جاتا ہے جس کی دو وجوہات ہیں، پہلی صفائی اور دوسری

تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس ہیلی کاپٹر سے سیٹمر پر موجود لوگوں کے لئے ایک رسی کی سیڑھی پھینکی گئی جس کے ذریعے دو دو آدمیوں کو باری باری بحفاظت اٹلی کی زمین پر اتار لیا گیا۔  
 ”کمال ہے!!!“ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے کوئی فلمی سین سنایا ہو۔“

نوجوان میری بات سن کر مسکرایا اور بولا ”جناب! یہ تو سین کا ڈراؤنا پارٹ تھا، اس کا دلچسپ حصہ تو ابھی باقی ہے۔“

”واقعی؟“ میری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”جی..... کیونکہ اس کے بعد اطالوی پولیس ان سب کو پناہ گزینوں کے کمپ ٹائپ کسی جگہ لے گئی جہاں انہیں تقریباً پندرہ دن رکھا اور پھر ایک ایک جینز کی پیٹ اور پچاس پچاس یورو دے کر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ جدھر سینگ سائیں، نکل جاؤ۔“

اس واقعے کی تمام تر سنجیدگی کے باوجود، جب میں نے اس کا اختتام سنا تو اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر نوجوان نے بھی ہنسا شروع کر دیا لیکن پھر یک بیک رنجیدہ ہوتا ہوا بولا ”کہنے کو تو ہم سب لوگ اب پیرس میں ہیں لیکن ہم میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو یہاں حقیقی معنوں میں خوش ہو، نہ ہمیں یہاں ایفل ٹاور دکھائی دیتا ہے اور نہ شانز الیزے، ہمیں تو صرف یہ پتہ ہے کہ آج کل کونسا ایسا فون کارڈ ہے جس سے پاکستان میں 120 منٹ تک بات ہو سکتی ہے!!!“

مجھے چونکہ ایفل ٹاور بھی نظر آ رہا تھا اور شانز الیزے بھی، اس لئے میں اب مزید ایسی کہانیاں سننے کے موڈ میں نہیں تھا چنانچہ میں نے نوجوان سے اجازت لی اور پیرس کا پھیرا لگانے کے لئے نکل کھڑا ہوا جہاں یہ میرا پہلا دن تھا۔ شروعات ظاہر ہے کہ ایفل ٹاور سے کی۔ ایفل ٹاور کو بلاشبہ تعمیر کا ایک شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے بنانے والے، گوستو ایفل، نے اس کے علاوہ بھی کئی اعلیٰ تعمیرات کیں جن میں سب سے زیادہ مشہور Statue of Liberty ہے۔ ایفل ٹاور کی renovation کی خاطر ہر سات سال بعد اس پر پچاس سے ساٹھ ٹن پیٹ کیا جاتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پیٹ تین مختلف شیڈز میں کیا جاتا ہے تاکہ دیکھنے والوں کو پورے ٹاور کا ایک ہی رنگ نظر آئے۔ ایفل ٹاور کے گرد سیاحوں کا ایک ہجوم تھا جو لائن میں لگ کر اس کا ٹکٹ لے کر اوپر جانا چاہتے

## پیرس کا پھیرا

نوجوان نے سگرت سلگایا اور فضا میں اس کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا ہوا میرے ساتھ واک کرنے لگا۔ پیرس میں میری اس سے ملاقات صرف تین گھنٹے قبل ہوئی تھی اور ان تین گھنٹوں میں اس نے مجھے کھڑے کھڑے صرف ان پاکستانیوں کے قصے سنائے تھے جو اپنا مستقبل بنانے کے لئے یورپ آنا چاہتے تھے۔ اس نے سگرت کا کش لگایا اور مجھے ایسا ہی ایک اور واقعہ سنانے لگا ”یہ غالباً دو سال پہلے کی بات ہے، 22 پاکستانیوں کا ایک گروپ کسی ایجنٹ کے ذریعے سمندر کے راستے ایک سیٹمر میں ترکی سے اٹلی کے لئے روانہ ہوا۔ جب انہیں سفر کرتے ہوئے بارہ گھنٹے گزر گئے اور زمین کا کنارہ نظر نہیں آیا تو ان کی حالت غیر ہونا شروع ہو گئی، اسی دوران رات ہو گئی اور کھلے سمندر میں ان کا سیٹمر اچانک خراب ہو گیا۔ پھر کیا تھا..... ان میں سے کچھ نے تو موت کو سامنے دیکھ کر باقاعدہ رونا شروع کر دیا جب کہ باقی لوگوں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کی لیکن ان کی ہمت اس وقت جواب دے گئی جب سیٹمر میں پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ ان 22 لوگوں کے علاوہ سیٹمر پر صرف اس کا ڈرائیور تھا اور اسے بھی کچھ پتہ نہیں تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ تھوڑی دیر تک تو وہ سب مل کر ہتھیلیوں سے پانی اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتے رہے لیکن پھر انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس ترکیب سے وہ شاید موت کو کچھ دیر کے لئے تو ٹال لیں لیکن بالآخر انہیں مرنا ہی ہے۔ قریب تھا کہ وہ سب کے سب خوف سے ہی مر جاتے کہ اچانک انہیں فضا میں ہیلی کاپٹر کی چنگھاڑ سنائی دی۔ یہ اطالوی سرحدی پولیس کا ایک ہیلی کاپٹر تھا جو سمندری حدود کی نگرانی کے لئے پرواز کر رہا

کوئی کالا بھکاری نظر نہیں آیا البتہ گورے اور مکس نسل کے بھکاری بے شمار نظر آئے۔ کچھ کا تو مانگنے کا انداز بھی کافی مزے کا تھا۔ مثلاً میٹرو میں سفر کرتے کرتے اچانک کوئی صاحب اٹھتے اور اپنا ہارمونیم نما باجا نکال کر بجانا شروع کر دیتے، اس اثنا میں ان کی ساتھی خاتون، جو اکثر اوقات اچھی خاصی شخصیت کی مالک ہوتی، اپنا رومال پھیلا کر فرداً فرداً بے میں موجود ہر شخص سے فرانسیسی میں کچھ کہہ کر خیرات مانگتی، جس کا غالباً اردو میں ترجمہ کچھ یوں ہوگا کہ ”جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔“

یوں تو پیرس میں جا بجا تاریخی مقامات ہیں لیکن جس جگہ نے مجھے سب سے زیادہ دلچسپی لینے پر مجبور کیا وہ بستی (Bastille) تھا جہاں انقلاب کے وقت فرانس کے بادشاہ لوئی XVI کو پھانسی دی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب بادشاہ کو پھانسی دی گئی تو کئی لوگوں نے اس کے خون سے اپنے رومال سرخ کئے۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس کی ملکہ میری ایٹا نیٹ نے وہ جملہ کہا جو تاریخ کا حصہ بن گیا کہ ”اگر لوگوں کو روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھا لیتے؟“ انقلاب کے وقت اس ملکہ کو بستی کے قریب ہی اسی بادشاہ کے محلات کے تہہ خانے میں قید کر دیا گیا تھا اور بعد میں گلڈیٹن کے ذریعے اس کا سر بھی تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ تاہم فرانسیسیوں نے اب اس جگہ سے انقلاب کی تقریباً تمام نشانیاں ختم کر دی ہیں اور بستی میں کوئی ایسی یادگار بھی نہیں جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہاں بادشاہ کو پھانسی دی گئی تھی۔

تین دن پیرس میں گزارنے کے بعد بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے ابھی فقط پیرس کا ٹریلر ہی دیکھا ہے اور پوری فلم دیکھنے کے لئے خاصا وقت چاہئے۔ لیکن اب میرے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ مجھے واپس لاہور جانا تھا، وہی لاہور جسے پیرس بنانے کا دعویٰ ہم کئی سالوں سے کرتے آ رہے ہیں۔ لاہور، پیرس تو نہیں بن سکا لیکن کیا کریں..... اپنا گھر اگر گارے مٹی کا بھی ہو تو کسی ایسے محل کے لئے نہیں چھوڑا جاسکتا جس میں سے باہر آنے کا کوئی دروازہ نہ ہو!!!

تھے۔ میں نے بھی تقریباً ایک گھنٹہ لائن میں لگ کر ٹکٹ لیا اور ٹاور کے اوپر پہنچا جہاں سے پورے پیرس کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ ایفل ٹاور کے اندر مختلف کیفے بھی ہیں جہاں سے آپ کافی وغیرہ لے سکتے ہیں لیکن اس کے خوبصورتی یہ ہے کہ باہر سے دیکھنے والوں کو قطعی اندازہ نہیں ہو پاتا کہ ٹاور کے اندر کیفے کی تعمیر کے بعد کسی قسم کی کوئی تبدیلی بھی آئی ہے۔

ایفل ٹاور سے نکل کر میں دریائے سین کی طرف آ گیا جو پیرس شہر کے بیچ سے گزرتا ہے۔ دریائے سین اور ایفل ٹاور کے درمیان وہ مشہور زمانہ tunnel بھی ہے جہاں لیڈی ڈیانا کی گاڑی کا حادثہ ہوا تھا۔ دریائے سین کی سیر کرنے کے لئے آپ کو cruise کا ٹکٹ لینا پڑتا ہے جو آپ کو ایک گھنٹے میں دریا میں ہی پورے پیرس کا چکر لگوا دیتا ہے۔ دریائے سین کے ارد گرد بے شمار تاریخی عمارات ہیں جن کے بارے میں cruise میں آپ کو ایک رنگ کنٹری سنائی جاتی ہے۔ مجھے اس وقت چونکہ شدید قسم کی نیند آرہی تھی اس لئے میں cruise میں ہی سو گیا، جب میری آنکھ کھلی تو ہمارا سفر ختم ہو چکا تھا۔

شام ہو چکی تھی لیکن شانزالیزے کی زیارت ابھی باقی تھی۔ یہ دنیا کی مشہور ترین شاہراہوں میں سے ایک ہے اور یہاں بھی ہر وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ یہاں دنیا کی معروف ترین branded shops ہیں جہاں لیمریزن سے لے کر جوتوں تک ہر چیز دستیاب ہے۔ تاہم لیمریزن کا شوروم دیکھ کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی کیونکہ اس شوروم کی اکثر گاڑیوں پر گرد جمی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے کافی عرصے سے ان کے پاس کوئی سیریس قسم کا گاہک نہیں آیا تھا۔ شانزالیزے، ایفل ٹاور، چرچ آف نائروڈیم، دریائے سین، لے حال شاپنگ سینٹر اور پیرس کے لاتعداد تاریخی محلات اور فیشن اور ثقافت کا گڑھ ہونے کے ناتے یہاں ہر سال ریکارڈ تقریباً تین کروڑ سیاح آتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پیرس شہر کی آبادی فقط بارہ لاکھ ہے جبکہ یہاں سیاحوں کی وجہ سے روزانہ تقریباً چوالیس لاکھ لوگ میٹرو میں سفر کرتے ہیں جو ماسکو کے بعد یورپ کی مصروف ترین میٹرو ہے۔

پیرس میں کالوں کی بھی کثیر تعداد ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں کی پولیس ان سے کچھ ہمتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کالے یہاں ویسی ہی حرکتیں کرتے ہیں جیسی وہ دنیا کے دیگر ملکوں میں کرتے ہیں مثلاً بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا، branded stores کے باہر جعلی مال بیچنا، راہ چلتے لوگوں سے ”پنگے“ لینا وغیرہ وغیرہ۔ تاہم حیرت انگیز طور پر مجھے کم از کم پیرس میں



تقریر ادھوری چھوڑ کر چلا جاؤں گا، آفر آل میں بادشاہ ہوں .....!!! اوکے، تھینک یو۔  
جی میرے عزیز ہم وطنو! میری شاندار پالیسیوں میں سے ایک پالیسی غیر ممالک کو  
دیسی بندے ایکسپورٹ کرنا تھا جس سے میں نے بے تحاشا زر مبادلہ کمایا.....مم.....میرا  
مطلب ہے کہ ریاست نے ریکارڈ توڑ زر مبادلہ کمایا اور ہماری ”ڈالر دو، بندے لو“ پالیسی  
بے حد ہٹ ہوئی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس قدر کامیابی کے باوجود کسی اور ملک نے یہ  
پالیسی نہیں اپنائی۔ خیر یہ ان کا اپنا معاملہ ہے مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اپنے لوگوں نے بھی  
اس پر کڑی تنقید کی جس کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ وہی مٹھی بھر بے  
وقوف لوگ ہیں جنہیں بین الاقوامی سیاست کی سمجھ ہی نہیں۔ یہ لوگ صرف اپنا مفاد دیکھتے تھے  
جبکہ میں ..... میں اپنے مفاد کے ساتھ اپنے ساتھیوں کا مفاد بھی مد نظر رکھتا تھا۔  
جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ میں happy go lucky قسم کا آدمی  
ہوں اور کسی بات کو بھی دل پر نہیں لیتا۔ لوگوں نے مجھ پر بے تحاشہ تنقید بھی کی لیکن میں نے  
ہمیشہ اسے خوش دلی سے برداشت کیا تاہم یہاں مجھے پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ کچھ  
شر پسند عناصر نے میری اس جولی طبیعت کو بزدلی سمجھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں  
نے بلا جواز تنقید سے میرا جینا حرام کر دیا لہذا جواباً مجھے بھی ان کے جینے پر پابندی لگانا پڑی،  
کسی نے صحیح کہا ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ آپ لوگ حیران ہو رہے ہوں گے کہ آج مجھے  
اتنے محاورے کیوں یاد آ رہے ہیں تو اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آج کل میں فارغ  
وقت میں کچھ بچوں کو اردو کی ٹیوشن پڑھا دیتا ہوں، اپنی بھی دہرائی ہو جاتی ہے اور ٹائم بھی  
پاس ہو جاتا ہے، اسے کہتے ہیں ایک پنٹھ دوکان!!!

عزیز ہم وطنو! میرے سنہرے دور کے کارناموں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اگر  
میں سب کی تفصیل سنانے بیٹھوں تو رات ہو جائے اس لئے میں صرف ایک دو باتیں ہی آپ  
سے شیر کروں گا۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے کبھی اپنے دور بادشاہت میں  
قانون نہیں توڑا بلکہ ہٹلر کی طرح میں نے بھی پہلے اپنی مرضی کا قانون بنایا اور پھر اس پر عمل  
کیا۔ کچھ مفسدین جو اپنے آپ کو قانون کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں، مجھ پر مسلسل  
الزام تراشیاں کرتے رہے مگر میں نے ہمیشہ ان کو چھوٹ دی، افسوس کہ آج مجھے کوئی چھوٹ  
دینے پر راضی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ میں نے کچھ اور لوگوں کو بھی با امر مجبوری برداشت کیا

## بادشاہ سلامت کی آخری تقریر

میرے عزیز ہم وطنو! آج میں آپ سے آخری مرتبہ مخاطب ہوں کیونکہ میں نے اقتدار  
چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے، اوہو..... پلیز..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟ بھئی یہ مٹھائیاں  
بعد میں تقسیم کر لینا..... کیا مصیبت ہے، اب ہوائی فائرنگ بھی شروع ہو گئی..... کیا؟؟ کیا کہا  
تم نے؟؟ کیمرہ مین شکرانے کے نفل پڑھنے چلا گیا ہے اس لئے تقریر روکنی پڑے گی، تم ہوش  
میں تو ہو.....؟؟ سوری بہنو اور بھائیو، تھوڑی ڈسٹر بنس ہو گئی..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں  
نے بادشاہت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اپنے پچھلے تمام فیصلوں کی طرح میں  
نے یہ فیصلہ بھی ”سب سے پہلے میں“ کے اصول کے تحت کیا ہے، کیونکہ اگر میں یہ فیصلہ نہ کرتا  
تو میرے ایک بدخواہ کے مطابق پھر وہی صورتحال ہوتی جو سو پیاز اور سو جوتے کھانے کے بعد  
پیدا ہوتی ہے۔

آج جب میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ میرے دور سلطنت میں  
لوگ امن و امان سے رہتے تھے اور یہ امن و امان برقرار رکھنے کے لئے مجھے روزانہ کئی لوگوں  
کی جان لینی پڑتی تھی اور کئی بندے غائب کروانے پڑتے تھے تاہم اکثر یہ پالیسی کچھ ناخلف  
اور بے ہودہ لوگوں کو سمجھ نہیں آتی تھی۔ اسی طرح میرے لئے یہ بات بھی باعث افتخار ہے کہ  
میں نے لوگوں کے لئے بلا روک ٹوک فوری انصاف کی فراہمی یقینی بنائی اور جو کوئی بھی  
انصاف کی راہ میں حائل ہوا، میں نے اسے تلوار کے زور سے ہٹا دیا..... ہائیں.....!!! یہ شیم  
شیم کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں؟؟ بھئی پلیز اگر آپ اس طرح ہونگ کریں گے تو میں



کامیاب ہو جاتے، ان کی کیفیت تو ایسی ہوتی گویا دنیا میں ہی جنت مل گئی ہو۔ اب تو ہر ایرا غیر انتھو غیر اتھک آمیز طریقے سے میرا نام لے کر اپنی توقیر میں اضافہ کروانا چاہتا ہے، کاش کہ میرے پاس اب بھی چھڑی ہوتی تو میں ایک ایک کو سیدھا کر دیتا لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ وقت سدا ایک سائیں رہتا۔

میرا تو یہ سوچ سوچ کر جی ہلکان ہو رہا ہے کہ میرے بعد اس ملک کا کیا بنے گا؟؟ کس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ میری طرح بادشاہت کر سکے، یہاں کے لوگوں کو تو ڈھنگ سے انگریزی میں بات نہیں کرنی آتی، وہ اپنی مارکیٹنگ کیا خاک کریں گے۔ میرا خیال تھا کہ میں تا دم مرگ اپنی عوام کی خدمت کرتا رہوں گا کیونکہ میں ہمیشہ سے یہی سمجھتا رہا کہ لوگوں کی خاموش اکثریت میرے ساتھ ہے، میرے تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن یہ ملک میرے بغیر بھی چلایا جائے گا ورنہ میں اپنے کسی شہزادے کو ہی تخت کے لئے تیار کر لیتا اور خود جج کے لئے نکل کھڑا ہوتا لیکن افسوس کہ کچھ لوگوں نے محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر میرا ہی دھڑن تختہ کر دیا۔

میرے عزیز ہم وطنو! تقریر کافی لمبی ہو گئی ہے اور یہ کیمرا مین بھی بار بار بے ہودہ اشارے کر رہا ہے، لگتا ہے اس نے کہیں جشن منانے جانا ہے، خود مجھے بھی دیر ہو رہی ہے، میرا جہاز تیار کھڑا ہے لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ اس میں ابھی تک پٹرول نہیں ڈلوایا گیا، شاید یہ احسان فراموش لوگ مجھ سے پٹرول کے بھی پیسے لیں؟ غضب خدا کا، مجھے تو آج معلوم ہوا ہے کہ ہائی آکٹین 96 روپے لیٹر ہو فروخت ہو رہا ہے!!! کیا ہو گیا ہے اس ملک کو، کوئی پوچھنے والا ہی نہیں، میرے بعد یہ قوم کیسے زندہ رہے گی؟؟ ہائیں..... یہ دھماکوں کی آوازیں کہاں سے آرہی ہیں؟؟ کیا کہا؟ پورے ملک میں آتش بازی ہو رہی ہے..... مگر کس خوشی میں؟؟ What nonsense؟؟ یقیناً یہ آتش بازی مجھے روکنے کے لئے ہو رہی ہوگی..... مگر مجھے افسوس ہے کہ اب میں رک نہیں سکتا البتہ میں آتش بازی کے یہ مظاہرے ضرور دیکھ کر جاؤں گا لہذا بہنو اور بھائیو، مجھے اجازت دو، خدا میرا حامی و ناصر ہو!!!

(12 اگست 2008ء)

مگر وہ بھی احسان فراموش ہی نکلے، بقول حفیظ  
دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف  
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یہ شعر تو میں نے یہاں محض اپنی ٹیوشن کی دھاک بٹھانے کی لئے فٹ کیا ہے ورنہ ”کمیں گاہ“ میں تو میرا کبھی بھی کوئی ”دوست“ نہیں رہا۔ میرے تمام دوست تو غیر ملک میں رہتے ہیں اور اب شاید میں انہی میں سے کسی کے پاس جاؤں لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ آگے سے مجھے احمد فراز کا یہ شعر نہ سنا دیں کہ

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز  
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

میرے عزیز ہم وطنو! آپ لوگ بہت بھولے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میرا آپ کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں کر رہا مگر بیڑا عرق ہوا نا خلف لوگوں کا جنہوں نے پوری قوم کو گمراہ کیا ہوا ہے، انہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں اس ریاست کے لئے کس قدر ضروری ہوں، آپ یقین کریں کہ اگر عالمی منڈی میں میری بولی لگے تو..... خیر چھوڑیں اس بات کو، میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا!!!

اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ایک دو باتیں اپنے حواریوں سے بھی کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میرے جانے کے بعد کبھی کبھی مجھے اچھے لفظوں میں بھی یاد کر لیا کرنا، بیا نہ ہو کہ جھوٹی شہرت کی خاطر ہر انٹرویو میں اس قسم کا بیان داغ دو کہ ”جناب میں تو ہر وقت بادشاہ سلامت کے سامنے کلمہ حق ہی بلند کرتا رہا مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے“ یا یہ کہ ”میں نے بادشاہ سلامت کی تمام پالیسیوں کی ان کے منہ پر تنقید کی تھی اور ہمیشہ بغیر کسی لالچ کے سچ کو سچ کہا مگر بادشاہ نے کبھی پرواہ ہی نہیں کی“ وغیرہ وغیرہ۔ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر آپ میں سے کوئی بھی ایسی حرکت کرتا تو اس کی گردن اڑا دی جاتی لہذا بات وہ کرنا جس پر لوگ یقین بھی کر لیں۔

ہائے ہائے کیسے کیسے دن گزارے ہیں میں نے محل میں، اب یاد کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بڑے بڑے پیر فقیر، جاگیر دار، وڈیرے، بزنس مین حتیٰ کہ کچھ صحافی بھی میرا براہ راست دیدار کرنے کو ہی اپنے لئے بابرکت سمجھتے تھے اور ان میں سے جو میرا ہاتھ چومنے میں

منافع آج ہی خرچ کر ڈالے۔ جہاں تک بٹ صاحب کا تعلق ہے تو اگر انہیں اس دوا کا ذائقہ پسند آ گیا تو کوئی بعید نہیں کہ وہ اس کی ”ڈوز“ حسب ذائقہ لینی شروع کر دیں یعنی آدھ کلو دوائی صبح ناشتے میں کپکپوں کے ساتھ اور آدھ کلو رات کو کڑا ہی گوشت کے ساتھ!!! رہی بات ڈیفینس سیکورٹیز کی تو اس معاملے میں تو پھر بھی دس سال بعد منافع ملنا یقینی ہے جبکہ اس دوا کا تیر بہدف ہونا یقینی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوا کو مارکیٹ میں آنے میں دس سال سے زیادہ لگ جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوا صرف ان لوگوں کو موٹا نہ ہونے دے جو پہلے سے ہی دبلے ہوں اور جو لوگ پہلے ہی موٹے ہوں، ان پر کوئی اثر نہ کرے، تاہم ایک بات طے ہے کہ ہر دو صورتوں میں یہ دوا خواتین پر ضرور اثر کرے گی ورنہ بری طرح فیل ہو جائے گی۔

جب میں نے اس دوا کا ذکر ”بلی“ سے کیا تو وہ لا پرواہی سے بولی ”مجھے ایسی کسی دوا کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں یونہی بالکل فٹ ہوں۔“ واضح رہے کہ بلی کا وزن تقریباً 80 کلو ہے۔ اور جب اس دوا کے بارے میں راجو بلیکی سے گفتگو ہوئی تو موصوف فرمانے لگے کہ ”سرجی! آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر ہو جاتے ہیں، اس ٹائپ کی دوائی تو حاجی بابا شاہ عالمی والے پچھلے بیس سال سے بیچ رہے ہیں، آپ کہیں تو آپ کو بھی لا دوں، اس کے اور بھی بڑے فائدے ہیں!!!“ میں جواب میں فقط لاجول والا ہی کہہ سکا۔

نیویارک کے سائنسی میلے میں ایک اور بھی پیشن گوئی کی گئی جو گلوبل وارمنگ کے متاثرین کے لئے یقیناً ایک اچھی خبر ہوگی کہ بیس سال کے اندر اندر شمسی توانائی کے میدان میں اتنی ترقی ہو جائے گی کہ اس سے دنیا کی توانائی کی تمام ضروریات پوری ہو سکیں گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو سب سے زیادہ فائدہ ہمیں ہوگا کیونکہ شاید پھر لوڈ شیڈنگ سے نجات مل جائے لیکن نہیں..... ٹھہرے..... یہ محض خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ہم سے کوئی بعید نہیں کہ بیس سال بعد جب ساری دنیا شمسی توانائی کا فائدہ اٹھا رہی ہو تو ہم پھر کبھی اوٹ پٹانگ وجہ سے اندھیرے میں ہی بیٹھے ہوں۔ البتہ ایک بات کا امکان ضرور ہے اور وہ یہ ہم کوئی ایسا آلہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس کی مدد سے سورج کو کنڈی ڈال کر بجلی چوری کی جاسکے، اسی صورت میں ہم اقوام عالم میں سرخرو ہو سکیں گے۔

## سائنٹیفک شرط

آج سے کئی سو سال پہلے اگر کوئی شخص اکبر بادشاہ کے دربار میں یہ دعویٰ کرتا کہ ”جہاں پناہ! میں آپ کو شہزادہ سلیم اور انارکلی کے درمیان ہونے والی ملاقاتوں کی تصویر یہاں آپ کے دربار میں ”لاؤ“ دکھا سکتا ہوں“ تو اکبر اعظم صاحب اس شخص کو صدی کا سب سے بڑا جادوگر مان کر وہیں غش کھا کر گر پڑتے۔ اسی طرح اگر چنگیز خان کے سامنے یہ کہا جاتا کہ ”آپ کے دشمنوں کے پاس ایسے جنگی ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ آپ کو اپنے ملک میں بیٹھے بیٹھے ہی تباہ کر سکتے ہیں“ تو چنگیز خان یقیناً اس بتانے والے کا مذاق اڑاتا اور پھر اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر اس کی گردن بھی اڑا دیتا۔

یہ دونوں مفروضات بیان کرنے کی نوبت اس لئے پیش آئی کیونکہ وہ پہلے نیویارک میں ایک ایسا سائنسی میلہ منعقد کیا گیا جس میں سائنس اور انسان کے مستقبل کے بارے میں ایسی ہی چند نہایت دلچسپ اور ناقابل یقین قسم کی قیاس آرائیاں اور پیشن گوئیاں کی گئیں۔ مثلاً آئندہ دس برسوں میں ایک ایسی دوا ایجاد ہو کر مارکیٹ میں آجائے گی جس کے استعمال کے بعد آپ جو چاہیں کھائیں، آپ کے وزن میں اضافہ نہیں ہوگا۔ جب سے بٹ صاحب کو اس بات کا پتا چلا ہے انہوں نے دن دگنا اور رات چوگنا کھانا شروع کر دیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں اگر وہ مزید موٹے بھی ہو گئے تو پرواہ نہیں کیونکہ دس سال بعد وہ ایک ہی دفعہ اس دوا کی ”ڈوز“ لے کر دبلے ہو جائیں گے۔ کھانے پینے کی یہ strategy بالکل ویسے ہی ہے جیسے کوئی شخص ڈیفینس سیکورٹیز خریدے اور اس پر دس سال بعد ملنے والا

کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی عمریں اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ وہ مرتے نہیں بلکہ انہیں خود مارنا پڑتا ہے!!! ویسے اگر کہیں کوئی ایسی کمپیوٹر چپ ایجاد ہوگئی جس سے انسان اپنے آپ کو دو سو سال کی عمر میں بھی اکیس برس کا لونڈا ہی محسوس کرنے لگے تو پھر مزید مشکل ہو جائے گی کیونکہ ایسے میں اخبار میں کچھ اس قسم کی خبریں شائع ہوں گی کہ ”385 سالہ عمر حیات کا 18 سالہ دو شیرہ سے نکاح، بارات میں عمر حیات کے 150 بچوں کی بھی شرکت“ یا یہ کہ ”100 سالہ ”شین“ اپنے 25 سالہ آشنا کے ساتھ فرار، ”شین“ کے چھ درجن بچوں کو ماں کی تلاش“!!! وغیرہ وغیرہ۔ اخبارات میں کچھ اس قسم کے اشتہارات بھی شائع ہو سکتے ہیں کہ ”ایک پڑھی لکھی، خوش اطوار اور خوش شکل لڑکی کا رشتہ درکار ہے، خاندان کی کوئی قید نہیں، لڑکی کی ”جینین“ عمر چالیس سال ہے اور کمپیوٹر چپ ڈلوئے محض پانچ سال ہوئے ہیں، لڑکے کی ”جینین“ عمر ساٹھ سال سے زیادہ نہ ہو اور اسے کمپیوٹر چپ ڈلوئے تین برس سے زیادہ نہ گزرے ہوں، صحافی اور کمپیوٹر چپ کا کاروبار کرنے والے زحمت نہ کریں، شکریہ۔“

خیر جو بھی ہو، ایک بات تو طے ہے کہ ان غیر ملکیوں کے ساتھ ساتھ ہم بھی یقیناً ترقی کی منازل طے کریں گے اور اپنی حیرت انگیز ایجادات سے دنیا کو حیران کر دیں گے۔ اس کالم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند ایک سائنسی پیشین گوئیاں میں بھی کرنا چاہتا ہوں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ آنے والے وقت میں ہم یقیناً ایک ایسی ”کار لفٹنگ ڈیوائس“ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہر قسم کے ٹریکر کا توڑ ہوگی، کسی بھی گاڑی میں کوئی بھی لاک سسٹم لگا ہو، یہ ڈیوائس اسے ناکام بنا کر کار چوری میں نہایت مددگار ثابت ہوگی۔ ہم ایک ایسا آلہ بنانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے جو کسی بھی اے۔ٹی۔ ایم کو ناکارہ بنا کر اس میں موجود تمام کیش کا ایسے صفایا کرے گا کہ بنک کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ اور سورج کو کٹھنہ ڈال کر شمسی توانائی چوری کرنے والی ایجاد کے بارے میں تو پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں۔ یہ اور ایسی ان گنت ایجادات سائنس کی دنیا میں تھمکے چا دیں گی، اگر آپ کو یقین نہیں تو بے شک ڈاکٹر کرزوائل کی طرح مجھ سے شرط لگالیں لیکن ذرا سوچ کر کیونکہ ہمارے آپ ہی کی ہوگی!!!

(19 اگست 2008ء)

اس میلے کی سب سے حیرت انگیز اور ناقابل یقین پیشین گوئی ایک سائنس دان ڈاکٹر کرزوائل نے کی جس کے مطابق اگلے پندرہ برس کے اندر اندر طبی سائنس اتنی ترقی کر لے گی کہ انسان کی متوقع عمر میں اس سے زیادہ تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہو جائے گا جتنی تیزی سے ہو بڑھا ہوتا ہے۔ اور اکیسویں صدی کے نصف تک پہنچتے پہنچتے انسان اور کمپیوٹر کا ادغام ممکن ہو جائے گا، جس کے بعد موت کا تصور ہی فنا ہو جائے گا!!! بظاہر یہ بات ناممکن سی نظر آتی ہے تاہم واضح رہے کہ سائنسی پیشین گوئیاں کرنے کے معاملے میں ڈاکٹر کرزوائل کی reputation بہت زبردست ہے۔ مثلاً انھوں نے 1990 میں پیشین گوئی کی تھی کہ 1998 کے آتے آتے کمپیوٹر خطرناک کے کھیل میں اس کے عالمی چیمپین کو شکست دے سکے گا اور پھر یہی ہوا، 1997 میں IBM کے تیار کردہ Deep Blue نامی کمپیوٹر نے خطرناک کے عالمی چیمپین گیری کاسپروف کو ہرا کر دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اسی طرح ڈاکٹر کرزوائل نے 1980 کے عشرے ہی میں انٹرنیٹ کے دنیا بھر میں پھیلاؤ کی پیشین گوئی کی تھی جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

تاہم اسی میلے میں شامل ایک نیوروسائینٹسٹ ڈاکٹر رام چندرن نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر کرزوائل سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ ہو سکتا ہے انسان ایک ذہین اور سوچنے والا کمپیوٹر تو بنا ڈالے لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ انسانی دماغ کی صلاحیت کو کمپیوٹر چپ لگا کر بہتر بنایا جاسکے کیونکہ دماغ کروڑوں برس کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور اس کے سرکٹ انتہائی بے ترتیب اور من مانے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں ڈاکٹر صاحبان نے آپس میں اس بات پر دس دس ہزار ڈالر کی شرط بھی لگائی ہے!!! آفرین ہے ان لوگوں پر جو ایسی باتوں پر ہزاروں ڈالر کی شرطیں لگا لیتے ہیں اور ایک ہم ہیں جو اس بات پر شرطیں لگاتے پھرتے ہیں کہ سڑک پر پہلے سفید رنگ کی گاڑی آئے گی یا کالے رنگ کی؟؟

اگر بالفرض محال موصوف کرزوائل کی پیشین گوئی درست ثابت ہوگئی اور اکیسویں صدی میں ہی موت کا تصور فنا ہو گیا تو کیا ہوگا؟؟ میرے خیال میں تو یہ سوچ زیادہ خوش کن نہیں ہے کیونکہ اگر جوانی اتنی ہی رہی اور محض بڑھاپا طویل ہو گیا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان ہوگا کیونکہ پھر لوگ ایسی زندگی کی نہیں بلکہ موت کی دعا مانگیں گے، جیسے جاپانیوں

وغیرہ۔ یہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے پولیو کی ویکسین، ہیپاٹائٹس بی کی دوائی، لیوکیما کی دوائی اور contraceptive medicines بنائیں اور گردے کا ڈائلیسز، بچے کی پیدائش کا عمل اور انسانی آنکھ پر تحقیق جیسے بیش بہا کام کئے وہ سب بھی یہودی تھے۔ گزشتہ 105 سالوں میں ڈیڑھ کروڑ یہودیوں میں سے 180 نے نوبل انعامات حاصل کئے ہیں جبکہ ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے حصے میں صرف تین انعامات آسکے!!!

یہ فہرست یوں تو کافی طویل ہے لیکن پھر بھی یہودیوں کے چند مزید کارہائے نمایاں بتائے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی جیسے کہ ان ایجادات کا تذکرہ جنہوں نے انسانی تاریخ ہی بدل کر رکھ دی مثلاً مائیکرو پروسیسنگ چپ، نیوکلیئر چین ری ایکٹر، آپٹیکل فائبر کیبل، ٹریفک لائٹس، سٹینلیس سٹیل، مائیکروفون، ویڈیو ٹیپ ریکارڈر وغیرہ وغیرہ۔ مزید یہ کہ 57 مسلمان ممالک میں صرف 500 یونیورسٹیاں ہیں جبکہ اکیس امریکہ میں 5758 یونیورسٹیاں ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا کی پہلی پانچ سو ٹاپ رینک یونیورسٹیوں میں سے ایک بھی مسلمان ممالک کی نہیں ہے (ویسے یہ دلچسپی کی نہیں بلکہ بے عزتی والی بات ہے)۔ مسلمان اکثریت والے ممالک میں ہر دس لاکھ آبادی میں صرف 230 سائنس دان ہیں جبکہ امریکہ بہادر میں یہ تناسب 5000 فی دس لاکھ ہے۔ اگر ہم بڑے بڑے عالمی کاروباروں پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی یہودیوں کا سکہ ہی چلتا ہوا نظر آتا ہے جیسے پولو، کواکولا، لیوئس جینز، سٹارکس کافی، ڈیل کمپیوٹرز، اوریکل، DKNY، ڈکن ڈونٹس اور last but not the least گوگل جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ (نعوذ باللہ) گوگل خدا ہے کیونکہ یہ ہر جگہ موجود ہے اور اسے سب معلوم ہے!!! حقائق کی یہ لسٹ یوں تو ابھی ختم نہیں ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ فی الحال تصویر کا پہلا رخ اسی قدر دکھانا ہی کافی ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک عرب شہزادہ، جس کا نام شہزادہ ولید بن طلال بن عبدالعزیز بن سعود ہے، ایک ایسی گاڑی کا مالک ہے جس کی مالیت 4.8 ملین ڈالر ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس مرسیڈیز SL600 پر ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ ہیروں کی اس کار کو چھونا چاہتے ہیں جو بادی النظر میں برف سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہے تو اس کے لئے آپ کو ایک ہزار ڈالر دینے پڑیں گے۔ شہزادہ صاحب اس کے علاوہ مزید تین سو گاڑیوں کے بھی مالک ہیں اور یہی نہیں بلکہ ان کے پاس پانچ سو ملین ڈالر کا ایک بحری جہاز اور

## “That was worth it”

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ”تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، ایک کالا اور دوسرا..... اس سے بھی کالا!!!“، لیکن کچھ تصویریں ایسی ہوتی ہیں جو مونالیزا کی طرح بیک وقت کئی رخ رکھتی ہیں یعنی انہیں اگر ایک زاویے سے دیکھا جائے تو وہ مسکراتی ہوئی نظر آئیں گی، کسی دوسرے اینگل سے وہ آپ کو منحوس صورت لگیں گی، تیسرے رخ سے وہ آپ کو افسردہ معلوم ہوں گی اور چوتھی سمت سے وہ آپ کو بھیا نک نظر آئیں گی (لیونارڈو ڈا ونچی کی روح مجھے معاف کرے)۔ ایسی ہی کچھ حقیقت اعداد و شمار کی ہوتی ہے، آپ انہیں جس رخ سے چاہیں پیش کر سکتے ہیں، اصل میں یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ تاہم کچھ حقائق ایسے ہوتے ہیں جنہیں آپ سیدھے کھڑے ہو کر دیکھیں یا سر کے بل، انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ آج ایسے ہی کچھ حقائق میں نے بھی یہاں جمع کئے ہیں جن کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق نہیں لیکن اگر آپ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر پڑھیں تو شاید ایک ایسی تصویر وجود میں آئے جو بیک وقت مسکراتی ہوئی، منحوس، افسردہ اور بھیا نک لگے گی۔

تصویر کا پہلا رخ یہ ہے کہ دنیا میں یہودیوں کی آبادی صرف ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی تقریباً ڈیڑھ ارب ہے یعنی ہر ایک یہودی کے مقابلے میں 107 مسلمان ہیں لیکن پھر بھی یہودی دنیا میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔ اگر آپ حالیہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ تمام لوگ یہودی تھے جنہوں نے انسانی زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دیا، مثلاً البرٹ آئن سٹائن، سگمنڈ فرائڈ، کارل مارکس وغیرہ



پابندیاں لگائیں تو اس کے نتیجے میں پانچ لاکھ عراقی بچے دواؤں اور خوراک کی کمی کی وجہ سے مر گئے۔ اس بارے میں جب اس وقت کی امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائیٹ سے پوچھا گیا تو اس نے جو جواب دیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا، اس نے کہا ”I think that was worth it“!!! یہ ہے تصویر کا سب سے ڈراؤنا اور سفاک رخ!!! مغربی اقوام کی ترقی، سائنس اور ٹیکنالوجی میں برتری اپنی جگہ، ہماری کمینگی اور بے رحمی اور انتہا پسندی بھی اپنی جگہ، ہماری جہالت اور عیاشیاں بھی اپنی جگہ لیکن پانچ لاکھ بچے..... ذرا تصور کیجیے، پانچ سو نہیں، پانچ ہزار نہیں، پانچ لاکھ..... اور وہ بھی بچے، قتل کر کے مغربی دنیا کے انسانی حقوق، جمہوریت اور انصاف کے علمبردار ملک کی ایک وزیر خارجہ عورت کہتی ہے:

That was worth it!!!

(27 اگست 2008ء)

ایک Boeing 747 بھی ہے۔ موصوف کا ارادہ 2009 تک اپنے نئے تیار شدہ محل میں شفٹ ہونے کا ہے جس کی مالیت سو ملین ڈالر ہے، 1500 ٹن اٹالین ماربل سے تیار شدہ اس محل میں 317 کمرے اور لگ بھگ 250 ٹی۔وی سیٹ ہوں گے۔ محل میں پانچ کچن ہوں گے جن میں عربی، لبنانی، کانٹینیٹل اور ایشیائی کھانے تیار ہوا کریں گے جبکہ پانچواں کچن صرف میٹھا بنانے کے لئے ہوگا۔ مختصراً یہ کہ محل کے شیف حضرات صرف ایک گھنٹے کے نوٹس پر دو ہزار لوگوں کا کھانا تیار کر سکیں گے۔

31 سال کی عمر میں ارب پتی ہونے والا یہ شہزادہ اس وقت صرف 41 برس کا ہے اور اس کی دولت کا تخمینہ 14 ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ ”فوربس“ کے مطابق شہزادہ صاحب دنیا کے 19 ویں امیر ترین شخص ہیں۔ واضح رہے کہ یہ وہی شہزادہ صاحب ہیں جنہوں نے 9/11 کے حملوں کے بعد امریکہ کو دس ملین ڈالر کا عطیہ دینے کی کوشش کی تھی جسے اس وقت کے نیویارک کے میئر روڈی جولیانے نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

اب تصویر کا تیسرا رخ دیکھتے ہیں جو مزید حیرت انگیز ہے۔ پاکستان، جس کی آبادی کم از کم سولہ کروڑ اور رقبہ آٹھ لاکھ مربع کلومیٹر ہے، سال میں صرف بیس ارب ڈالر کی برآمدات کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا میں ایک ملک ہے جس کا نام فن لینڈ ہے، اس کی آبادی صرف 53 لاکھ اور رقبہ ساڑھے تین لاکھ مربع کلومیٹر سے بھی کم ہے، اس ملک کی صرف ایک کمپنی کا سالانہ ریونیو 51 ارب یورو سے بھی زیادہ ہے یعنی فن لینڈ کی ایک کمپنی کا ریونیو پاکستان کی کل برآمدات سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔ اس کمپنی کا نام بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ بھی یقیناً اسی کمپنی کا موبائل فون استعمال کرتے ہوں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کاغذ تیار کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی بھی فن لینڈ میں ہے اور دنیا کے سب سے بڑے بحری جہاز بنانے کی کمپنی بھی اسی ملک میں ہے، اس کے علاوہ بھی فن لینڈ کے ہیٹ میں بے شمار پر سبے ہیں۔

اب ذرا تصویر کا چوتھا رخ دیکھتے ہیں جو کہ خاصا بھیانک ہے۔ بات شروع ہوئی تھی یہودیوں سے کہ جن کی اجارہ داری پوری دنیا میں قائم ہے۔ ہنری کسنجر، میڈلین البرائیٹ، مائیکل ہاورڈ، یوگینی پراگما کوو (روسی وزیر اعظم)، بنجمن ڈسراکلی، یہ سب اور ایسے بہت سے دوسرے خیر سے یہودی ہیں۔ 1992ء کی خلیج کی جنگ کے دوران جب امریکہ نے عراق پر



بنیادوں پر برداشت کریں گے تاہم بعد میں، آپ کی کارکردگی کو مد نظر رکھتے ہوئے، اخراجات کا زیادہ تر حصہ میرے کھاتے سے بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ ویسے یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں ایک کھلے ذہن کا مالک ہوں اس لئے اگر آپ میرے اخراجات بھی برداشت کرنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شاپنگ یا دیگر ایسے اخراجات جو ایک مروجہ حد سے تجاوز کریں گے، بہر حال آپ ہی کے ذمہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ اپنے آپ کو ان کا اہل ثابت کر دیں۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس خط کے وصول کرنے کے 30 دن کے اندر اندر اپنے جواب سے مطلع فرمائیں بصورت دیگر محبت کی یہ آفر بغیر کسی مزید نوٹس کے منسوخ تصور کی جائے گی اور آپ کی جگہ کسی نئے امیدوار کو موقع دیا جائے گا۔ اگر آپ اس آفر سے فائدہ اٹھانے کی خواہش مند نا ہوں تو بے شک اس خط کو اپنی بہن کے حوالے کر دیں، مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

نوٹ: جواب کے ہمراہ اپنا میڈیکل فٹنس سرٹیفکیٹ لف کرنا مت بھولنے گا، یقین کیجیے کہ یہ محض ایک معمول کی کارروائی ہے اور یہ سرٹیفکیٹ کسی خاص مقصد کے تحت نہیں مانگا جا رہا۔

آپ کا مخلص

ہیومن ریسورس مینجر

محترمہ آنسہ سونیا، اسلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ!

والدین کی معرفت میرے علم میں آیا ہے کہ آپ جلد یا بدیر میرے نکاح میں آنے والی ہیں، یقین کیجئے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی اور کئی دن تک بوجہ نیند نہیں آئی۔ اس خط کی وساطت سے آپ کی خدمت میں چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں، امید ہے آپ ان پر غور فرما کر جنت میں اپنے لئے جگہ بنائیں گی۔

آپ ماشاء اللہ ایک علمی اور دیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے دین کے احکامات سے کما حقہ واقفیت ہوگی۔ مجھے یہ بات کہنی تو نہیں چاہئے لیکن آپ کے ہونے والے مجازی خدا کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ گھر سے باہر آتے جاتے چہرے پر نقاب ڈال لیا کریں تاکہ مفسدین کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔ میں نے آپ کو جب بھی یونیورسٹی جاتے ہوئے دیکھا ہے، عموماً ایک عقیفہ آپ کے ہمراہ ہوتی ہے جس نے اکثر ایک

## مردانہ خط و کتابت

اردو ادب کے بے مثال مزاح نگار جناب شفیق الرحمن نے ”زنانہ اردو خط و کتابت“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو ان کی کتاب ”مزید محبتیں“ میں شامل ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے ”مردانہ خط و کتابت“ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ آج میں نے یہ مشکل کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور مردوں کی رہنمائی کے لئے چند نمونے کے خطوط لکھ دیئے ہیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں۔

پیاری مس سونیا!

مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ میں اس سال 14 فروری سے آپ کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ بحوالہ ملاقات جو ہمارے درمیان اس روز شام پانچ بجے ہوئی تھی، میں خود کو، آپ کے ممکنہ عاشق کے طور پر پیش کرنا چاہوں گا۔ ہماری محبت کے پہلے تین ماہ کا عرصہ ”پرومیشن پیریڈ“ ہوگا جسے بعد میں ہماری آپس کی ”انڈرسٹینڈنگ“ کی بنیاد پر مستقل کر دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ ”پرومیشن“ کا عرصہ مکمل ہونے کے بعد بھی دوران ”ملازمت“ تربیت اور کارکردگی جانچنے کے پروگرام جاری رہیں گے جن کی بنیاد پر آپ کو ایک محبوبہ سے بیوی کے درجے تک ترقی دی جاسکے گی۔ محبت کے ان مرحلوں کے دوران فریقین کسی بھی موقع پر ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں تاہم اس کے لئے انہیں ایک ماہ کا پیشگی نوٹس دینا ہوگا۔

چائے، کافی اور اسی قسم کے دیگر تفریحی اخراجات شروع شروع میں ہم دونوں مساوی

خریداری کر رہی تھی اس کا مالک ایک نمبر کا چور ہے اور دو نمبر چیزیں بیچتا ہے۔ اس کی بجائے آپ کبھی میری شاہ عالم مارکیٹ والی دکان پر تشریف لائیں، آپ کو پرفیوم، کاسمیٹکس وغیرہ نہایت ارزاں نرخوں پر دوں گا۔ اللہ کے فضل سے میری اس کے علاوہ اکبری منڈی میں بھی دکان ہے جہاں سے آپ گھی، دالیں، چاول، مرچیں غرض سب کچھ ہول سیل ریٹ پر خرید سکتی ہیں۔ اور میری اعظم کلاتھ مارکیٹ والی دکان پر تو آپ تشریف لا ہی چکی ہیں، آج کل وہاں مزید نئی ورائٹی آئی ہے جو یقیناً آپ کو پسند آئے گی، ریٹ کی فکر نہ کیجیے گا، انشاء اللہ ریٹ کی گارنٹی ہوگی۔

آپ کی دعا سے میں نے حال ہی میں امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار بھی شروع کر دیا ہے اور اس میں دن دگنی اور رات چگنی ترقی کر رہا ہوں، سنا ہے آپ کا ایک بھائی کسٹم میں ہے اور آج کل اس کی پوسٹنگ ڈرائی پورٹ پر ہے، انہیں میرا سلام کہئے گا، میں کسی روز ان کے دفتر میں بھی دست بدستہ سلام کرنے حاضر ہوں گا، وہ یقیناً مجھے خدمت کا موقع دیں گے۔ اگلے ماہ میرا ایک کنٹینر تھائی لینڈ سے آ رہا ہے۔

جب سے آپ کو دیکھا ہے کام میں دل ہی نہیں لگتا، ڈیفنس والا سٹور مسلسل گھاٹے میں جا رہا ہے، پچھلے ماہ صرف 25 لاکھ کی سیل ہوئی اور اس ماہ بھی بس گزرا رہی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دفعہ آپ کا پسندیدہ شیمپو کہیں بھی دستیاب نہیں تھا تو میں نے خاص طور پر دبئی سے منگوا کر دیا تھا، آپ نے اس کی پے منٹ کرنی چاہی تھی پر میں نے منع کر دیا تھا، میرے پاس اب تک اس کی 375 روپے کی رسید پڑی ہے جو مجھے ہر وقت آپ کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

کسی دن یونہی گزرتے گزرتے اپنا دیدار کروا جائیے، یقین جانیئے کہ اب تو ایک پل بھی آپ کے بغیر گزارنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

آپ کا اپنا

شیخ طاہر علی، پروپرائیٹرز، ہول سیل ڈیلرز، امپورٹرز اینڈ ایکسپورٹرز، انارکلی، لاہور

sleeveless کرتے کے ساتھ نیلے رنگ کی جینز پہنی ہوتی ہے (استغفر اللہ)، کبھی کبھار جینز کا شید مختلف ہوتا ہے لیکن رنگ نیلا ہی ہوتا ہے، یہ جینز اس قدر تنگ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ، غالباً مغرب میں انہیں hipsters کہتے ہیں۔ گو کہ کرتے کا رنگ روزانہ مختلف ہوتا ہے لیکن ہوتا ہمیشہ sleeveless ہے۔ مجھے اس عقیفہ کا نام تو نہیں معلوم (ویسے بھی نام جان کر میں نے کیا کرنا ہے) لیکن اس قدر ضرور علم ہے کہ موصوفہ ڈانس پارٹیز میں جانے کی خاصی شوقین ہیں۔ خیر، مجھے کیا، میرا واسطہ تو آپ سے ہے، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ لڑکی کہاں رہتی ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے تاہم اگر ہو سکے تو مجھے اس کا نام پتہ بتائیے گا تاکہ میں اس کے والدین کے ذریعے اس عقیفہ کو راہ راست پر لاسکوں، شاید میری یہی کوشش آخرت میں سرخروئی کا باعث بن سکے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ چونکہ ایم۔ بی۔ اے کر رہی ہیں اس لئے شادی کے بعد آپ کا ارادہ ملازمت کرنے کا ہے، یوں تو میں کافی حد تک آزاد خیال ہوں اور عورتوں کے ملازمت کرنے کو معیوب نہیں سمجھتا لیکن پھر بھی بہتر ہوگا اگر آپ اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔ مجھے آپ پر تو پورا بھروسہ ہے لیکن دفاتر میں جو صورت حرام مرد کام کرتے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں، آپ یقیناً میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔ وہ عقیفہ غالباً یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد ایڈورٹائزنگ کے شعبے سے وابستہ ہونا چاہتی ہیں، آپ بے شک انہیں بتا دیں کہ میرا ارادہ بھی عنقریب اپنے دوست کے ساتھ مل کر ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولنے کا ہے، بے شک کاروبار میں اللہ تعالیٰ نے بہت برکت رکھی ہے۔

مجھے پتہ چلا ہے کہ جب سے آپ کی اور میری بات پکی ہوئی ہے، آپ کی چند سہیلیاں مسلسل آپ کو میرے خلاف بھڑکا رہی ہیں، مجھے کہنے دیجیے کہ ان کا اپنا چال چلن اچھا نہیں ہے اور بے شک یہ دوزخ کی آگ میں جلیں گی۔

آپ کا بھائی

مولوی عامر

محترمہ سونیا صاحبہ!

امید ہیں مزاج بخیر ہوں گے۔ کل شام آپ کو لبرٹی مارکیٹ میں شاپنگ کرتے دیکھا تو دل باغ باغ ہو گیا، اسی وقت خط لکھنے بیٹھ گیا۔ جس دکان سے آپ

150 روپے کا ہو جائے گا، شرم آنی چاہئے تمہیں!!!“ میں نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ افواہ نہیں، حقیقت ہے، اور تم اس وقت پچھتاؤ گے جب ڈالر واقعی 150 کا ہو جائے گا۔“  
 یہ کہہ کر میرے دوست نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں  
 نے نیل دے کر چڑاسی کو بلایا اور پوچھا ”یہ جو صاحب ابھی آئے تھے، اندر آنے سے پہلے  
 انہوں نے تم سے کیا بات کی تھی؟“

کک..... کچھ نہیں جی، چڑاسی گڑبڑا کر بولا ”بس وہ پوچھ رہے تھے کہ یار تمہارے خیال میں  
 ڈالر کا ریٹ 150 ہو سکتا ہے، میں نے کہا جی کہ میں جاہل آدمی ہوں، مجھے کیا پتا..... لیکن  
 اگر آپ کہہ رہے ہیں تو پھر ہو بھی سکتا ہے۔“ چڑاسی کو رخصت کرنے کے بعد میں نے اس  
 افواہ کے پھیلنے کے طریقے پر غور کرنا شروع کیا ہی تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی، دوسری  
 طرف بلی تھی اور یہ ”خبر“ دے رہی تھی کہ ملک کے ایک با اثر آدمی نے دو شادیاں کر رکھی  
 ہیں ”قسم سے، میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے اپنے ٹی کی قسم!!!“  
 ”یہ ٹی کون ہے؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”میرا کتا..... اور کون؟“ بلی نے بھولپن سے جواب دیا۔ ”افواہ! تم ٹی کو چھوڑو اور ذرا اس خبر  
 پر غور کرو جو میں نے تمہیں ابھی دی ہے، کیسی بریکنگ نیوز ہے ناں!!!“  
 ”جی بے شک یہ بریکنگ نیوز ہے لیکن ذرا آپ مجھے اس نیوز کا سورس تو بتائیں؟“ میں نے  
 طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

”لو بھلا بتاؤ، اس خبر کا کوئی ایک سورس تو ہے نہیں، یہ خبر تو اب بچے بچے کی زبان پر ہے۔“  
 ”چلو تو پھر ایسے ہی کسی ایک بچے کا نام مجھے بھی بتا دو۔“ میں نے دانت کچکا کر کہا۔  
 ”تو سنو..... ابھی میری سہیلی لی آئی ہوئی تھی، اس کے منگیتر کے دوست کا ایک کزن ہے.....  
 بڑا سمارٹ لڑکا ہے، ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی، اس کا اپنا فارم ہاؤس بھی ہے، وہ بتا رہا  
 تھا کہ جب وہ لوگ ایک پارٹی میں گئے تو وہاں کچھ لوگ ڈرنک پر یہ باتیں کر رہے تھے  
 کہ.....“ بلی کی بات جاری تھی کہ لائن کٹ گئی، چونکہ مجھے پوری بات سمجھ آ گئی تھی اس لئے  
 میں نے دوبارہ کال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ابھی میں یہ دونوں افواہیں ٹھیک سے ہضم نہیں کر پایا تھا کہ راجو بلی کی آدھکا، نجانے  
 کیوں اسے دیکھتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ بھی کسی افواہ سے ہی ”مسلم“ ہوگا

## افواہیں

”تمہیں کچھ پتا چلا کہ کیا ہونے والا ہے؟“ میرے دوست نے پراسرار سے لہجے میں سرگوشی  
 کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... کیا ہونے والا ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”سنا ہے دو مہینوں کے اندر اندر ڈالر 150 روپے کا ہو جائے گا!!!“ میرے دوست نے اسی  
 سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”تمہیں کس نے بتایا ہے..... میرا مطلب ہے کہ تمہیں کیسے پتا ہے؟“ میں نے اسے گھورا۔  
 ”اس میں بتانے والی کیا بات ہے..... سب کہہ رہے ہیں۔“ اس نے لا پرواہی سے جواب  
 دیا۔

”پھر بھی، بتاؤ تو سہی کہ تمہارا سورس آف انفورمیشن کیا ہے؟“ میں نے دلچسپی لینے کے سے  
 انداز میں پوچھا۔

”کوئی ایک سورس ہو تو بتاؤں، صبح کے بے شمار لوگ مجھ سے مل کر یہی بات کر چکے ہیں۔“ اس  
 نے پراعتدالہجے میں کہا۔

”مثلاً..... کسی ایک کی مثال دو۔“

”مثال.....؟ ہوں.....!!!“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا سر کھجایا اور پھر یکا یک چٹکی  
 بجاتے ہوئے بولا ”تمہارا اپنا چڑاسی بھی یہی کہہ رہا تھا، بے شک ابھی بلا کر پوچھ لو۔“

”لاحول ولا..... یعنی تم محض ایک چڑاسی کے پیچھے لگ کر یہ افواہ پھیلا رہے ہو کہ ڈالر

توجہ نہ دیتا لیکن جب میں نے ایک غیر ملکی خبر رساں ادارے پر اس بارے میں ایک نیوز رپورٹ دیکھی تو اس پر یقین کرنا ہی پڑا۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ زمبابوے کے مرکزی بینک نے اپنے کرنسی نوٹوں پر سے 10 صفر ہٹا کر دس بلین ڈالر کے نوٹ کو ایک ڈالر کے برابر کر دیا ہے تاکہ لوگوں کو ”نوٹ“ گننے میں دشواری نہ ہو۔

اس بات سے قطع نظر کہ کوئی بات کس قدر حیرت انگیز اور ناقابل یقین ہے، ہم لوگ اس پر ایمان لانے میں بالکل نہیں ہچکچاتے اور بغیر کسی تحقیق کے اسے نہ صرف مان لیتے ہیں بلکہ اپنی حیثیت، خواہش اور مرضی کے مطابق اس میں ”پلس مائنس“ کر کے فی سبیل اللہ آگے تقسیم کر دیتے ہیں۔ مثلاً ڈالر کے ریٹ کو ہی لے لیں، میرے جس دوست نے یہ افواہ پھیلانی ہے اس کا کاروبار اس نوعیت کا ہے کہ اسے غیر ممالک سے ایمینس آتی ہیں اس لئے وہ دن بدن ڈالر مہنگا ہونے پر خوش ہے۔ ویسے اس کی خوش فہمی اپنی جگہ لیکن اب تو مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے ڈالر واقعی 150 روپے کا ہو جائے گا، آخر دوسیا نے غلط بات کیسے کر سکتے ہیں، ایک میرا دوست اور دوسرا میرا چچر اسی!!!

(11 ستمبر 2008ء)

اور میرا خیال صحیح نکلا، وہ چھوٹے ہی بولا ”سرجی! آپ نے وہ گانا دیکھا ہے..... کانٹا لگا!!!“ ”ہاں دیکھا ہے..... اور بائی دی وے..... میں نے ہی نہیں بلکہ اس ملک کے ہر ”صالح“ نوجوان نے وہ گانا ضرور دیکھا ہوگا، لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے اسے گھور کر کہا۔ ”سرجی! اس گانے میں جو ہیروئن تھی ناں..... وہ مر گئی ہے!!!“ راجو بلیکی نے بالآخر اپنے حصے کی بریکنگ نیوز سنا دی۔ قریب تھا کہ میں یہ خبر سننے کے بعد ”اناللہ“ پڑھتا، میرے ذہن میں اس خبر کے راوی کے بارے میں بھی کچھ شک پیدا ہو گیا ”یہ بتاؤ کہ تمہیں اس عقیقہ کے مرنے کی اطلاع کس نے دی ہے؟“

”عقیقہ نہیں سرجی، اللہ بخشنے، اسے تو ڈی بے doll کہتے تھے، ہائے بے چاری.....“ راجو نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”اور سرجی! مجھے بھلا اس کی فوتیگی کی اطلاع کس نے دینی ہے، میں کوئی اس کے مامے کا پتا تو نہیں تھا؟“ ”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں اس کے مرنے کا کیسے پتہ چلا؟“ میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”وہ جی اپنا محلے دار ہے ناں..... منا..... وہ جو حکیم صاحب کی دکان پر کام کرتا ہے..... اس نے بتایا ہے کہ محلے کے جوڑے کے شام کو اس کے تھڑے پر تاش کھیلنے آتے ہیں، انہوں نے کسی سے سنا تھا کہ.....“ راجو کی بات ابھی جاری تھی کہ میں نے اسے کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کر دیا اور میرے تیور دیکھتے ہوئے راجو چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

ایک ہی دن میں تین ”خبر نما افواہیں“ سننے کے بعد میں سوچنے لگا کہ من حیث القوم افواہیں پھیلانے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں لیکن جیسا کہ مشتاق احمد یوسفی صاحب نے کہا تھا کہ ”ہماری ہر افواہ کی خرابی یہ ہے کہ بد قسمتی سے وہ سچ نکلتی ہے۔“ اسی طرح دلچسپ بات یہ ہے کہ کچھ خبریں بھی ایسی ہوتی ہیں جو پہلی نظر میں افواہ لگتی ہیں لیکن ہوتی سچ ہیں، مثلاً آج کل زمبابوے میں ڈبل روٹی کی قیمت (تادم تحریر) تقریباً 600 بلین زمبابوین ڈالر ہے۔ ”تادم تحریر“ لکھنے کی نوبت اس لئے پیش آئی کیونکہ زمبابوے میں حکومت کے مطابق افراط زر کی شرح 20 لاکھ فیصد ہے جبکہ اصل میں یہ شرح 90 لاکھ فیصد ہے یعنی اس کالم کی اشاعت تک زمبابوے میں ڈبل روٹی کا ریٹ 1200 بلین زمبابوین ڈالر سے بھی تجاوز کر سکتا ہے۔ اگر کوئی اور مجھے یہ خبر سنا تا تو شاید میں اسے بھی ایک افواہ سمجھ کر اس پر کوئی خاص

اسے خوش اخلاقی سے ٹرخا دیجیے۔ اس کے تین فائدے ہوں گے، اول، آپ کی خوش اخلاقی کا ڈنکا چار دانگ عالم بچ جائے گا، دوم، محض وعدے کے بل بوتے پر ہی آپ اپنے مخالف سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکیں گے اور سوم، آپ کو کسی بھی ٹوٹھ پیسٹ کے اشتہار میں بطور ماڈل کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ رہی بات reputation یا ساکھ کی جس کے بارے میں کسی بے وقوف کا قول ہے کہ ”ساکھ، ایک کنواری لڑکی کی عزت کی مانند ہوتی ہے جو ایک دفعہ چلی جائے تو پھر واپس نہیں آتی“، تو اس ضمن میں عرض ہے کہ ساری عمر کنوارہ رہنے کا کسی کو شوق نہیں ہوتا لہذا ایسی باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کریں اور سختی سے اس اصول پر کاربند رہیں ”وعدہ کر، دریا میں ڈال“!!! (مشق) روزانہ صبح اٹھ کر نہار منہ اپنے آپ سے تین جعلی قسم کے وعدے کریں اور پھر شام کو کھانے کے بعد ان وعدوں کو توڑنے کے بہانے بنائیں، مثلاً آپ کا وعدہ تھا کہ آج آپ اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکالیں گے تو شام کو آپ کا موقف یہ ہو سکتا ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا، لہذا فوری طور پر یہ کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یا یہ کہ آپ ”ڈیڈ لائن“ پر یقین نہیں رکھتے، اس لئے آج زکوٰۃ نہیں نکالیں گے یا پھر یہ کہ آپ پر سرے سے زکوٰۃ لاگو ہی نہیں ہوتی، اللہ اللہ خیر صلہ!!!

(2) بندر بانٹ: اکیلے کھانے کی بجائے مل بانٹ کر کھائیں، یہ ہے کامیابی کا دوسرا اصول جسے ہم نے بندر بانٹ کا نام دیا ہے۔ اس اصول کو سمجھنے کے لئے اتنا سمجھنا ہی کافی ہے کہ اپنی کامیابی کے سفر کے دوران آپ جو بھی مال بنائیں اس کا کچھ حصہ ان ”مستحقین“ میں بھی بانٹ دیں جنہوں نے وہ مال بنانے میں آپ کا ساتھ دیا، اس سے آپ کے مال میں برکت پڑے گی اور اضافہ ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ کسی با اثر مقام پر فائز ہو جاتے ہیں تو بھی اس اصول کو نہ بھولیں اور ہمیشہ بندر بانٹ سے کام لیں۔ (مشق) مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ اپنے ارد گرد کے بندروں کو اکٹھا کریں اور ان میں روٹیاں بانٹیں اور پھر خدا کی قدرت دیکھیں، جو بندر ایک سے زیادہ روٹی مانگیں، انہیں اپنی روایتی خوش اخلاقی سے ہی ٹرخائیں اور جو بندر روٹی لینے پر راضی نہ ہوں انہیں ڈرا دھمکا کر روٹی کھانے پر مجبور کریں۔

(3) اپنی پسند کا سچ بولیں: تیسرا اصول یہ ہے کہ ہمیشہ سچ بولیں لیکن صرف اس وقت جب اس سچ کا فائدہ آپ کو پہنچ سکتا ہو یعنی اپنی مرضی کے مطابق اور اپنی پسند کا سچ بولیں۔ دوسرے تمام موقعوں پر بے ٹکان جھوٹ بولیں اور اس مثل سے بالکل نہ گھبرائیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں

## کامیابی کے سات اصول

میں جب بھی کتابوں کی کسی دکان میں جاتا ہوں تو اس حصے پر نظر ضرور ڈالتا ہوں جہاں ”سیلف ہیلپ“ سے متعلق کتابیں رکھی ہوتی ہیں، اس کی وجہ ان کتابوں کے پرکشش نام ہیں جو آپ کو خواہ وہ اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں جیسے ”لامحدود طاقت“، ”جیسے خیالات، ویسی زندگی“، سوچئے اور امیر ہو جائیے“ یا پھر ”انتہائی با اثر لوگوں کی سات عادتیں“!!! دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کی بیشتر کتابوں پر ”بیسٹ سیلر“ لکھا ہوتا ہے جس کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آ سکی کیونکہ ان میں سے کوئی نیویارک ٹائمز کی بیسٹ سیلر ہوتی ہے اور کوئی واشنگٹن پوسٹ کی، کوئی امیزون کی ویب سائٹ کے مطابق سرفہرست ہے اور کسی کے سال بھر میں اتنے ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں کہ شاید اب دنیا کی پڑھی لکھی آبادی میں سے فقط آپ ہی بچے ہیں جس نے یہ کتاب نہیں خریدی۔ ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے بھی ایسی چند کتابیں خرید کر پڑھ ڈالی ہیں لیکن پڑھنے کے بعد مجھ پر آشکار ہوا کہ کامیابی کے جو نسخے ان کتابوں میں درج ہیں وہ امریکہ یا یورپ وغیرہ میں تو شاید چل جاتے ہوں لیکن وطن عزیز میں کامیابی حاصل کرنے کے کچھ اور ہی طریقے ہیں جن کا ان کتابوں میں دور دور تک ذکر نہیں ہے لہذا آج میں نے ایسے چند طریقے ”نسخہ کیمیا“ کے طور پر یہاں درج کر دیئے ہیں تاکہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

(1) وعدہ کر، دریا میں ڈال: یہ ہے کامیابی کا پہلا اصول، ہر کسی سے بے فکر ہو کر بڑے سے بڑا وعدہ کیجیے لیکن جب اسے پورا کرنے کا وقت آئے تو محض دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے



پڑے گی لہذا ایسے موقعوں پر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا اور صرف یہ سوچنا ہے کہ آپ کی گفتگو بھی لوگ ایسے ہی صبر و تحمل سے سنتے ہوں گے۔ (مشق) دن میں تین دفعہ روزانہ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر غرارے کریں، اس سے گلا صاف ہوگا اور گفتگو کرنے میں آسانی ہوگی۔

6) اپنے چھریاں چاقو تیز رکھیں: امریکی کتابوں میں اس اصول کو Sharpen the Saw کہا جاتا ہے لیکن یہاں اس سے مراد وہی ہے جو آپ سمجھیں ہیں یعنی ”مرغا“ پھانسیں اور پھر اسے حلال کرنے کے لئے اپنی چاقو چھریاں تیز رکھیں۔ آپ کے ارد گرد بے شمار ”مرغے“ پھر رہے ہیں جنہیں حلال کر کے آپ اصول نمبر چار کے تحت اپنا بینک اکاؤنٹ بھر سکتے ہیں لہذا ایسا کوئی بھی موقع محض اس وجہ سے ہاتھ سے نہ جانے دیں کہ آپ کی چاقو چھریاں تیز نہیں ہیں۔ (مشق) مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ کسی پٹھان سے اپنی تمام چاقو چھریاں ضرور تیز کروالیں، ”مرغا“ پھانستے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ وہ اذان دینے والا مرغا نہ ہو ورنہ لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں!!!

7) شادی: کامیابی کا ساتواں اور سب سے سنہری اصول ہے کسی با اثر خاندان میں شادی کرنا۔ سچ بات تو یہ ہے اگر اسی ایک اصول پر ہی عمل کر لیا جائے تو باقی کے چھ اصولوں کی ضرورت نہیں رہتی تاہم یہ اتنا آسان کام نہیں لیکن فی زمانہ سب سے ”شارٹ کٹ“ اور موثر ترین فارمولہ ضرور ہے۔ جو لوگ اس اصول پر عمل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی آخرت کا تو نہیں پتا البتہ ان کی دنیا ضرور سنور جاتی ہے۔ (مشق) اونچے اونچے خاندانوں میں شادی کی درخواستیں جمع کروادیں اور اس ضمن میں چودھری اور مراٹھی والے اس لطیفہ کی پرواہ نہ کریں جس میں مراٹھی، چودھری کی بیٹی کا رشتہ مانگتا ہے اور پھر چودھری کے ہاتھوں بیٹے کے بعد کہتا ہے کہ ”چودھری صاحب! پھر میں آپ کی طرف سے انکار ہی سمجھوں۔“ اللہ بڑا بے نیاز ہے، وہ کبھی کبھی مراٹھی کی بھی سن لیتا ہے!!!

(17 ستمبر 2008ء)

ہوتے کیونکہ آج تک کسی نے سچ کے پاؤں بھی نہیں دیکھے!!! اپنی پسند کا سچ بولنے کا سب سے بڑا فائدہ آپ کی ذات کو ہوگا اور لوگ آپ کی باتوں پر یقین کرنا شروع کر دیں گے کیونکہ جن لوگوں کو آپ نے بندر بانٹ کے ذریعے اپنے زیر اثر رکھا ہوگا وہ آپ کے جھوٹ کی گواہی بھی ایسے دیں گے جیسے سچ کی دی جاتی ہے لہذا ”ستے ای خیراں“ تاہم بے تکان جھوٹ بولنے سے پہلے اپنے مد مقابل کا جائزہ لے لیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے آپ کے بارے میں کچھ اس نوعیت کا سچ بول دے جو آپ کا پول ہی کھول دے۔ (مشق) جھوٹ بولنے کی پریکٹس سب سے پہلے اپنی ذات کے حوالے سے شروع کریں یعنی روزانہ اپنے بارے میں اس قسم کے فقرے بولیں کہ میں ایک بہادر آدمی ہوں، میں بے غیرت نہیں ہوں، میں کسی سے نہیں ڈرتا، میں ایک طلسماتی شخصیت کا مالک ہوں وغیرہ وغیرہ۔ چند دنوں بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی بے غیرتی تو کم نہیں ہوئی تاہم جھوٹ بولنے کی پریکٹس ضرور ہوگئی ہے۔

4) جذباتی بینک اکاؤنٹ نہیں ذاتی بینک اکاؤنٹ بھریں: کامیابی کا راز بتانے والی کتابیں لکھنے والوں کا خیال ہے کہ زندگی میں جذباتی بینک اکاؤنٹ بہت اہمیت رکھتا ہے جسے وہ EBA یعنی Emotional Bank Account بھی کہتے ہیں۔ اس قسم کی خرافات کے چکر میں بالکل نہ آئیں اور ہمیشہ اپنا ذاتی بینک اکاؤنٹ بھرنے پر توجہ دیں اور یہ کام ایک ہاتھ سے اس صفائی کے ساتھ کریں کہ دوسرے ہاتھ کو پتا نہ چل سکے۔ بعض مفسدین نے ایسے کاموں کے لئے White Collar Crime کی اصطلاح ایجاد کی ہے لہذا سفید کالر کی قمیض پہننے سے اجتناب کریں!!! (مشق) غیر ممالک میں ”بے نامی“ اکاؤنٹ کھولنے کے لئے فارم بھرنے کی پریکٹس کریں!!!

5) تمسخرانہ انداز گفتگو: اساتذہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے گفتگو کے فن میں مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے تاہم جس لطیف نکتے کو اساتذہ نے نظر انداز کیا ہے وہ یہ ہے کہ موقع کی مناسبت سے انداز گفتگو تمسخرانہ ہونا چاہیے، دوسرے الفاظ میں یہ کہ آپ کی گفتگو زچ کر دینے والی ہو جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ آپ بہت چالاک اور مد مقابل نہایت گاؤدی ہے۔ تاہم یہ انداز گفتگو ہر موقع کے لئے موزوں نہیں ہے، کچھ مقامات ایسے بھی ہوں گے جہاں الٹا آپ کو اپنے سے زیادہ با اثر شخص کی بے ہودہ گفتگو سننا

کوشش کی مگر اندھیرے کی وجہ سے وہ جان نہیں پایا کہ لڑکا اس کی دلیل سے مطمئن ہوا یا نہیں؟ چند منٹ تک سفر یونہی جاری رہا اور پھر نوجوان نے ٹرک کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے اسے ٹرک کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل کے ساتھ روک دیا۔

”چلو، کچھ کھا لو“ نوجوان ٹرک سے اترتا ہوا بولا ”آدھ گھنٹے بعد ہم یہاں سے چلیں گے۔“  
”لیکن اب میرا کچھ کھانے کو دل نہیں کر رہا۔“ لڑکے نے ٹرک میں بیٹھے بیٹھے جواب دیا، اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”کیوں.....؟؟؟ اوہ! میں سمجھ گیا، تمہیں جنت میں من و سلویٰ ملنے والا ہے اس لئے یہ دنیاوی کھانے اب تمہیں نہیں بھائیں گے!!!“ نوجوان نے اپنے لہجے کو پر جوش بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”شاید یہی بات ہے۔“ لڑکے نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا، شام ڈھلنے والی تھی اور آسمان کا رنگ سورج کی کم ہوتی ہوئی روشنی کی وجہ سے سرخی مائل ہو گیا تھا، لیکن وہ دونوں ہی اس نظارے سے بے نیاز اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ ان کے خیالوں کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ایک پولیس چیک پوسٹ سے انہیں رکنے کا اشارہ کیا گیا۔ نوجوان نے پرسکون انداز میں بریک لگائی اور اپنے ساتھی لڑکے کو خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹرک سے نیچے اتر گیا۔

”کیوں بھیجی جوان..... کیا ہے اس میں؟؟“ ایک پولیس والے نے اپنی چھڑی ٹرک کے پچھلے حصے پر مارتے ہوئے کہا۔

”کچھ خاص نہیں جناب..... صرف فروٹ ہے تھوڑا سا۔“ نوجوان نے اپنے لہجے کو فندیانہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”تھوڑا تو نہیں..... مجھے تو ہزار بارہ سو کلو لگ رہا ہے، وزن کروایا ہے اس کا؟“ پولیس والے نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل کروایا ہے جناب..... یہ دیکھیں رسید۔“ نوجوان نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار کے پانچ نوٹ ایک پرچی کے ساتھ نکال کر پولیس والے کے ہاتھ میں دبا دیے۔

”اچھا اچھا، ٹھیک ہے“ پولیس والے نے جلدی سے نوٹ اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے آواز لگائی ”جانے دو بھیجی اسے۔“

## Mission Accomplished!!!

نوجوان کو ٹرک ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل چار گھنٹے ہو گئے تھے مگر اس کے چہرے پر ابھی تک تھکن کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے، اس کا انداز بے حد پرسکون تھا اور اس کی تمام تر توجہ ونڈسکرین کی جانب تھی، تاہم اس کے ساتھی کے چہرے سے بے چینی مترشح تھی اور وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ نوجوان کے چہرے پر داڑھی تھی جبکہ اس کا ساتھی جو نسبتاً کم عمر لڑکا تھا، کلین شیو تھا۔ وہ دونوں کافی دیر سے خاموش تھے اور ٹرک میں صرف انجن کی آواز گونج رہی تھی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ بالآخر کسن لڑکے نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

”ہوں!“ نوجوان کھڑکتا ہوا بولا ”آگے ایک ہوٹل آنے والا ہے، میں وہاں ٹرک روکوں گا، تم کچھ کھا لینا۔“ اس مختصر سی گفتگو کے بعد ٹرک میں ایک دفعہ پھر خاموشی چھا گئی۔

”ہم شہر کتنی دیر میں پہنچیں گے؟“ لڑکے نے ایک دفعہ پھر سوال کیا۔

”تقریباً اتنا ہی سفر ابھی مزید باقی ہے۔“ نوجوان نے ایک نظر اپنی گھڑی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیا وہاں ہمارے اور بھی ساتھی ہوں گے؟“ لڑکے نے اپنی بے چینی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اس بات کی فکر نہیں ہونی چاہیے، تم صرف خدا کو یاد کرو اور یہ سوچو کہ تمہارے لئے صرف خدا ہی کافی ہے۔“ یہ کہہ کر نوجوان نے لڑکے کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی

”لیکن وہاں مسلمان بھی تو ہوں گے، ان کا کیا ہوگا؟؟“ لڑکے نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”تم ان کی فکر نہ کرو، وہ بھی خدا کی راہ کے شہید کہلائیں گے“، نوجوان نے جواب دیا ”اب مزید سوال مت کرنا ورنہ جہاد کے ثواب میں کمی ہو جائے گی اور خدا کو یہ بالکل پسند نہیں کہ نیکی کا کام کرتے وقت انسان کا دماغ شیطان کے ورغلانے میں آجائے۔“ نوجوان نے گویا اپنی طرف سے تابوت میں آخری کیل ٹھونکا، لڑکا خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹرک شہر کی حدود میں داخل ہو گیا، راستے میں کسی نے بھی ان کی چیکنگ نہیں کی اور وہ بلا روک ٹوک اس ہوٹل کے قریب پہنچ گئے جہاں انہیں حملہ کرنا تھا۔ نوجوان نے ہوٹل سے ذرا فاصلے پر ٹرک روکا، لڑکے کو اپنی جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر نیچے اترا اور پھر لڑکے پر ایک الوداعی سی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا ”میرا کام ختم ہو گیا، یہاں سے تمہارا کام شروع ہوتا ہے، جاؤ اور شہید ہو کر اپنی جنت کمالو، خدا نے آج تمہارے مقدر میں جنت لکھ دی ہے!!!“

لڑکے نے یہ سنتے ہی ٹرک کو ریس دی اور تیزی سے ہوٹل کی جانب بڑھ گیا جبکہ نوجوان نے مخالف سمت میں بھاگنا شروع کر دیا، کچھ دور پہنچ کر نوجوان نے پلٹ کر ٹرک کی طرف دیکھا جواب بالکل ہوٹل کے انٹری گیٹ کے پاس رک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی نوجوان نے تیزی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ریموٹ کنٹرول نما آلہ نکال کر اس کا بٹن دبا دیا۔ ٹرک میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور پھر ہر طرف قیامت برپا ہو گئی۔ نوجوان نے ایک گہرا سانس لے کر ریموٹ کنٹرول واپس اپنی جیب میں ڈالا اور اپنا موبائل فون نکال کر تیزی سے کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف رابطہ ملتے ہی نوجوان نے غیر ملکی لہجے کی انگریزی میں کسی کو مبارکبادی اور کہا ”Congrats! Mission accomplished!!!“

(29 ستمبر 2008ء)

تھوڑی دیر بعد ٹرک اسی طرح اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا لیکن اس دفعہ نوجوان اسے نسبتاً تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا تاہم اس کے چہرے پر کسی قسم کی کوئی بے چینی نہیں تھی۔ اس کے برعکس اس کا ہمسفر کمسن لڑکا اب بھی کافی ”ٹینس“ لگ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا منہ پیچھے کی طرف لے جاتا جیسے کچھ نکلنے کی کوشش کر رہا ہو اور پھر اپنا سر جھٹک دیتا۔ اچانک اس نے اپنے ساتھی نوجوان کو ٹرک روکنے کا اشارہ کیا اور پھر ایک دم سے دروازہ کھول کر اپنا منہ باہر کی طرف کیا اور قے کر دی۔ نوجوان ڈرائیور نے ٹرک روک دیا۔ کچھ دیر تک ٹرک میں خاموشی چھائی رہی، پھر نوجوان نے سکوت توڑا:

”شاید تم ڈر گئے ہو؟“

”نہیں..... نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ لڑکے نے اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”تمہیں علم ہونا چاہیے کہ ہمارے مشن میں خوف کی کوئی گنجائش نہیں، خوف ہمارا دشمن ہے..... اور پھر تمہیں کسی سے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے، تم تو شہید ہونے جا رہے ہو..... اور شہید کبھی مرتا نہیں، ہمیشہ زندہ رہتا ہے..... تم بھی نہیں مرو گے بلکہ یہاں سے سیدھے جنت میں جاؤ گے جہاں انواع و اقسام کی نعمتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں..... لیکن یاد رکھنا اگر تم اپنے مشن میں ناکام ہو گئے تو کمانڈر بھی تمہیں معاف نہیں کریں گے اور خدا کے حضور بھی تمہیں کوئی معافی نہیں ملے گی، کیا تم یہ سب بھول گئے؟؟؟“ نوجوان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گویا ایک مختصر تقریر جھاڑ دی۔

لڑکے کی آنکھیں بند تھیں، اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا اور اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ نوجوان کو اس کی کیفیت کا بخوبی اندازہ تھا کیونکہ یہ اس کا پہلا تجربہ نہیں تھا، یوں لگتا تھا جیسے نوجوان اس سے پہلے بھی اس قسم کے کمسن لڑکوں کو ”ڈیل“ کر چکا ہو۔ تھوڑی دیر بعد لڑکے نے آنکھیں کھولیں اور ماتھے سے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا ”میں کچھ نہیں بھولا، مجھے سب یاد ہے۔“

”شاباش..... اور تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے خلاف تم جہاد کرنے نکلے ہو وہ یا تو کافر ہیں یا پھر کافروں کے آلہ کار، لہذا انہیں جہنم رسید کرنا ہی ہمارا اصل مشن ہے۔“  
 نوجوان نے اپنی بات جاری رکھی ”اسی لئے کمانڈر نے اس دفعہ جہاد کے لئے اس ہوٹل کو ٹارگٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جہاں کافروں کی بڑی تعداد موجود ہوگی۔“

پانچ لاکھ کا گھانا ہوا ہے، اس لئے آج کا دن میرے لئے بہت برا تھا۔“  
اسی طرح خواتین بھی اکثر شکایت کرتی ہیں کہ ان کا دن اچھا نہیں گزرا، وجہ پوچھو تو بتاتی ہیں کہ انہوں نے اپنے بالوں کو جوکڑ کر دیا تھا اس کا شیڈ ٹھیک نہیں آیا یا پھر جو مہنگا سا سوٹ وہ پارٹی میں پہن کر گئیں تھیں، اس کی کسی نے تعریف نہیں کی بلکہ الٹا ایک دو نے یہ کہہ دیا کہ وہ اس میں موٹی لگ رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وجوہات کسی بھی خاتون کا دن خراب کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اس قسم کے تمام لوگوں کے لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنے دن کو خراب کہنے کی بجائے کچھ ایسی situations کو ذہن میں لانے کی کوشش کریں جو حقیقتاً ہی بری بلکہ بہت بری ہوں، پھر انہیں اندازہ ہوگا کہ آیا ان کا دن واقعی خراب تھا یا وہ محض فیشن یا عادت کے طور پر یہ بات کرتے ہیں۔ میں نے ایسی کچھ situations یہاں اکٹھی کی ہیں:

فرض کریں کہ آپ ایک خاتون خانہ ہیں اور آپ اپنے خاوند کو ڈھونڈتی ہوئی کچن میں آتی ہیں، وہاں آپ ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھتی ہیں، آپ کے خاوند کی کمر کے گرد ایک برقی تار لپٹی ہوئی ہے جس کا ایک سرانجلی سے چلنے والے ”ٹوسٹر“ کی طرف ہے اور آپ کا خاوند آنکھیں بند کئے تقریباً ہسٹریائی انداز میں اچھل رہا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر آپ حواس باختہ ہو جاتی ہیں اور اپنے خاوند کو بجلی کے جھٹکے سے بچانے کے لئے فوراً دوسرے کمرے سے کرکٹ بیٹ لاکر اس برقی تار کو مارنے کی کوشش کرتی ہیں جو سیدھا آپ کے خاوند کو لگتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے بازو کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں، بعد میں آپ کو پتہ چلتا ہے کہ وہ بیچارہ تو محض ”واک مین“ پر ابرار کا گانا سن رہا تھا!!! کیا آپ اب بھی سمجھتے ہیں کہ آپ کا دن اس خاتون خانہ اور اس کے مسکین خاوند سے زیادہ برا گزرا تھا؟

اب فرض کریں کہ آپ پنجاب میں ایک سرکاری ہسپتال کے میڈیکل سپرینٹنڈنٹ (ایم۔ایس) ہیں اور ایک وی۔آئی۔پی شخصیت، جو دل کے عارضے میں مبتلا ہے، آپ کے ہسپتال کے کارڈیالوجی وارڈ میں داخل ہے۔ آپ کے ہسپتال کا انتظام و انصرام، سفائی ستھرائی مثالی ہے اور آپ نے اس وی۔آئی۔پی کے علاج میں ذاتی دلچسپی لے کر اس کی صحت بھی بہتر کر دی ہے کہ اچانک ایک صبح پتہ چلتا ہے کہ اس وی۔آئی۔پی کا انتقال ہو گیا ہے۔ تحقیق کرنے پر مزید پتہ چلتا ہے کہ حال ہی میں رکھا گیا ایک پارٹ ٹائم خاں کروب

## ”کیا آپ کا دن بُرا گزرا تھا؟“

آپ کا کل کا دن کیسا گزرا تھا..... اچھا یا برا؟ اگر اچھا گزرا تھا تو آپ نہایت خوش قسمت انسان ہیں اور اگر برا گزرا تھا تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ آپ کس وجہ سے اپنے دن کو برا سمجھتے ہیں؟ اس ضمن میں عموماً جو وجوہات سامنے آتی ہیں وہ کچھ اس قسم کی ہوتی ہیں..... دفتر میں باس کا ڈانٹ پلانا، بیوی یا گرل فرینڈ (whichever is applicable) کی ناراضی، دوست سے جھگڑا، کاروبار میں گھانا یا اسی قسم کی کوئی اور چھوٹی موٹی وجہ۔ ان باتوں کو لے کر ہمارا موڈ سارا دن خراب رہتا ہے اور پھر رات تک ہم ہر کسی کو یہی کہتے پھرتے ہیں کہ ”آج کا دن بہت برا تھا۔“ چند دن پہلے میری ملاقات برائنڈر تھر روڈ کے ایک تاجر سے ہوئی، چھوٹے ہی موصوف اپنا رونا رونے لگے، میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ ”آج کا دن بہت برا تھا، آج مجھے پانچ لاکھ کا نقصان ہو گیا۔“ وہ کیسے؟ میں نے تفصیل جاننی چاہی۔

”وہ ایسے کہ آج میں نے جو مال بیس لاکھ کا بیچنا تھا وہ صرف پندرہ لاکھ میں بکا۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔

”اور تمہاری اس مال کی خرید کتنی میں تھی؟ میں نے پوچھا۔

”یہی کوئی بارہ لاکھ کی۔“

”اس حساب سے تو پھر بھی تمہیں تین لاکھ کا منافع ہو گیا، اب رونا کس بات کا ہے؟“

”یہ منافع تمہارے حساب سے ہوا ہوگا“ اس تاجر نے بھنا کر جواب دیا ”میرے حساب سے

کرنے والے وہ دو کارکن سوؤروں کے پیروں تلے روندے گئے اور ہلاک ہو گئے!!! کیا خیال ہے..... کیا آپ کا دن ان سے بھی زیادہ برا گزرا تھا؟ (یہاں ”ان“ سے مراد سوؤر نہیں بلکہ وہ دو کارکن ہیں!!!)

اور اب ایک آخری مثال..... ایک فائینسٹار ہوٹل میں خود کش دھماکہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ساٹھ سے زائد افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہو جاتے ہیں، ہلاک ہونے والوں میں بڑی تعداد اس ہوٹل میں کام کرنے والے غریب سیکورٹی گارڈز، دربان، مالی اور ڈرائیور وغیرہ کی ہے۔ ان میں وہ سیکورٹی گارڈز بھی شامل ہیں جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر خود کش حملہ آور کو ہوٹل کے اندر آنے سے روکا اور سینکڑوں قیمتی جانیں بچالیں لیکن (بی بی سی کے مطابق) آج کئی دن گزرنے کے بعد اور مختلف دعوؤں کے باوجود ان میں سے کسی کو بھی ایک پیسے کی مالی امداد نہیں مل سکی جبکہ دوسری طرف ہوٹل کے مالک نے حکومت کو ”تزی“ لگائی ہے کہ اگر اسے ہوٹل کے پیچھے واقع پلاٹ نہ دیا گیا تو وہ اپنا ہوٹل نہیں کھولے گا۔ واضح رہے کہ سی۔ ڈی۔ اے کے مطابق اس پلاٹ کی کم از کم قیمت تین ارب روپے ہے!!!

کیا آپ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا دن ان سیکورٹی گارڈز اور ان کے بیوی بچوں سے بھی زیادہ برا گزرا تھا؟

(11 اکتوبر 2008ء)

جب اس وارڈ کی صفائی کرنے پہنچا تو اس نے زندگی بچانے والے سسٹم کا پلگ نکال کر اس کی جگہ اپنے ویکيوم کلیز کا پلگ لگا دیا تاکہ اچھی طرح سے وارڈ کی صفائی کر سکے، نتیجتاً ایم۔ ایس صاحب کو معطل کر دیا گیا!!! کیا آپ اب بھی سمجھتے ہیں کہ آپ کا دن اس ایم۔ ایس سے زیادہ برا گزرا تھا؟

اچھا فرض کریں کہ ایک امریکی ماں اپنی بیٹی کو جگانے اس کی خواب گاہ میں آتی ہے، وہاں اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیٹی غائب ہے اور اس کے سر ہانے ایک خط رکھا ہے۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے خط اٹھاتی ہے اور پڑھنا شروع کرتی ہے، لکھا ہے:

”ڈیزرمام! میں یہ خط نہایت دکھ اور کرب کے عالم میں آپ کو لکھ رہی ہوں، اصل میں مجھے اپنے نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگنا پڑا کیونکہ میں آپ کا اور ڈیڈی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے ٹام میں وہ سب کچھ مل گیا ہے جس کی مجھے تلاش تھی، وہ یقیناً میرا آئیڈیل ہے، اس کے بازو پر ”ٹیو“ اور کانوں میں بالیاں اتنی بھلی لگتی ہیں کہ کیا بتاؤں!!! اور ایک اور بات..... آپ بہت جلد نانی بننے والی ہیں، ٹام یہ خبر سن کر بہت خوش ہوا، اسے بھی بچے بہت اچھے لگتے ہیں، اس کا کہنا ہے کہ ہم بعد میں شادی بھی کر لیں گے!!! ٹام نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ ”میری جوانا“ بالکل بھی خطرناک نشہ نہیں ہے اور ہم سوچ رہے ہیں کہ ٹام کے باقی دوستوں کے ساتھ مل کر اس کی ”کوکین“ کے ساتھ تجارت شروع کر دیں۔ بس آپ صرف یہ دعا کریں کہ سائنس کسی دن ایڈز کا علاج دریافت کر لے تاکہ ٹام کی حالت بھی سدھر جائے، یقیناً وہ اس کا مستحق ہے۔ مام، آپ بالکل پریشان نہ ہوں، میں اب پندرہ سال کی ہوں اور اپنی دیکھ بھال کرنا اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن میں آپ کے پاس واپس آؤں گی تاکہ آپ بھی اپنے نواسے نواسیوں کو دیکھ سکیں۔ فقط، آپ کی بیٹی۔“

کیا آپ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ آپ کا دن اس امریکی ماں سے زیادہ برا گزرا تھا؟ فرضی واقعات تو کافی ہو گئے اب ایک آدھ مثال حقیقی زندگی کی بھی ملاحظہ کیجئے۔ جرمنی کے شہر بون میں جانوروں کے حقوق کے لئے کام کرنے والی تنظیم کے دو کارکن سوؤروں (pigs) کے مذبح خانے کے باہر سوؤروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج کر رہے تھے، اچانک کسی وجہ سے ان سوؤروں کے گرد لگا ہوا جنگلا ٹوٹ گیا اور دو ہزار کے لگ بھگ سوؤر دندناتے ہوئے پنجرہوں سے باہر آ گئے، شدید بھگڑ مچ گئی جس کے دوران احتجاج



جائیداد رہن رکھ کر سود پر قرض لیتے ہیں اس لئے شرح سود میں کمی گئی کی قسم کے قرضہ جات کا حصول مزید آسان کر دیا (اس بات کو مزید آسان نہیں کیا جاسکتا)۔ ان اقدامات کے چند بے حد حیرت انگیز نتائج نکلے، پہلا یہ کہ رہن یا گروی والے قرضوں میں آسانی کی وجہ سے امریکہ میں مکانات کی طلب میں اضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی قیمتیں بڑھ گئیں، دوسرا یہ کہ اپنی جائیداد کی بڑھتی ہوئی قیمت کا فائدہ اٹھانے کی غرض سے ان لاکھوں قرض داروں نے اپنے قرضے re-finance کروا لئے یعنی فرض کیجئے کہ اگر ایک شخص نے اپنے مکان کے عوض دس ہزار ڈالر کا قرضہ لیا تھا تو اس کے مکان کی قیمت میں ڈیڑھ گنا اضافے کے بعد بنک اسے مزید تین ہزار ڈالر دینے پر آمادہ ہو گیا، تیسرا نتیجہ یہ نکلا کہ بھیڑ چال شروع ہو گئی یعنی جب ہر کوئی اپنا قرضہ re-finance کروانے پہنچا تو گروی کے کاروبار میں نہایت تیزی آ گئی لیکن ساتھ ہی ساتھ بنکوں نے قرضوں کی شرائط اس قدر نرم کر دیں کہ ان کا کوئی معیار ہی قائم نہیں رہا اور چوتھی بات یہ کہ قرضوں کی کڑی شرائط کی غیر موجودگی میں قرضداروں نے ”ڈیفالٹ“ کرنا شروع کر دیا تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ بنکوں نے قرضے دینے پھر بھی بند نہیں کئے۔ واضح رہے کہ یہ قرضے ”عربوں“ ڈالر کے تھے!!!

اس سرمایہ دارانہ نظام کو باقاعدہ (القاعدہ نہیں) پہلا جھٹکا جون 2007ء میں لگا جب ان رہن شدہ مکانوں کی قیمتیں تیزی سے گرنی شروع ہو گئیں کیونکہ ان کے قرضدار ”ڈیفالٹ“ کر گئے تھے، اس مندی کے نتیجے میں امریکہ میں مکان کوڑیوں کے ہاؤس بکے اور کئی مکانوں کی قیمت صرف چند سو ڈالر ہی لگ سکی، کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمارے یہاں اتنے پیسوں میں بکرا عید پر محض بکروں کی ایک جوڑی ہی خریدی جاسکتی ہے!!!

قصہ یہاں ختم نہیں ہوا بلکہ اگست میں امریکی حکام کی پریشانی میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب حکومتی سرپرستی میں چلنے والے دو اداروں ”Fannie Mae“ اور ”Freddie Mac“، جو اس ہاؤسنگ کے کاروبار کے روح رواں سمجھے جاتے تھے، کے شیر شاہ مارکیٹ میں تیزی سے گرنے لگے۔ ان اداروں کے شیر زگر کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں ان قرضداروں کا ڈیفالٹ کرنا تھا جنہوں نے اپنی جائیداد کے عوض ضرورت سے زیادہ نرم قرضے لے رکھے تھے۔ یہ مندی اس قدر شدید تھی کہ بالآخر 7 ستمبر کو حکومت کو ان اداروں کو باقاعدہ اپنی تحویل میں لینا پڑا یعنی وہ سرمایہ دارانہ نظام جو فری

## ہاؤس آف کارڈز

فرض کریں کہ آپ نے اپنی عمر بھر کی جمع پونجی ایک بنک میں رکھی ہے اور وہ بنک راتوں رات دیوالیہ ہو جائے تو صبح اٹھ کر آپ کیسا محسوس کریں گے؟ یقیناً اس مفروضے کا کوئی شائبہ قسم کا جواب نہیں دیا جاسکتا تاہم یہ فرض کرنے کی نوبت اس لئے پیش آئی کیونکہ 15 ستمبر کو نیویارک سے ایک ایسی خبر آئی جس نے، ”نائن الیون“ کے بعد، ایک مرتبہ پھر پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا (نہ جانے وہاں سے ہمیشہ بری خبریں ہی کیوں آتی ہیں؟)۔ امریکہ کے تین دیوقامت مالیاتی ادارے یکے بعد دیگرے یوں بیٹھ گئے جیسے ہمارے یہاں عورتیں زچگی کے بعد اپنے سروں پر دوپٹہ باندھ کر بیٹھ جاتی ہیں!!! اس خبر کے نتیجے میں ایک ایسا ”Financial Chain Reaction“ شروع ہوا جو اب تک ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ یہ عالمی مالیاتی بحران اچانک کیوں اور کیسے شروع ہو گیا؟ کیا اس کے نتیجے میں امریکہ اور یورپ کا سرمایہ دارانہ نظام تباہ ہو جائے گا؟ (جس کی پیشن گوئیاں ایک عرصے سے ہماری مسجدوں میں کی جارہی ہیں)؟ اور اس سارے چکر کا ایک ”سیانے“ قسم کے پاکستانی پر کیا اثر پڑے گا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب تلاش کرنا بہت ضروری ہے اور نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر آج میں نے یہ جوابات تلاش نہ کئے تو تاریخ مجھے معاف نہیں کرے گی!!!

یہ 2000ء کی بات ہے جب امریکہ کی شاہ مارکیٹ میں گراوٹ کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے، اس مندی پر قابو پانے کی غرض سے امریکی فیڈرل ریزرو نے شرح سود میں نمایاں کمی کر دی تاکہ معاشی نقصان سے بچا جاسکے۔ امریکہ میں چونکہ لاکھوں لوگ

سردار کا لطیفہ یاد آ رہا ہے جسے امریکہ میں رہتے ہوئے ایڈز ہو گئی، سردار جی نے جب گھر فون کر کے یہ ”اطلاع“ اپنے باپ کو دی تو باپ نے یہ کہہ کر سردار جی کو واپس آنے سے روک دیا کہ ”پترا! اگر تو واپس آ گیا تو ایڈز بالآخر پورے (پنڈ) گاؤں میں پھیل جائے گی!!!“ واضح رہے کہ یہ اس لطیفے کا ”شوگر کوڈ ورژن“ ہے۔

اس سارے معاملے میں ایک نہایت اہم اور دلچسپ بات امریکی حکومت کا وہ ”نیل آؤٹ پیکیج“ ہے جس کا چرچا زبان زد عام ہے۔ 700 ملین ڈالر کے اس پیکیج کی مدد سے حکومت وال سٹریٹ کے مالیاتی اداروں کے وہ مشکوک قرضے خریدے گی جن کی وجہ سے یہ ساری تباہی آئی ہے۔ اس پیکیج پر تین طرح کی تنقید ہو رہی ہے، اول، امریکی ٹیکس دہندگان کا قیمتی پیسہ وال سٹریٹ کی ان کمپنیوں کی مدد کے لئے کیوں استعمال کیا جائے جو اس سارے بحران کی خود ذمہ دار ہیں؟ دوم، بیشتر امریکی قانون دان اس پیکیج کو شوشل ازم سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور سوم، ان مالیاتی اداروں کے سربراہوں کو ذمہ دار کیوں نہیں ٹھہرایا جا رہا جو تنخواہوں اور دیگر مراعات کی مد میں لاکھوں ڈالر لیتے رہے؟ ایک خبر کے مطابق ایسے ہی ایک ادارے کا سربراہ تنخواہ وغیرہ کی مد میں تقریباً 300 ملین ڈالر لے چکا ہے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو ہمارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے، پوری دنیا میں اس مالیاتی بحران کے نتیجے میں تیل اور ڈالر کی قیمتیں گری ہیں جبکہ ہمارے یہاں ڈالر 18 روپے مہنگا ہو چکا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ہمارے یہاں کے کچھ ”سیانوں“ کی بھیڑ چال کی عادت ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہماری معیشت پہلے سے ہی اس قدر زبوں حالی کا شکار تھی کہ عالمی کساد بازاری بھی ہم پر مزید اثر انداز نہ ہو سکی۔ میں نے جب یہ بات ایک مولانا کو بتائی تو وہ فرمانے لگے ”جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے“ اور میں ان کا منہ تکتے لگا!!!

سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اچھائیاں اور برائیاں آپس میں اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ انہیں الگ کرنا ممکن نہیں، اگر کسی ایک جگہ بھی کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو سارا نظام تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے لگتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ میں اسے ”ہاؤس آف کارڈز“ کہتا ہوں!!!

(18 اکتوبر 2008ء)

مارکیٹ اکانومی کا داعی تھا، ”نیشنلائزیشن“ کی پالیسی اپنانے پر مجبور ہو گیا!!!  
شروعات ہوئی ”لہمین برادرز“ سے جو 25000 ملازمین کا ایک ڈیڑھ سو سالہ پرانا اور امریکہ میں گھروں کی خرید و فروخت کا سب سے بڑا مالیاتی ادارہ تھا جس میں وال سٹریٹ کی بڑی بڑی فرموں اور افراد نے اربوں ڈالر کا سرمایہ لگا رکھا تھا۔ اس ادارے نے 15 ستمبر کی صبح دیوالیہ قانون کے تحت خود کو دیوالیہ قرار دلوانے کی درخواست دی اور پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ایسی پھیلی کہ نیویارک سے لے کر آسٹریلیا کی شااک مارکیٹوں کا ”پٹھہ“ بیٹھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی بڑی سرمایہ کار کمپنیوں نے لہمین برادرز سے اپنے اپنے معاہدے ختم کر دیئے۔ لہمین برادرز نے اپنے دیوالیہ پن کی درخواست میں کہا کہ اس پر 329 ملین ڈالر کا قرض ہے۔ اس ضمن میں سب سے دلچسپ چیز لہمین برادرز کی ویب سائٹ پر موجود اس کے دیوالیہ ہونے کی وہ پریس ریلیز ہے جس میں اس کے دیوالیہ ہونے کا اعلان ایسے کیا گیا ہے جیسے یہ بھی کمپنی کی کوئی بہت بڑی کامیابی ہو، یوں لگتا ہے جیسے یہ پریس ریلیز کسی ایسے شخص نے تیار کی ہے جو اس پہلے اپنے یہاں کے سرکاری پنڈ آؤٹ تیار کرتا تھا!!! لہمین برادرز کو اب برطانیہ کے بارکلیز بنک نے خرید لیا ہے۔

لہمین برادرز کے بعد باری آئی امریکہ کے دوسرے بڑے بنک میرل لینچ کی جسے ڈوبنے سے بچانے کے لئے بنک آف امریکہ کو 50 ارب ڈالر میں خریدنا پڑا، واضح رہے کہ میرل لینچ وہی بنک ہے جس کی قیمت ایک سال پہلے 100 ارب ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ میرل لینچ کے بعد امریکہ کے ایک بہت بڑے انشورنس کے ادارے (American International Group-AIG) نے بھی اعلان کر دیا کہ اگر اسے فوری طور پر 40 ارب ڈالر نہ ملے تو وہ بھی کنگال ہو جائے گا۔ یہاں بھی امریکی فیڈرل ریزرو اس کی مدد کو آیا اور پھر 85 ارب ڈالر کی ایک ڈیل کی گئی تاکہ AIG کو ڈوبنے سے بچایا جاسکے۔ AIG تو شاید بچ گیا مگر اس ڈیل کے نتیجے میں نیویارک شااک مارکیٹ 500 پوائنٹ بیٹھ گئی، نیویارک کی مارکیٹ بیٹھی تو یورپین مارکیٹوں میں بھی شدید مندی آ گئی، یورپ میں مندی آئی تو چین اور ایشیا بھی محفوظ نہیں رہے، ایشیائی پیٹ میں آیا تو عرب ریاستیں اور دبئی بھی نہ بچ سکے۔ ان تمام منڈیوں کی گراؤٹ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان ممالک کے کھربوں ڈالر امریکہ کی ان ڈوبتی ہوئی کمپنیوں اور نیویارک شااک آپیکھنچ میں لگے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر مجھے اس

ہوائی جہاز سروس شروع ہوئی تھی، لاہور اور گوجرانوالہ کے جن مسافروں کو کراچی جانا ہوتا، وہ پہلے پتوکی تک بذریعہ بس آتے اور پھر وہاں سے جہاز میں بیٹھ کر کراچی جاتے۔“ خان صاحب سانس لینے کے لئے رکے تو میں نے حیرت سے اپنے دوست کی طرف دیکھا جو دونوں ہاتھوں سے منہ دبائے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ خان صاحب اتنی سنجیدگی کے ساتھ بیٹھے تھے جس سنجیدگی کے ساتھ آج کل ”Reality Shows“ میں گویے نچ صاحبان نوآموز گلوکاروں کو نمبر دینے کے لئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ سگریٹ کا کش لینے کے بعد خان صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”انہی دنوں میں بھی کراچی جانے کی غرض سے جہاز میں سوار ہو گیا، اس زمانے میں کراچی تک کا ٹکٹ صرف 32 روپے کا ہوا کرتا تھا اور آج کل کی طرح جہاز میں کھانے پینے کی چیزیں سرونہیں کی جاتیں تھیں بلکہ مختلف پھیری والے جہاز میں پان، سگریٹ، چنے کی دال وغیرہ بیچا کرتے تھے۔“ میں نے ایک دفعہ پھر اپنے دوست کی طرف دیکھا جو کسی حد تک خود پر قابو پا چکا تھا، اس موقع پر اس نے بھی لقمہ دیا اور بولا ”خان صاحب بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں، تم بس ذرا غور سے ان کی بات سنو، تم نے اس سے پہلے ایسا thrilling واقعہ نہیں سنا ہوگا۔“ اب مجھے اپنے دوست کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی، میں نے دلچسپی سے خان صاحب کی طرف دیکھا جو کمال بے نیازی سے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے، میری دلچسپی دیکھتے ہوئے خان صاحب نے اپنی بات جاری رکھی ”پیرزادہ صاحب! جونہی جہاز کے اڑنے کا ٹائم ہوا، ڈرائیور نے سیلف مارا اور ایک دم سے جہاز کو اڑا کر بادلوں میں لے گیا، ابھی ہم تانڈلیا نوالہ کے اوپر ہی پہنچے تھے کہ.....“

”لیکن خان صاحب تانڈلیا نوالہ تو کراچی کے راستے میں نہیں آتا؟“ میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اوہو..... آپ سمجھے نہیں..... اس زمانے میں جہاز جگہ جگہ سے سواریاں اٹھایا کرتے تھے اسی لئے اس کا پہلا سٹاپ تانڈلیا نوالہ تھا۔“ خان صاحب نے پوری سنجیدگی اور اطمینان سے جواب دیا۔

”اچھا، اچھا..... اب میں سمجھا“ میں نے یوں سر ہلا کر کہا جیسے واقعی یہ کوئی تاریخی حقیقت ہو۔ خان صاحب کا بیان جاری رہا ”ابھی جہاز فضا میں ہی تھا کہ پٹرول ختم ہو گیا، ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے، میں نے جب یہ صورتحال دیکھی تو فوراً اپنی سیٹ سے اٹھا اور ڈرائیور کو ہٹا کر خود ”سٹیرنگ“ سنبھال لیا۔ آپ سن کر حیران ہوں گے

## Hallucination

”ان سے ملو، یہ خان صاحب ہیں، میرے بہت اچھے دوست، پراپرٹی کا کام کرتے ہیں، پچھلے سال حج کر کے آئے ہیں، شاید تمہیں یاد ہو، میں نے پہلے بھی ایک دو دفعہ ان کا ذکر کیا تھا۔“ میرے دوست نے معنی خیز انداز میں اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے پچاس سال کے ایک ”ابھرتے ہوئے بڑھے“ سے تعارف کروایا۔ میں نے خان صاحب سے ہاتھ ملایا، ان کے مصافحہ کرنے میں خاصی گرم جوشی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے دوست نے خان صاحب کا ذکر کرتے ہوئے آنکھ کیوں ماری تاہم جب خان صاحب سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

رسی طور پر حال چال پوچھنے کے بعد اچانک میرے دوست نے سوال داغا ”پیرزادہ! یار تم نے کبھی ہوائی جہاز کا سفر کیا ہے؟“ اس سے پہلے کہ میں سوال کی بلاغت پر غور کرتا، میرے دوست نے خود ہی جواب دیا ”یقیناً کیا ہو گا لیکن جس طرح کا ایڈونچر خان صاحب نے کیا ہے، ویسا تم نے کبھی سنا بھی نہیں ہوگا۔“ یہ سن کر میں نے ایک نگاہ خان صاحب کی طرف ڈالی جن کے چہرے پر سوائے طمانیت کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس موقع پر میرے دوست نے ایک دفعہ پھر مجھے آنکھ ماری اور خان صاحب کو مخاطب کر کے کہا ”خان صاحب! ذرا پیرزادہ کو اپنے پہلے ہوائی سفر کا قصہ تو سنا دیں۔“ خان صاحب نے یہ سن کر کمال بے نیازی سے سگریٹ سلگایا اور اسے بیڑی کی طرح ”ٹریٹ“ کرتے ہوئے کش لگا کر کسی داستان گو کی طرح بولنے لگے ”یہ غالباً سن 72 کا واقعہ ہے، اس زمانے میں پتوکی سے کراچی تک نئی

جیسے کسی صوفی کی طرح میں بھی معرفت کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہوں۔ اگرچہ ابھی یہ قصہ تمام نہیں ہوا تھا لیکن میری حالت کو دیکھتے ہوئے میرے دوست نے خان صاحب سے یہ کہہ کر اجازت مانگ لی کہ ہم نے آگے کہیں جانا ہے۔ ابھی ہم لوگ اٹھ ہی رہے تھے کہ اچانک خان صاحب نے تیزی سے اپنے موبائل فون سے کوئی نمبر ملایا اور کسی سے بات شروع کر دی ”ہیلو..... میں بول رہا ہوں، گوجرانوالہ سے..... ذرا میری بات کرائیں..... کیا کہا؟ اوہ اچھا اچھا..... ٹھیک ہے پھر انہیں بتا دیں کہ میرا فون تھا..... نہیں انہیں پتہ ہے، وہ خود ہی مجھے رنگ بیک کر لیں گی۔“ اتنا کہہ کر خان صاحب نے فون بند کر دیا اور گردن اکڑا کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ پوچھتے، سرگوشی کے سے انداز میں خود ہی فرمانے لگے ”اصل میں یہ فون میں نے اندرا گاندھی کو کیا تھا۔“

”کیا مطلب..... اندرا گاندھی کو تو کئی سال قبل قتل کر دیا گیا تھا۔“ میں نے خان صاحب کو گھور کر دیکھا۔

”یہی بات تو آپ لوگوں کو سمجھ نہیں آتی..... اسے محض دنیا کی نظروں میں قتل کیا گیا تھا، اصل میں وہ زندہ ہے اور پیرس کے قریب ایک گاؤں میں رہ رہی ہے..... اور اپنا بیوی پارلر چلا رہی ہے۔“ اس ”انکشاف“ کے بعد ہم میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں رہی تھی اس لئے ہم نے خان صاحب کو خدا حافظ کہا روانہ ہو گئے۔ واپسی پر ہمارا موضوع گفتگو خان صاحب کی ذات ہی تھی، میں نے جب اپنے دوست سے اس کا خیال پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ ”خان صاحب hallucination کے مریض ہیں، اس بیماری میں انسان بظاہر بالکل نارمل نظر آتا ہے جیسے کہ خان صاحب ہیں، یعنی وہ کاروبار کرتے ہیں، ڈرائیونگ کرتے ہیں وغیرہ لیکن جب وہ اس قسم کے واقعات سناتے ہیں تو اس وقت وہ ایک خیالی دنیا میں ہوتے ہیں جس کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یہ سارا قصہ جو انہوں نے ہمیں سنایا دراصل اس خیالی دنیا کی پیداوار ہے جس میں وہ کبھی کبھی چلے جاتے ہیں۔“

اپنے دوست کی بات سن کر میں چپ ہو گیا، شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن پھر میرے ذہن میں آیا کہ ایک خان صاحب پر ہی کیا موقوف، ہمارے ارد گرد تو ایسے لا تعداد لوگ ہیں جو بظاہر نارمل ہیں لیکن اصل میں hallucination کے مریض ہیں، یہ لوگ آپ کو زندگی کے اعلیٰ ترین شعبوں میں مل جائیں گے اور ملک کے مستقبل کے اہم ترین فیصلے کرتے

کہ جہاز کا ”ریزرو“ پٹرول بھی ختم ہو گیا تھا.....!!! اب تو میری بھی سٹی گم ہو گئی، میں نے فوراً کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور زمین کی طرف دیکھا، نیچے ”پیلیاں“ تھیں، میں نے فوراً جہاز ”پیلیوں“ میں اتار دیا۔ ابھی خان صاحب کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ میرا دوست دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبائے باہر نکل گیا۔ خان صاحب نے اس حرکت کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور اسی سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی ”جونہی میں نے جہاز اتارا مسافروں کی چیخیں نکل گئیں لیکن جب میں نے ان کو تسلی دی تو ان کی جان میں جان آئی۔ جہاز نیچے اتار کر میں نے ”پلگ پانا“ ہاتھ میں پکڑا اور جہاز کا انجن کھول کر چیک کیا، پتہ چلا کہ پٹرول ختم نہیں ہوا تھا بلکہ ”اوور“ ہو گیا تھا۔“ اس موقع پر تو میرا بھی دل چاہا کہ خان صاحب کا منہ چوم لوں لیکن پھر ان کی شکل دیکھ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ”لیس جی، پھر میں نے دوبارہ سٹیونگ سنبھالا اور آٹھ دس ”بگنٹے“ قسم کے مسافروں کو کہا کہ جہاز کو دھکا لگائیں، انھوں نے جہاز کو دھکا لگایا اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاز سٹارٹ ہو گیا لیکن اڑا نہیں..... پھر میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ اس کا ”فلاننگ گئیر“ کدھر ہے تو ڈرائیور نے مجھے بتانے کی بجائے خود ہی اچانک سے فلاننگ گئیر لگا دیا، پھر کیا تھا..... جہاز آسمان سے باتیں کرنے لگا۔“ خان صاحب سانس لینے کے لئے رکے تو میں نے بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا ”خان صاحب! یہ بتائیں کہ کیا اس زمانے جہازوں کے نمبر ہوا کرتے تھے؟ میرا مطلب ہے جیسے آج کل بسوں اور ویگنوں کے نمبر ہوتے ہیں۔“

”جی بالکل..... میں جس جہاز کی بات کر رہا ہوں وہ 13 نمبر جہاز تھا، اس کے علاوہ سات نمبر جہاز بدو ملہی سے نیویارک کے درمیان چلتا تھا اور 9 نمبر جہاز کا روٹ بھائی پھیرو سے فرینکفرٹ تک کا تھا۔“ خان صاحب نے پوری قطعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ قریب تھا کہ میری ہنسی کا فوارہ چھوٹ جاتا، میرے دوست نے، جو کمرے میں واپس آ چکا تھا، زور سے میرا ہاتھ دبایا اور خان صاحب سے ایک اور سوال کر دیا ”یار، خان صاحب! یہ بتاؤ کہ جب جہاز کے باہر کی لائٹ خراب ہو جاتی تھی تو پھر کیسے پتہ چلتا تھا کہ کس نمبر کا جہاز آ رہا ہے؟“

”پھر جہاز کا ڈرائیور کھڑکی کھول کر لائٹیں باہر نکال دیتا تھا اور جب ہوا سے لائٹیں کا شعلہ بجھ جاتا تو اس بجھے ہوئے شعلے کی روشنی سے پتہ چل جاتا کہ ”13“ نمبر آ رہا ہے۔“ خان صاحب نے گویا نیوٹن کے قوانین کی تشریح کر کے رکھ دی۔ اس موقع پر مجھے یوں محسوس ہوا

## یکسوئی

میں ہر کام نہایت یکسوئی کے ساتھ کرتا ہوں، کالم نگاری کو ہی لے لیجئے، جب تک میں اس کام کی پوری تیاری نہ کر لوں، تب تک کالم لکھنا شروع نہیں کرتا۔ سب سے پہلے میں اپنی کمپیوٹر ٹیبل صاف کرتا ہوں، یعنی اس پر رکھی تمام کتابیں، اخبار، رسائل وغیرہ ترتیب کے ساتھ ان کی جگہ پر رکھ دیتا ہوں۔ اس کے بعد دیگر تمام غیر ضروری اشیاء مثلاً سٹپلر، پیپر ویٹ، کامن پن، فائل کوور وغیرہ کو سمیٹ کر کسی میز کی دراز میں ڈال دیتا ہوں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر میں تسلی کے ساتھ اپنا کمپیوٹر آن کرتا ہوں جس پر میں نے کالم کمپوز کرنا ہوتا ہے۔ اسی دوران اچانک خیال آتا ہے کہ موبائل فون کو silent کر دینا چاہئے تاکہ لکھنے کے دوران اس کی گھنٹی بجنے سے کوئی تعطل پیدا نہ ہو۔ یہ سوچ کر موبائل فون اٹھاتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ اس کی بیٹری ختم ہونے والی ہے چنانچہ فون کو چارجنگ پر لگا کر ایک دفعہ پھر کمپیوٹر کے سامنے آ کر کالم ٹائپ کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔ لکھنے کے دوران مجھے چائے پینے کی عادت ہے اس لئے میں اپنے ملازم کو پہلے ہی چائے بنانے کے لئے کہہ دیتا ہوں تاکہ خیالات میں روانی پیدا ہو سکے اور محض چائے ناں ہونے کی وجہ سے ان کی رو بہک نہ جائے۔

یہ ابتدائی لیکن نہایت ضروری اقدامات کرنے کے بعد میں کالم لکھنا شروع کرتا ہوں اور سب سے پہلے دائیں طرف کونے میں ”ذرا ہٹ کے“ ٹائپ کرتا ہوں اور اس کے ٹھیک نیچے اپنا نام بھی لکھ دیتا ہوں، اس کے بعد کالم کا عنوان لکھ کر اسے ”centre align“ کر کے ”بولڈ“ کر دیتا ہوں، لیجئے پہلا مرحلہ طے ہو گیا۔

ہوئے نظر آئیں گے، ان کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اپنی ذات کے حوالے سے یہ لوگ بالکل نارمل لگتے ہیں لیکن جب ملک کی باری آتی ہے تو ان پر hallucination کا دورہ پڑ جاتا ہے اور یہ خیالی دنیا میں چلے جاتے ہیں جہاں سے انہیں ملک کی ایسی تصویر نظر آتی ہے جو حقیقت کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ میرے خیال میں ایسے لوگوں اور ”خان صاحب“ میں کوئی خاص فرق نہیں!!!

(23 اکتوبر 2008ء)



نے کمال بے نیازی سے جواب دیا ”وہ آپ بے شک لکھتے رہیں“!!!  
تقریباً دو گھنٹے سستا لینے کے بعد جب میں فریش ہو کر اٹھتا ہوں تو دل میں اس بات کا  
تہیہ کیا ہوتا ہے کہ فقط ایک کپ چائے پینے کے بعد سیدھا کمپیوٹر ٹیبل پر بیٹھوں گا اور دھڑا دھڑ  
ٹائپ کر کے محض ایک گھنٹے میں کالم کا پرنٹ نکال ماروں گا۔ اس عہد کا کے نتیجے میں سب سے  
پہلے میں ایک کپ چائے پیتا ہوں اور پھر سیدھا کرسی پر جا بیٹھتا ہوں۔ اچانک خیال آتا ہے  
کہ اپنا پرنٹر تو چیک کر لوں مبادا اس میں ”ٹوڑ“ ہی نہ ہو تو ساری محنت ضائع جائے (حالانکہ  
کالم کمپوز کرنے کے بعد اس کا پرنٹ نکالنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اسے فقط  
”ای۔میل“ ہی کیا جانا ہوتا ہے)۔ اس کے بعد کے واقعات قدرے تیزی اور اس ترتیب  
کے ساتھ رونما ہوتے ہیں:

ای۔میل چیک کرتا ہوں، چاکلیٹ کھاتا ہوں تاکہ پوری توجہ کے ساتھ لکھنے میں مدد  
مل سکے، کسی دوست کو فون کرتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں کہ کیا کافی واقعی دماغی استعداد  
میں اضافہ کرتی ہے یا محض یہ سنی سنائی بات ہے، موبائل فون پر موصول شدہ چند ضروری  
پیغامات کا جواب دیتا ہوں، واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھتا ہوں اور اس بات کو یقینی بناتا ہوں  
کہ میری کرسی بالکل سیدھی ہوتا کہ مجھے لکھنے میں کسی قسم کی مشکل ناں ہو، ای۔میل چیک کرتا  
ہوں، شیشے میں اپنے دانت دیکھتا ہوں اور اپنی ڈائری پر نوٹ کرتا ہوں کہ اگلے ہفتے مجھے  
ڈینٹسٹ کے پاس جانا ہے، دماغ کو تراوت بخشنے کے لئے اپنے MP3 پلیئر پر کوئی نیا گانا  
سنتا ہوں، اپنے اسی دوست کو دوبارہ فون کرتا ہوں اور ایک کالم نگار کی جی بھر کے برائیاں کرتا  
ہوں جسے لکھنے کی بجائے پیاز کی آڑھت کرنی چاہئے، ای۔میل چیک کرتا ہوں، گاڑی نکالتا  
ہوں اور اپنی پسندیدہ سٹیشنری کی دوکان سے جا کر کاغذوں کا ایک رم خرید کر لاتا ہوں جس کی  
شاید مجھے ضرورت پڑ جائے، کچھ دیر کمپیوٹر پر تاش کھیلتا ہوں، تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ بند  
کر کے نہایت سنجیدگی کے ساتھ دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا ہوں، موبائل فون کی چار جنگ  
چیک کرتا ہوں، ایک نظر اپنے کالم کے عنوان پر ڈالتا ہوں کہ کہیں اسے تبدیل کرنے کی  
ضرورت تو نہیں، MP3 پر ایک اور گانا سنتا ہوں، ای۔میل چیک کرتا ہوں.....!!!

رات کے گیارہ بج جاتے ہیں..... کالم لکھنا شروع کرتا ہوں اور پھر بغیر کسی وقفے کے  
ایک بجے تک لکھتا چلا جاتا ہوں، ایک بجے کالم ای۔میل کر دیتا ہوں (اس دفعہ اپنی کوئی میل

ملازم ابھی تک چائے لے کر نہیں آیا، فوراً اٹھ کر خود کچن میں جاتا ہوں اور اپنی نگرانی  
میں چائے تیار کرواتا ہوں، اس دوران اگر فریج میں سے کچھ کھانے کے لئے مل جائے تو  
سبحان اللہ۔ چائے اور دیگر لوازمات لے کر واپس کمپیوٹر ٹیبل کے سامنے آ کر بیٹھ جاتا ہوں اور  
احتیاطاً چیک کرتا ہوں کہ کچھ کالم لکھا گیا یا نہیں جیسے میرے کچن تک جانے اور واپس آنے  
کے دوران پیچھے سے کچھ پراسرار انداز میں تبدیل ہو گیا ہو گا۔ چائے وغیرہ پی کر میں اپنا  
موبائل فون دیکھتا ہوں کہ کہیں اس پر کوئی مسڈ کال یا ایس۔ایم۔ایس تو نہیں آئی؟ اس کے  
ساتھ ہی خیال آتا ہے کہ ابھی تک اپنی ای۔میل بھی نہیں کھول کر دیکھی، یہی سوچ کر ”نیٹ“  
آن کرتا ہوں اور اپنی ای۔میل چیک کرتا ہوں، چونکہ میں نے متعدد ای۔میل اکاؤنٹ بنا  
رکھے ہیں، جن کی بظاہر کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ مجھے تمام ای۔میلز چیک کرنے میں  
زیادہ سے زیادہ پریشانی ہو، اس لئے مجھے میل چیک کرنے میں کم از کم آدھ گھنٹا لگ جاتا  
ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ لگے ہاتھوں تازہ ترین خبروں پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے،  
کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کسی ایسے موضوع پر کالم لکھ ماروں جس کا پچھلے آدھ گھنٹے میں نقشہ ہی  
بدل گیا ہو (حیرت کی بات ہے کہ ایسا کبھی ہوا نہیں)۔ ”جنگ“ کی ویب سائٹ پر خبریں  
دیکھنے کے بعد کچھ سوچ کر میں ایک نظر دوبارہ اپنے ”شروع کئے ہوئے کالم“ پر ڈالتا ہوں  
جس کی پہلی لائن بھی ابھی تک نہیں لکھی گئی، نہ جانے مجھے یہ دیکھ کر کیوں حیرت ہوتی ہے کہ  
کالم وہیں کا وہیں ہے!

چائے پینے کے بعد بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ”ہائی ٹی“ لینے کے بعد مجھ پر کچھ کچھ غنودگی  
طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس حالت میں کوئی تخلیقی کام نہیں ہو سکتا اس لئے اس  
موقع پر میں فیصلہ کرتا ہوں کہ مجھے کچھ دیر سستا لینا چاہئے اور پھر فریش ہو کر کالم لکھنا چاہئے  
، ویسے بھی آرام کرنے کے دوران مجھے زیادہ ”آد“ ہوتی ہے اور نت نئے خیالات ذہن میں  
آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ مفسدین کا خیال ہو کہ کالم لکھنا کوئی تخلیقی کام نہیں لیکن مجھے ایسے  
لوگوں کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حفیظ جالندھری مرحوم کو بھی نہیں  
بخشا۔ ایک دفعہ حفیظ صاحب بیمار ہو گئے تو ڈاکٹر کے پاس علاج کی غرض سے جانا ہوا، ڈاکٹر  
نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ وہ آرام کریں اور کوئی دماغی یا تخلیقی کام ناں  
کریں۔ حفیظ صاحب نے کہا کہ وہ تو ان دنوں ”شاہنامہ اسلام“ لکھ رہے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر

چیک نہیں کرتا)، کمپیوٹر آف کرتا ہوں اور سونے چلا جاتا ہوں۔ اپنی اس کارکردگی کو دیکھنے کے بعد اب مجھے کچھ کچھ یقین ہو چلا ہے کہ اگر میں اتنی سہولت سے کالم لکھ سکتا ہوں تو بہترین انداز میں حکومت بھی چلا سکتا ہوں!!!

(29 اکتوبر 2008ء)

## برگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ

جب سے اباما صاحب امریکہ کے صدر منتخب ہوئے ہیں، مجھے ان سے کچھ چڑسی ہو گئی ہے اور اس کی کچھ ٹھوس وجوہات بھی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اباما کا نام ہی بہت عجیب ہے یعنی باراک اباما، یہ بھی کوئی نام ہوا، ایسا لگتا ہے جیسے کوئی منحوس قسم کا بچہ اپنی بے جاقسم کی ضد پوری کرنے کے لئے ”باں باں“ کر رہا ہو۔ دوسری وجہ موصوف کی کالی رنگت ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض کالی رنگت کے حامل اشخاص بھی اپنے اندر کشش رکھتے ہیں لیکن کم از کم اباما میں ایسی کسی قسم کی کشش کے کوئی آثار دور دور تک نہیں پائے جاتے۔ ممکن ہے کچھ لوگ یہاں اعتراض کریں کہ جس طرح محترم بش صاحب کو آٹھ سال تک برداشت کیا اسی طرح بے چارے اباما کا بھی کڑوا گھونٹ بھر لیں لیکن میرے خیال میں اباما اور بش میں بہت فرق ہے، بش کی شکل دیکھتے ہی آپ کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتی ہے جبکہ اباما کی شکل دیکھتے ہی جسم میں ”تشیخ“ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اباما کی جگہ ہیلری کلنٹن صدارتی امیدوار ہوتی اور پھر بالآخر امریکی عوام انہیں صدر منتخب کر لیتے، اس صورت میں کم از کم ہم یہ تو کہہ سکتے تھے کہ ہمارا محبوب اس قدر سنگدل ہے کہ ہم پر میزائلوں سے بمباری کرتا ہے اور ہم آہ بھی نہیں بھر سکتے۔

ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس بات پر بھی اعتراض کریں اور کہیں کہ اتنا ”وایا بھٹنڈہ“

زمانے میں فلاح و بہبود کے کاموں کے سلسلے میں گوجرانوالہ میں رہتی رہی ہیں، یقیناً انہوں نے وہاں کے مشہور زمانہ تگے اور ”غنی“ کے پائے بھی کھائے ہوں گے۔ اسی طرح کہیں یہ خبر بھی آئی تھی کہ اوباما صاحب کچھ عرصہ لاہور میں بھی قیام کر چکے ہیں، واللہ عالم کہ انہوں نے لاہور میں ”بچھے“ کے پائے کی دوکان اور اس کے ”ملحقہ علاقوں“ کو بھی رونق بخشی یا نہیں تاہم مجھے کچھ کچھ لگتا ہے کہ انہوں نے یہ موقع نہیں گنویا ہوگا کیونکہ ان کی شکل کا ایک نوجوان لڑکا آج کل بچھے کے پاس ملازم ہے!!! یہ بھی سننے میں آیا کہ اوباما صاحب رحیم یار خان میں شکار بھی کھیلے رہے ہیں and last but not the least اوباما کے ”کوئی ایک“ والد صاحب مسلمان بھی تھے، الحمد للہ! اب جہاں ہماری قوم کی اس قدر ownership ہوگی بھلا وہاں ہم اوباما کی کامیابی پر خوشی کے شادیانے کیوں نہیں بجائیں گے؟ یہ صورتحال بالکل ایسی ہے جیسے کسی گاؤں میں کسی غریب کا کوئی دور دراز کا رشتہ دار شہر میں پولیس میں بھرتی ہو جائے تو وہ غریب اور اس سے متعلقہ دیگر لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس پولیس والے سے اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان بے چاروں کو یہ نہیں پتا ہوتا کہ جس دن وہ اس پولیس والے کے ہاتھ چڑھے، اس نے ان کا وہ حال کرنا ہے جو کوئی ریگانہ بھی نہیں کر سکتا۔

اپنی انتخابی مہم کے دوران باراک اوباما نے دیگر پالیسیوں کے ساتھ ساتھ ان خیالات کا بھی اظہار کیا کہ وہ ہم جنسوں کی شادی کے خلاف ہیں جبکہ استقاط حمل کے حق میں ہیں۔ جہاں تک اولاد کر بات کا تعلق ہے تو عین ممکن ہے کہ موصوف کے ساتھ اوائل عمری میں کوئی سانحہ ہو گیا ہو جس کے سبب ان کے خیالات اس قسم کے ہو گئے ہیں جبکہ موخر الذکر بات سے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ رجحانات باراک اوباما کے نہیں بلکہ سارا پالن کے ہیں۔ لگے ہاتھوں یہاں ”جو بائیڈن“ کا ذکر کرنا بھی نہایت مناسب ہوگا جو اوباما کے نائب صدارتی امیدوار تھے اور جن کو انتخابی مہم کے دوران سب سے کم کورٹج ملی۔ موصوف نے 1988 میں بھی امریکی صدر کا الیکشن لڑنے کی کوشش کی تھی مگر اس وجہ سے رہ گئے کہ ان کی چند تقاریر کہیں سے چرائی ہوئیں تھیں! ان کے بارے میں ایک مشہور امریکی کامیڈین ”جے لینو“ نے کمال کا جملہ کہا کہ ”ایک کامیڈین کی حیثیت سے میں صدر بش کو بہت ”مس“ کروں گا کیونکہ اوباما کے متعلق لطیفے بنانا کوئی آسان کام نہیں لیکن اب خدا کا شکر ہے کیونکہ اس نے ”جو بائیڈن“ کی شکل میں میری یہ مشکل آسان کر دی ہے!“

جانے کی کیا ضرورت ہے، سیدھی طرح سارا پالن کے منتخب ہونے کی دعا کر لیتے، وہ نہ صرف ہیلری سے کم عمر ہے بلکہ زیادہ حسین بھی لگتی ہے کیونکہ اس کے پاس مقابلہ حسن کے فاتح کی حیثیت سے خوبصورتی کی باقاعدہ سند موجود ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ بندہ دعا وہ مانگے جو کم از کم میرٹ پر قبول ہونے کا چانس ضرور رکھتی ہو، مطلب یہ کہ ڈیمو کریٹ اور ری پبلکن امیدواران کے ووٹوں میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ سارا پالن کا جیتنا تقریباً ناممکن تھا۔ ویسے بھی میں ہیلری سے عمر میں کم ہونے کے باوجود سارا پالن کی شخصیت میں وہ جاذبیت نہیں جو ہیلری میں ہے اور میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ سارا کی شخصیت میں کچھ کچھ ”ڈنگر پن“ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس موقع پر نہ جانے کیوں مجھے موزیکا لینسکی بہت یاد آ رہی ہے، وہ عقیفہ جب تک بل کلنٹن کے ساتھ سکیڈل کی خبروں میں رہی، اخبار دیکھنے کا لطف آ جاتا تھا۔ مسٹر اوباما کو چاہئے کہ فی الفور اس عقیفہ کو اس کی وہائٹ ہاؤس والی سیٹ پر بطور intern (بشمول تنخواہ اور مراعات کے بقایا جات کے) بحال کر دیں اور پاکستانی عوام کو شکریہ کا موقع دیں۔ ویسے سنا ہے کہ باراک اوباما، بل کلنٹن کو اپنا مشیر مقرر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جن سے وہ مختلف امور پر مشورے لیا کریں گے۔ اس افواہ نے سب سے زیادہ جس کو پریشان کیا ہے وہ ہے مشیل اوباما یعنی باراک اوباما کی بیوی!

امریکہ کے حالیہ صدارتی انتخاب کو جتنی کورٹج ہمارے میڈیا نے دی ہے اتنی کورٹج شاید خود امریکی میڈیا نے نہیں دی، یہی وجہ ہے کہ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے باراک اوباما امریکہ کے نہیں بلکہ پاکستان کے صدر منتخب ہو گئے ہیں۔ اب ہمارے سارے دلدر دور ہو جائیں گے، مسئلہ کشمیر حل ہو جائے گا، امریکی میزائل حملے بند ہو جائیں گے، دہشت گردی کے خلاف جنگ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے بعد ختم ہو جائے گی، امریکہ پاکستان کو ہر ماہ حیلے بہانے سے دو چار ارب ڈالر دے دیا کرے گا، پاکستانی شہریوں کے لئے امریکہ کا ویزا لگوانے کی پابندی بھی ختم ہو جائے گی، افغانستان اور عراق سے فوجیں واپس بلا لی جائیں گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں محض خوش فہمی کی بنیاد پر نہیں کی جارہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب وہائٹ ہاؤس میں ہمارا ”اپنا بندہ“ باراک اوباما کی شکل میں موجود ہے۔

ان امریکی انتخابات کے موقع پر پاکستانی عوام اور میڈیا کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے ”بیگانی شادی پر عبداللہ دیوانہ“!!! میں نے کہیں یہ خبر بھی پڑھی ہے کہ اوباما کی والدہ ماجدہ کسی

## ”پدرم سلطان است“

انسان زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر اپنی self evaluation ضرور کرتا ہے، میں بھی جب اپنی self evaluation کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میرے لیے کالم نگاری قابل فخر ہے، ڈرامہ نگاری یا پھر افسری، تو مجھے ان تینوں سوالوں کا جواب نفی میں ملتا ہے اور اس کی وجہ بھی بڑی سیدھی ہے کیونکہ میرے لیے سب سے زیادہ فخر کی بات یہ ہے کہ میں عطاء الحق قاسمی کا بیٹا ہوں۔

آج سے دو سال قبل جب میں نے ”روزنامہ جنگ“ میں کالم لکھنے شروع کیے تو ابتداء میں مجھے یہ کام بہت آسان لگا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتنی بڑی چٹان ہے جو روز سرکانا پڑتی ہے۔ جب بھی کالم لکھنے کے حوالے سے میرے ذہن میں کوئی اچھوتا موضوع آتا اور میں اس کا ذکر والد صاحب سے کرتا تو وہ نہایت توجہ سے پوری بات سنتے اور پھر جواب میں فقط ایک چھوٹا سا جملہ ارشاد فرماتے کہ ”بیٹا! اس موضوع پر تو میں 35 برس پہلے کالم لکھ چکا ہوں۔“ کافی غور و خوض کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ اُن موضوعات کی ایک فہرست بنا لی جائے جن پر ابھی تک قبلہ والد صاحب نے کالم نہیں لکھا۔ خاصی محنت شاقہ کے بعد میں نے 32 صفحات پر مشتمل حروفِ تجنی کے اعتبار سے ایک فہرست تیار کی اور الحمد للہ یہ وہ تمام موضوعات تھے جن پر والد صاحب نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا تھا، ان میں سے کچھ موضوعات یہ نکلے!!!

1- خریف کی فصل پر کیڑے مار ادویات کے اثرات

مسٹر اوباما کی کامیابی کے بعد جو پڑھے لکھے تجزیے سننے اور دیکھنے میں آ رہے ہیں انکے جائزے سے یوں لگتا جیسے باراک اوباما کی شکل میں کوئی آسمانی مخلوق نازل ہو گئی ہے جو اگلے چند سالوں میں دنیا کا نقشہ بدل دے گی اور دنیا امن و آتشی کا گہوارہ بن جائے گی۔ ایک منٹ کے لئے فرض کیجئے کہ اوباما کی جگہ جان کلین، سارا پالن یا ہیلری کلنٹن منتخب ہو جاتیں تو کیا پھر ان کی شان میں یہ تعریفی و توصیفی تجزیے نہ کئے جاتے؟ یقیناً کئے جاتے مگر محض ان کی نوعیت کچھ مختلف ہوتی مثلاً یہ کہ ایک عورت کو منتخب کر کے امریکیوں نے تاریخ رقم کر دی یا یہ کہ جان کلین جیسے جہاندیدہ شخص کا انتخاب امریکیوں کی بالغ نظری کا ثبوت ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے لفظوں میں امریکیوں نے ہر صورت میں تاریخ ہی رقم کرنی تھی، چاہے ڈیموکریٹ جیتنے یا پھر ری پبلکن۔ اس قسم کے تجزیوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھے بھی چند پیشن گوئیاں کرنی چاہئیں تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔ تاہم آج کل کے منجم حضرات کی روش کے برعکس میری یہ پیشن گوئیاں دو ٹوک ہوں گی۔ میری پہلی پیشن گوئی یہ ہے کہ باراک اوباما کے صدر بننے کے بعد پاکستان سے متعلق امریکی پالیسی میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئے گی، میری دوسری پیشن گوئی بھی یہی ہے اور تیسری پیشن گوئی بھی یہی ہے، خدا ہمارے حال پر رحم کرے!

(12 نومبر 2008ء)

مزاح لکھتے ہوئے والد صاحب مجھ جیسے قلم کاروں کے لئے بے حد مشکل پیدا کر دیتے ہیں جن کے لئے طنز و مزاح کے اس معیار کو چھونا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ میری ان سے گزارش ہے کہ پلیز اتنا اچھا نہ لکھا کریں، آخر دوسروں کو بھی اپنی روزی روٹی کمانے کا کوئی حق ہے۔

جہاں تک ”وصیت نامے“ کا تعلق ہے تو یہ بھی ایک منفرد موضوع کی حامل کتاب ہے، جو نہ انشائیے کی ذیل میں آتی ہے، نہ کالم کی اور نہ مضمون کی، میرا تو خیال ہے کہ اس فارمیٹ کا نام ہی ”وصیت نامے“ ہونا چاہیے۔ ویسے میری عمر میں تو وصیت نامے سے زیادہ نکاح نامے کے مندرجات یاد رہتے ہیں لیکن اس کتاب کو پڑھنے کا مجھے ایک بہت بڑا فائدہ ہوا ہے کہ مجھے وصیت لکھنی آگئی ہے، وصیت ہمارے معاشرے میں کس قدر اہمیت اختیار کر گئی ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ایک اچھی لکھی ہوئی وصیت آپ کو صدر بھی بنا سکتی ہے!!!

قاسمی صاحب کے ان مضامین مضامین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان مضامین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جسے آپ skip کر سکیں۔ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک لائن دوسری لائن سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے فقروں میں صرف مزاح ہی نہیں بلکہ ہمارے معاشرتی رویوں کی بھی بھرپور عکاسی ہے۔ مثلاً پیر صاحب ہتھوڑا شریف کے وصیت نامے میں لکھتے ہیں۔ ”بیٹے! تمہیں پتہ ہے میرے جوڑوں میں درد رہتا ہے جس کے لئے حکیم نور دین نے موتی اور جواہرات کوٹ کر میرے لئے دوا تیار کی ہے، مجھے حکیم صاحب نے بتایا کہ یہ نسخہ مہاراجہ پٹیالہ بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ تمہارے خادم خاص اللہ بخش کبھار نے مجھے بتایا مجھ سے چوری چھپے تم بھی یہ دوا استعمال کر رہے ہو، بیٹے اس کے استعمال میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کی مقدار دال کے دانے سے بھی کم ہونی چاہئے اور ایک پاؤ مکھن میں لپیٹ کر کھانی چاہئے ورنہ تمہیں دسمبر کا مہینہ جولائی کے برابر محسوس ہوگا۔ مگر بیٹے تمہیں ابھی سے اس کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟“

اس کتاب میں شامل وصیت نامے بنیادی طور پر اُن نقاب پوش لوگوں کی اصلیت سے پردہ اٹھاتے نظر آتے ہیں جو اپنی جبلت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ پیر صاحب ہتھوڑا شریف، چراغ دین صحانی، افتدار حسین لوٹا، اداکارہ چھمک چھلو، ادیب نازک خیالی اور ڈاکٹر

2۔ عالمی منڈی میں ایلومینیم کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ  
3۔ فنِ پہلووانی کے زوال کے اسباب (نوٹ۔ شک ہے کہ شاید یہ موضوع والد صاحب کے احاطہ تحریر میں آچکا ہو)

4۔ ٹائیفاڈ اور اس کی اقسام  
5۔ میٹرک کے نتائج کا ایک تنقیدی جائزہ  
6۔ قصہ حاتم طائی کی گھٹیا کاغذ پر چھپائی اور بچوں پر اس کے اثرات

یہ موضوعات میرے کالم لکھنے کے لیے کھلا میدان تھے اور میں بباگ دہل والد صاحب سے کہہ سکتا تھا کہ جن موضوعات پر میں نے کالم لکھے ہیں اُن پر آپ نے آج تک نہیں لکھا۔ تاہم ٹھنڈے دل سے سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ایسے ”حساس موضوعات“ پر لکھنے سے مجھے بھی پرہیز ہی کرنی چاہیے۔

خواتین و حضرات! جب تک آپ کسی برے اداکار کی اداکاری نہیں دیکھتے تو آپ کو اچھے اداکار کی صلاحیت کا اندازہ نہیں ہوتا بالکل اسی طرح جب تک آپ چند بے ہودہ کالم نہ پڑھ لیں تب تک آپ کو اچھے کالم نگار کی قدر نہیں آتی۔ آج کل الحمد للہ مارکیٹ میں ایک سے بڑھ کر ایک برا لکھنے والا موجود ہے اس لئے لوگوں کو اچھے کالم نگاروں کی قدر و منزلت کا احساس ہو گیا ہے، ویسے یہ بات یونہی برسبیل تذکرہ نکل آئی، میرا اشارہ اپنی طرف نہیں تھا۔

خواتین و حضرات! میں نے اپنی کم علمی کے باوجود زندگی میں بہت سے معروف ادیبوں شاعروں کو پڑھا ہے، لیکن والد صاحب وہ واحد ہستی ہیں جن کا لکھا ہوا نہ صرف میں نے پڑھا بلکہ اس کا اطلاق بھی ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے والد صاحب کی تحریریں بطور فرزند نہیں بلکہ بطور ایک عام قاری کے پڑھی ہیں اسی لیے آج ایک عام قاری کے طور پر ہی ان کی کتاب کے حوالے سے بات کروں گا۔

”وصیت نامے“ اور ”ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ“ میں سے مجھے ذاتی طور پر ”وصیت نامے“ زیادہ پسند ہے۔ ”ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ“ کے بارے میں میں کہوں گا کہ یہ ایک اچھوتا موضوع تھا جس پر انہوں نے قلم اٹھایا اور پھر قہقہوں کے انبار لگاتے ہوئے پاکستانی معاشرے کی ایسی تصویر کشی کی بقول شفیق الرحمن قاری زار و قطار ہنسنے لگتا ہے۔ اس اعلیٰ پائے کا



## نوٹ

کیا آپ نے کبھی 100 روپے کا نوٹ دیکھا ہے.....؟ یقیناً دیکھا ہوگا..... لیکن اس وقت اس نوٹ کو ایک مرتبہ پھر جیب سے نکال کر دوبارہ دیکھیں اور اس پر لکھی ہوئی عبارت بلند آواز میں پڑھیں..... اس پر لکھا ہوا ہے ”بینک دولت پاکستان، ایک سو روپے، حامل ہذا کو مطالبے پر ادا کرے گا۔“ اب ذرا اپنے دماغ پر زور ڈال کر سوچیں کہ اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ سٹیٹ بینک آف پاکستان، مطالبہ کرنے پر، اس شخص کو 100 روپے ادا کرے گا، جس کے ہاتھ میں یہ نوٹ ہوگا!!! یعنی مزید سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص، 100 روپے کا نوٹ لے کر سٹیٹ بینک میں جائے اور ان سے مطالبہ کرے کہ اسے 100 روپے دیے جائیں تو سٹیٹ بینک اس کا پابند ہے کہ اس نوٹ کے بدلے اس شخص کو 100 روپے ادا کرے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 100 روپے تو پہلے ہی اس شخص کے ہاتھ میں ہوں گے تو پھر سٹیٹ بینک اسے اس نوٹ کے بدلے کون سے 100 روپے دے گا؟؟؟ اس سوال کا جواب بڑا دلچسپ ہے لیکن یہ جواب جاننے کے لئے آپ کو ایک مرتبہ پھر اپنی جیبوں اور بٹوؤں کو ٹٹولنے کی ضرورت پڑے گی اور اب کی مرتبہ آپ کو ایک روپے کا سکہ نکالنا پڑے گا۔ اس ایک روپے کے سکے کو غور سے دیکھیں، اس پر ایسی کوئی عبارت نہیں لکھی ہوئی جیسی 100 روپے کے نوٹ پر ہے، اس کے ایک طرف ”ایک روپیہ“ لکھا ہوا ہے اور دوسری طرف ”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ لکھا ہے۔ یہ ہے ”خالص“ ایک روپے!!! یعنی جب کوئی شخص 100 روپے کا نوٹ لے کر سٹیٹ

بٹھرے جیسے کردار بظاہر اپنے ناموں میں لطافت کا تاثر لیے نظر آتے ہیں لیکن ان کے وصیت نامے چیخ چیخ کر ان کے گھناؤنے روپ کو آشکار کرتے ہیں۔ بظاہر یہ تمام کردار فرضی ہیں لیکن حقیقت میں یہ تمام لوگ ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ قاسمی صاحب پوسٹ مارٹم سے زیادہ آپریشن اور آپریشن سے زیادہ تھراپی کے قائل ہیں، شاید اسی لیے معاشرے میں مثبت تبدیلی کی خواہش ان کے ہاں شدت سے نظر آتی ہے۔

ایک اور بات جو میں آپ سب سے یہاں شیئر کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ والد صاحب جس آسانی کے ساتھ کالم لکھتے ہیں اس کا شاید اندازہ لگانا بھی مشکل ہے، وہ اپنی ”سٹڈی“ میں ایک پین اور کاغذ کے ایک سادہ دستے کے ساتھ جاتے ہیں اور جب بمشکل ایک گھنٹے کے بعد وہاں سے برآمد ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں ایک ماسٹر پیس تیار ہوتا ہے۔ اتنی آسانی کے ساتھ تو صرف کوئی نقاد تنقیدی مضمون ہی لکھ سکتا ہے۔

آخر میں میں اپنی بات وہیں ختم کروں گا جہاں سے شروع کی تھی کہ ”میرا نام یاسر پیرزادہ ہے اور میں عطاء الحق قاسمی صاحب کا بیٹا ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے!!!“  
(نوٹ: محترم عطاء الحق قاسمی صاحب کی کتابوں ”وصیت نامے“ اور ”ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور“ کی تقریب رونمائی منعقدہ الحمرا آرٹس کونسل، لاہور میں پڑھا گیا)۔

(17 نومبر 2008ء)

ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ آپ کے پاس بے تحاشہ دولت ہو۔ مشہور امریکی کامیڈین گراؤچو مارکس نے اس بارے میں ایک کمال کا فقرہ کہا ہے کہ ”پیسہ آپ کو اس بات کی آزادی دیتا ہے کہ آپ وہ کام نہ کریں جو آپ کو پسند نہیں، چونکہ مجھے کچھ بھی کرنا پسند نہیں، اس لئے پیسہ میرے لئے نہایت ضروری ہے!“

یہ قطعاً ضروری نہیں کہ جس کے پاس پیسے ہوں وہ عقل مند بھی ہو کیونکہ ہمیں اپنے ارد گرد کے لوگوں کو دیکھ کر اس بات کے خلاف کافی ثبوت مل جائیں گے۔ کچھ لوگ دولت مند ہو کر فوراً اپنی اوقات سے باہر ہو جاتے ہیں اور ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، بقول غالب ”ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں“۔ جبکہ کچھ لوگوں کے پاس اگر پیسہ آ بھی جائے تو اسے خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں آتا، ایسے لوگوں کو میں اللہ میاں کا کیشئر کہتا ہوں! اسی طرح کچھ لوگوں کو محض نوٹوں کی خوشبو اچھی لگتی ہے اور ان کی دولت کمانے کی motivation بھی یہی ہوتی ہے۔ امریکی ارب پتی ڈالڈ ٹرمپ کا کہنا ہے کہ "Money was never a big motivation for me, except as a way to keep score."

The real excitement is playing the game."

تاہم ان سب لوگوں میں سب سے گھٹیا قسم ان لوگوں کی ہے جو پیسہ آنے کے بعد پارسائی کے دعوے دار بن جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ لوگ کسی صوفی کا روپ دھارنے سے بھی باز نہیں آتے بلکہ گاہے بگاہے اپنے بارے میں ایسی خبریں بھی اڑاتے رہتے ہیں جن سے یہ مشہور ہو کہ اصل میں تو وہ زندگی میں عرفان حاصل کرنا چاہتے ہیں، پیسہ تو بس ان کے ہاتھ کی میل ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی لگتی ہے کیونکہ میل کی جس قدر تھیں ان کے جسموں پر چڑھی ہوتی ہیں، اس سے پیسے کے بارے میں ان کی رغبت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے!

پیسوں کے بارے میں مجھے سب سے دلچسپ بات یہ لگتی ہے کہ میں نے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جسے پیسے کی سمجھ نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جنہیں ہم عرف عام میں ”سائیں“ کہتے ہیں، پیسوں کے معاملے میں پکے ہوتے ہیں۔ سڑکوں اور بازاروں میں ہمیں ایسے بے شمار سائیں روز ملتے ہیں جن سے اگر ان کا نام بھی پوچھا جائے تو وہ آگے سے احمقوں کی طرح غوں غاں کر کے رہ جائیں گے لیکن اگر آپ انہیں دس بیس کا نوٹ دیں گے

بینک جائے گا اور ان سے مطالبہ کرے گا کہ اسے اس کے بدلے 100 روپے دیے جائیں تو سٹیٹ بینک اسے ایک روپے کے سو سکے دے دے گا، یعنی 100 روپے کا یہ نوٹ اصل میں 100 روپے کی رسید ہے!!! زندگی پہلے ہی کافی پیچیدہ ہے۔

آج مجھے ایک اور سو روپے کے نوٹوں کی یاد اس لئے آئی کیونکہ اب ایک عرصے سے صرف کروڑوں اور اربوں روپوں کی باتیں ہی سننے کو ملتی ہیں، ہزار پانچ سو کا تو ذکر کرنا تو اب جیسے معیوب ہو گیا ہے۔ مجھے ایسے فقروں سے سخت چڑ ہے جو یوں شروع ہوں کہ ”کسی زمانے میں“ یا ”ہمارے زمانے میں ایسا ہوا کرتا تھا“ تاہم یہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ آج سے پندرہ بیس سال پہلے ”ٹھپے“، ”چونی“، ”اٹھنی“ وغیرہ کی کچھ نہ کچھ قدر ضرورت تھی لیکن اب ہماری کرنسی جس قدر تیزی سے ”ڈی ویلیو“ ہوئی ہے اس کا اندازہ ایک اور دو روپوں کے ان سکوں سے لگایا جاسکتا ہے جو حال ہی میں سٹیٹ بینک نے جاری کئے ہیں۔ ان سکوں کی شکل و شباهت، وزن اور ساخت پرانے ”ٹیڈی پیسے“ سے ملتی جلتی ہے بلکہ اگر آپ ان سکوں کو اپنی انگلیوں سے رگڑ کر دیکھیں تو آپ کی انگلیاں کالی ہو جائیں گی۔ میں اس ”تجربے“ میں اپنے ہاتھ کا لے کر چکا ہوں!

آج سے صرف چار پانچ سال قبل بھی روپے کی قدر اتنی کم نہیں تھی جتنی اب ہو گئی ہے۔ چند سال پہلے میرا کسی کام کے سلسلے میں وفاقی سیکریٹریٹ جانا ہوا، وہاں مین گیٹ پر ایک کلرک دوسرے کو بتا رہا تھا کہ حال ہی میں جو وفاقی سیکریٹری صاحب ریٹائر ہوئے ہیں انہیں دوبارہ چالیس ہزار ماہوار پرکٹریکٹ پر رکھ لیا گیا ہے۔ اس پر دوسرے کلرک نے شدید حیرانی سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا ”چالیس ہزار روپے.....!!! سیکریٹری صاحب اتنے پیسے گنیں گے کیسے؟؟؟“

زندگی میں نوٹوں کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے، پنجابی کی مشہور ”مثل“ ہے، ”مینوں نوٹ دکھا، میرا موڈ بنے!“، نوٹوں کے بارے میں غیر ملکی سیانوں نے بھی کم و بیش اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے، مثلاً یہ کہ اگر آپ اپنے پیسوں کو گن سکتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے پاس ایک ارب ڈالر نہیں ہے! اسی طرح کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ خدا کا روپے پیسوں کے بارے میں کیا خیال ہے، یہ جاننے کے لئے محض ان لوگوں کو دیکھ لینا کافی ہے جنہیں خدا نے دولت دے رکھی ہے! پیسوں کے بارے میں نہ سوچنے کا

## اشتہاری

آج کل ٹی وی چینلز پر پروگرام کم اور اشتہارات زیادہ ہو گئے ہیں۔ اگر آپ ایک منٹ میں اپنے ٹی وی پر ساٹھ چینلز بدل کر دیکھیں تو غالب امکان ہے کہ ان میں سے آدھے چینلز پر اشتہارات دکھائے جا رہے ہوں گے۔ ان میں سے کچھ اشتہارات تو ایسے ہوتے ہیں جنہیں بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے تاہم بہت سے اشتہار ایسے بھی ہیں جن کا نہ صرف کوئی سر پیر نہیں ہوتا بلکہ الٹا انہیں دیکھ کر سخت کوفت ہوتی ہے اور دیکھنے والے کو اُس برانڈ سے ہی نفرت ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آج کل الیکٹرانکس کی مصنوعات بنانے والی ایک کمپنی کا اشتہار بار بار ہر چینل پر دکھایا جا رہا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اُس کی مصنوعات لوگوں کی ”پہلی چاہت“ ہیں! اس اشتہار میں ایک خوبصورت ماڈل اُس کمپنی کی مختلف چیزوں مثلاً واٹر کولر، مائیکرو ویو اوون اور ویکيوم کلیئر وغیرہ سے اظہار محبت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ذی ہوش کی ”پہلی چاہت“ ویکيوم کلیئر ہو سکتی ہے؟

اسی طرح بناسپتی گھی بنانے والی ایک کمپنی کا دعویٰ ہے کہ والدین اور اولاد کے رشتوں کو اُسی قسم کا اعتماد چاہئے جس قسم کا اعتماد عوام کو اُس کمپنی کے بناسپتی گھی پر ہے! یعنی..... لا حول ولا قوۃ!!!!

ایک اور اشتہار میں چند لڑکیاں چلتی ٹرین کے ڈبوں پر محض اس لئے اچھل کود رہی ہیں کہ انہیں ”ریٹ“ اچھال گیا ہے (موبائل کنکشن کا).....! اسی طرح ایک اشتہار میں دو تین لڑکیاں ایک عالیشان بنگلے میں بیٹھی چائے پی رہی ہیں، اتنے میں ایک لڑکی پھولی ہوئی سانس

تو وہ اشارے سے آپ کو بتائیں گے کہ وہ پچاس روپے سے کم نہیں لیں گے۔ نہ جانے انہیں سائیں کیوں کہا جاتا ہے، انہیں تو کسی سرکاری محکمے میں ہونا چاہئے!

ہمارے روپے کی قدر میں کمی کا ایک اور جیتا جاگتا ثبوت آج کل کے اشتہارات بھی ہیں۔ کسی زمانے میں اس قسم کے اشتہارات عام تھے جن میں دو یا پانچ روپے کی ”شانداز بچت“ کا مرثدہ سنایا جاتا تھا لیکن اب مدت سے ایسے اشتہارات نظر سے نہیں گزرے۔ اس قسم کے اشتہارات خواتین کو بہت لبھاتے تھے تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں کو پیسے کی بہت قدر ہوتی ہے، خواتین بھی روپے پیسے کی خاصی بے قدری کرتی ہیں بشرطیکہ وہ روپیہ ان کا اپنا نہ ہو!

بات ہمارے ملک کے کرنسی نوٹوں پر لکھی عبارت سے شروع ہوئی تھی اور عورتوں تک جا پہنچی، بے شک دونوں اجناس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارے کرنسی نوٹوں پر ایک عبارت اور بھی لکھی ہوتی ہے کہ ”حکومت پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا“ جس کا بڑا سادہ مطلب ہے کہ حکومت یہ وعدہ کرتی ہے کہ اس کے جاری کئے ہوئے کرنسی نوٹ ہر جگہ قابل قبول ہوں گے ویسے یہ اور بات ہے کہ آج کل وعدوں کی پاسداری نہ کرنا کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی اور یوں بھی حکومت کا یہ وعدہ کرنسی نوٹ پر ہی لکھا ہے، کوئی قرآن حدیث تو نہیں!!!

(28 نومبر 2008ء)

فیتی گاڑیوں کے اشتہارات تقریباً ایک جیسے ہی ہوتے ہیں تاہم ایک غیر ملکی کمپنی نے اس میں بھی جدت پیدا کر لی اور اپنی ایک نہایت مہنگی قسم کی گاڑی کا اشتہار کچھ یوں دیا کہ اُس میں ایک آدھ منٹ تک گاڑی کی چند جھلکیاں دکھائیں اور آخر میں صرف ایک ہی جملہ کہا کہ ”زندگی صرف ایک بار ملتی ہے!!!“ اب اس قسم کے ”اشتہار انگیز“ اشتہار کے بعد کون کافر ہے جو یہ گاڑی خریدنا پسند نہیں کرے گا۔ شائد وہی جس کی جیب میں پیسے نہ ہوں!!!

ان غیر ملکی اشتہارات کی دیکھا دیکھی اب ہمارے ملک کی کمپنیوں نے بھی اپنے اشتہارات میں جدت پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ یقیناً یہ ایک اچھی روایت ہے اور اسی لئے میں نے سوچا ہے کہ ان ملکی کمپنیوں کو اپنے اشتہارات میں نیا پن پیدا کرنے کے لئے کچھ ”مفت مشورے“ دے دیے جائیں۔ مثال کے طور پر اگر کمپاس کی فصل کے لئے سنڈی مار سپرے کا اشتہار تیار کرنا ہو تو وہ کچھ اس قسم کا ہونا چاہئے:

کمپاس کی فصل میں دو تین بانس جیسی دہلی پتلی لڑکیاں گھوم رہی ہیں کہ اچانک ایک گھبرو جوان ہاتھ میں سنڈی مار سپرے لیے نمودار ہوتا ہے۔ نوجوان کے ہاتھ میں سپرے دیکھتے ہی لڑکیاں چیخیں مارتی ہوئی فصل سے بھاگ کھڑی ہوتی ہیں اور نوجوان اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر سپرے کیمرے کے سامنے کر دیتا ہے اور کہتا ہے ”اپنی فصلوں کو امریکن سنڈی سے بچائیں!“..... آپ میں سے کچھ قارئین یہ سوچ رہے ہوں گے کہ..... لا حول ولاقوة..... اس اشتہار میں کیا جدت ہے؟؟؟ ایسے معصوم پڑھنے والوں کے لئے عرض ہے کہ اس اشتہار میں ہم نے روایتی سنڈیاں دکھا کر لوگوں کا دل خراب نہیں کیا بلکہ اُس کی جگہ ”ماڈل سنڈیاں“ دکھائی ہیں کہ آج کل زیادہ تر ماڈلز صحت کے اعتبار سے ”سنڈیاں“ ہی لگتی ہیں۔ اشتہار میں مزید جدت پیدا کرنے کی خاطر امریکن سنڈی کے رول کے لئے ”کوئڈی“ سے درخواست کی جاسکتی ہے جبکہ سپرے کرنے والے نوجوان کے کردار میں ”احمدی نژاد“ فٹ بیٹھیں گے!!! رہی بات سپرے کی تو یہ ایران یا شمالی کوریا میں سے کسی کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ امریکن سنڈیاں ان ممالک کے تیار کردہ سپرے سے بہت الرجک ہیں۔

اشتہارات میں جدت پیدا کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود ابھی ہم اشتہار بازی کے فن میں دوسرے ممالک سے خاصے پیچھے ہیں۔ معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے کیونکہ انفرادی سطح پر تو ہم اچھی خاصی اشتہار بازی کے ماہر ہیں تاہم یہ اشتہار بازی صرف اپنی ذات کی حد

کے ساتھ آکر یہ انکشاف کرتی ہے کہ فلاں ٹوتھ پیسٹ بارہ کی بجائے پھر سے دس روپے کا ہو گیا ہے!!! دو روپے کی اس ”بھاری بچت“ کا سنتے ہی لگ بھگ پانچ ہزار کے سوٹ میں ملبوس ایک لڑکی کے ہاتھ سے ڈیڑھ سو روپے کا کپ گر کر چکنا چور ہو جاتا ہے..... یعنی ایک بار پھر..... لا حول ولاقوة!!!

آج کل اشتہار بازی میں ایک نیا رواج بھی شروع ہو گیا ہے جس کے تحت اب چند سیکنڈز کے اشتہارات کی بجائے پورے کا پورا میں پچیس منٹ کا پروگرام کسی ایک پراڈکٹ کی تشہیر کے لئے مختص کر دیا جاتا ہے۔ اس پروگرام میں کبھی آپ کو موٹا پاکم کرنے کے لئے کوئی بیلٹ خریدنے کی ترغیب دی جاتی ہے، کبھی سر پر قدرتی بال اگانے کا نسخہ بتایا جاتا ہے، کبھی قد بڑھانے کی نوید سنائی جاتی ہے، کبھی منٹوں میں رنگ گورا کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور کبھی یادداشت بڑھانے کے آسان طریقوں پر مشتمل کتاب خریدنے کا مشورہ دیا جاتا ہے..... تاہم جو لوگ یہ ساری چیزیں خرید کر استعمال کر چکے ہیں ان کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ..... لا حول ولاقوة!!!

شروع میں میں نے ایسے اشتہارات کا ذکر بھی کیا تھا جنہیں بار بار دیکھنے کو دل کرتا ہے۔ ایسے اشتہارات ہمارے ہاں تو کم کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں تاہم دیگر ممالک اس میدان میں ابھی ہم سے بہت آگے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ میں نے ایک غیر ملکی اخبار میں کچھ اس قسم کا اشتہار دیکھا کہ اخبار کا ایک پورا صفحہ بالکل خالی ہے اور صفحے کے آخر میں باریک الفاظ میں کمپنی کے نام سے پہلے صرف ایک فقرہ لکھا ہے: ”We don't believe in advertisement“ بقول شاعر:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اسی طرح جب امریکہ میں سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگی تو سگریٹ بنانے والی ایک معروف کمپنی نے اپنا اشتہار کچھ یوں چلا دیا:

"Smoking is injurious to health. So don't smoke

even if it is our brand."

اب ایسے اشتہار پر کوئی مائی کا لعل کیسے پابندی لگا سکتا ہے!

ذرا ہٹ کے  
یاسر پیرزادہ

## بیک ٹائٹل

اگر آپ کسی بک سٹال پر کھڑے ہو کر اس کتاب کو خریدنے کی غرض سے ورق گردانی کر رہے ہیں تو یقیناً آپ میری سات پشتوں پر احسان کر رہے ہیں۔ اگر آپ محض وقت گزاری کے لئے کتابوں کی دکان میں گھومنے آگئے ہیں تو میرے خیال میں آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، آپ کو فوراً کسی ”نان اینڈ ٹکا شاپ“ کا رخ کرنا چاہئے۔ اگر آپ کا ارادہ کتاب خریدنے کا تھا اور آپ کی جیب میں پیسے نہیں ہیں تو یقیناً آپ ایک غریب آدمی ہیں اور حکومت کی طرح مجھے بھی آپ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اگر آپ گھر سے ”بہشتی زیور“، ”قصہ چہار درویش“ یا ”رضیہ کا بچن“ ٹائپ کوئی کتاب خریدنے نکلتے تھے اور اس کتاب کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے ہیں تو یقیناً واپسی پر آپ کے ایک ہاتھ میں دو کلو امرودوں کا لفافہ اور دوسرے ہاتھ میں ”گھر بیٹھے لاکھوں کمائے“ کا پیپر بیک ایڈیشن ہو گا۔ اگر آپ کو یہ کتاب پسند نہیں آئی تو براہ مہربانی اسے ریک میں اسی جگہ واپس رکھ دیں جہاں سے آپ نے کتاب اٹھائی تھی، اپنے بچے کے سر پر مار کر جلد کی مضبوطی چیک نہ کریں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اگر آپ کتاب چوری کرنا چاہیں تو میری (محض) دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

تک ہی محدود ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم صرف self projection کے چمپئن ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو آپ کو اپنے ارد گرد بہت سے لوگ اس فن میں طاق نظر آئیں گے۔ خاص طور پر پڑھے لکھے حضرات اس ہنر میں زیادہ ماہر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں سے اگر آپ ایک گھنٹہ گفتگو کر کے دیکھیں تو اس کا لب لباب کچھ یوں ہو گا..... ”میں ایک پرفیکٹ انسان ہوں، مجھ میں کوئی خامی نہیں۔ میں صاف اور سیدھی بات کرتا ہوں اور وہ بھی لوگوں کے منہ پر چاہے کسی کو کتنی ہی بری کیوں نہ لگے!!! میرا مطالعہ بہت وسیع ہے، مجھے ہر بات کا علم ہے۔ آپ کو مجھ سے متفق ہونا ہی پڑے گا کیونکہ آپ مجھ سے میرے علم کی بدولت بحث میں نہیں جیت سکتے..... میں اخلاقیات کے نہایت اعلیٰ درجے پر فائز ہوں اور کسی قسم کی بھی دنیاوی ترغیبات مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتیں وغیرہ وغیرہ“!!! اس قسم کے لوگوں کو میں چلتے پھرتے اشتہارات بلکہ ”اشتہاری“ کہتا ہوں اور ایسے تمام اشتہاریوں کے لئے ایک دفعہ پھر دل کی گہرائیوں سے..... لا حول ولا قوۃ!!!

☆☆☆



اردو کتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT